(ترتیب نو)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

(ترتیب نو)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

ناشر

تہذیب سنز، اردو بازار، لاہور

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

ایڈیشن	طباعت	تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت
اول	اول	جولائی ۱۹۹۵	۵,۰۰۰

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور۔

منظور کردہ : وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان اسلام آباد۔

بموجب مراسلہ نمبر9-1/93 یو آر، مورخہ 22 جنوری 1995ء

مؤلفین : پروفیسر خالد بزمی (ریٹائرڈ)
پروفیسر ڈاکٹر محمد خان اشرف

مدیر : نصیر احمد بھٹی۔

نگرانِ طباعت : نصیر احمد بھٹی۔

پروسیسر، کمپوزرز : تعلیمی مرکز، اردو بازار لاہور۔

ناشر: تہذیب سنز، لاہور

مطبع : ناصر باقر پرنٹرز لاہور

فہرست مندرجات

(حصۂ نثر)

(حصۂ نظم و غزلیات)

قطعہ، رباعی

تراجم (پنجابی، پشتو)

— ○○○ —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اعلیٰ ثانوی درجے (انٹرمیڈیٹ) کے اردو اعلیٰ (اردو اختیاری) کے مضمون کی تدریس کے لیے یہ کتاب اس نقطہ نظر سے ترتیب دی گئی ہے کہ طلبہ نہ صرف اردو ادب کے ارتقائی مراحل اور اصنافِ ادب کی عہد بہ عہد ترقی سے اس طرح آگاہ ہو سکیں کہ انھیں اس کا تاریخی شعور حاصل ہو جائے بلکہ انھیں اردو ادب اور ادبی تنقید کے بنیادی تصورات و خیالات اور مسائل سے بھی کچھ ابتدائی آگاہی اور آشنائی ہو جائے جو ایک طرف ان کے نمو پذیر ذوق ادب کو فنی اور نظریاتی بنیاد فراہم کرے اور دوسری طرف ان کے آئندہ مطالعے کی بنیاد بن سکے۔

صحت مند ادب طلبہ کی ہر شعبہ حیات میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس کتاب کے ترتیب دینے میں یہ اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہا ہے۔ طلبہ کے سیرت و کردار کی تعمیر دراصل ہماری نظریاتی سرحدوں کے استحکام کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ طلبہ ان عوامل و مقاصد کا بھرپور شعور رکھتے ہوں جن کی بنیاد پر اس خطۂ ارض کے مسلمانوں نے اپنے لیے الگ وطن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس ملک کو قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے خوابوں کی تعبیر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے ہر فرد کے دل میں پاکستان سے محبت کی شمع روشن ہو اور طلبہ میں خاص طور پر 'پاکستانی قومیت کے صحیح شعور کی نشو و نما ہو سکے۔ کتاب ترتیب دیتے وقت مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں اس حقیقت اور ضرورت کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب میں قومی نصاب کمیٹی کے دیگر مقرر کردہ مقاصد اور اَہداف کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی تیاری کے دوران میں اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو یہ مجوزہ نصاب پر محیط ہو اور دوسری طرف طلبہ کی ذہنی استعداد کا ساتھ بھی دے سکے۔ کتاب میں اردو ادب کے مستند ادبا اور شعرا کی نمائندہ تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کی سہولت کے لیے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ نثر پہلے اور حصہ نظم بعد میں۔ مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ موضوعات کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اصنافِ ادب کو نمائندگی دی جا سکے۔

ہر صنف ادب کے آغاز میں اس کا تعارف 'ارتقا اور تنقیدی جائزہ دیا گیا ہے۔ اور

ہر سبق سے پہلے مصنف پر سوانحی و تنقیدی شذرہ دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زیرِ مطالعہ صنفِ ادب، مصنف اور منتخب اقتباس، میں صنفی اور داخلی ربط پیدا ہو جائے اور سبق کی تفہیم میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ ہر سبق کے آخر میں نمونے کے چند ایک ایسے سوالات دیے گئے ہیں جو قواعد و انشاء، اصنافِ ادب اور تنقید کے نصاب کا عملی تجربہ حاصل کرنے میں مدد دے سکیں۔

ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجے کے اساتذہ کرام کا اکثر یہ خیال ہے کہ غزل کے ایسے مضامین سے صرفِ نظر بہتر ہے جنھیں کمرہ جماعت میں تشریحاً بیان کرنا ہمارے معاشرتی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا اس انتخاب میں ایسی غزلیں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اپنی صنفِ ادب کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے مخصوص سماجی اور درسی ماحول سے متصادم نہ ہوں۔

اس کتاب کی ترتیب میں مؤلفین اور مرتّبین کو وفاقی وزارتِ تعلیم کی نصاب کمیٹی اور مشیرِ تعلیم کی مسلسل راہ نمائی حاصل رہی ہے جس کی روشنی میں اس کو قومی نصب العین اور مقاصد کا حامل بنانے اور متعین کردہ مقاصد حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ لہٰذا ان کی سعی و کاوش کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں احساس ہے اور تمام تر احتیاط اور توجہ کے باوجود اس کتاب کی تیاری میں اساتذہ کرام کی مناسب راہ نمائی کی کمی رہی ہے اور یہ کمی محنتی، مخلص اور مشنری جذبے کے حامل اساتذہ ہی پوری کر سکتے ہیں جو ان منتخبات کے پس منظر اور ان کی غرض و غایت کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کر سکیں گے۔ یہی وہ جادو کی چھڑی ہے جو طلبہ میں صحیح مطالعے کا شوق پیدا کر سکتی ہے۔ امید کی جاتی ہے اس کتاب کی تدریس کے دوران میں پیش آمدہ تجربات کی روشنی میں وہ بورڈ کو اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ فرمائیں گے تاکہ اس کتاب کو مفید سے مفید تر بنایا جا سکے۔

— ooo —

اُردُو زبان و اَدب کی مختصر تاریخ

اردو دنیا کی جدید ترین زبانوں میں سے ہے، محققین نے اس کی ابتدا، آغاز اور اس کے ماخذ و منبع کے بارے میں کئی دلچسپ اور متضاد نظریے پیش کیے ہیں جن سے اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ زبان بر صغیر میں ' ہند آریائی زبانوں کے گروہ کے ارتقا، عمل و رد عمل اور ان پر فارسی ' عربی اور ترکی زبانوں کے اثرات سے وجود میں آئی۔ اس کے اولین آثار دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتے ہیں جب مسلم فاتحین کو یہاں کے مقامی منتظمین ' تجار ' علما ' صوفیا ' مبلغین ' ان کے اہل و عیال اور دوسرے مقامی لوگوں سے ملنے جلنے اور حکومتی اور دیگر کاروبار چلانے کی ضرورت پیش آئی۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن بول چال اور روزمرہ کاروبار کے لیے یہ نئی زبان (جو بعد میں اردو کہلائی) ہی استعمال ہوتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آہستہ آہستہ نکھرتی اور سنورتی رہی اور دیگر زبانوں اور بولیوں کے الفاظ بھی جذب اور شامل کرتی رہی۔ اس طرح سے اس زبان میں وسعت اور لچک پیدا ہوئی اور یہ بر صغیر کے ایک بڑے علاقے میں جہاں پہلے صرف چند علاقائی بولیاں بولی جاتی تھیں رابطے کی زبان بن گئی۔ یہ سب فطری اور خود کار طریقے سے ہوا یہاں تک کہ مغلیہ عہد کے اختتام تک یہ زبان اس قدر ترقی کر چکی تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے عمال و حکام کو سکھانے اور امور مملکت میں استعمال کرنے کے لیے فارسی کی جگہ اسی کا انتخاب کیا۔

"اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں "لشکر" یا "لشکر گاہ" مغلوں کے دور میں لشکر ' اس سے متعلق آبادی اور بازار کو "اردو" کہا جاتا تھا اور بادشاہی قلعہ اور اس کے متعلقات کو "اردوئے معلیٰ"۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک ایسے علاقوں میں بولی جانے والی زبان کو "اردو زبان" یا "زبان اردو" کہا جانے لگا تھا۔ اس سے پہلے یہی زبان مختلف علاقوں اور ادوار میں ' ہندی ' ہندوستانی ' دکنی ' گجراتی ' ریختہ اور دوسرے ناموں سے بھی موسوم رہی۔ انیسویں صدی میں اس زبان کے لیے واضح طور پر "اردو" کا نام استعمال ہونا شروع ہوا ' جب کہ یورپی مصنفوں میں سے کچھ اس کو "ہندوستانی" کے نام سے پکارتے رہے۔

اردو شاعری کی تاریخ کے حوالے سے بارھویں ' تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہمیں پورے بر صغیر میں علما ' صوفیا اور درویش منش آزادگان کا ایک کثیر گروہ ایسا ملتا ہے جن

کے کلام اور اشعار میں اردو اور ہندی کی ایک واضح جھلک موجود ہے۔ ان میں امیر خسرو (وفات ۱۳۲۵ء) اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وفات ۱۴۲۱ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امیر خسرو ایک عہدِ ساز نابغہ شخصیت، فارسی کے عظیم مصنف، عالم اور فن موسیقی کے ماہر تھے۔ بہت سی ایسی نظمیں، دوہے، کہ مکرنیاں اور پہیلیاں ان سے منسوب ہیں جن کو اردو زبان کی ابتدائی صورت کہا جاسکتا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے۔ تبلیغ اسلام کے لیے دلی چھوڑ کر "گلبرگہ" (دکن) چلے آئے۔ ان کی تصنیف "معراج العاشقین" کو اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔

اپنے دور کے مخصوص سیاسی و سماجی حالات کی وجہ سے، شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں اردو ادب و شاعری کو پہلے فروغ حاصل ہوا۔ اس کے اولیں آثار "بہمنی دور" (۱۵۲۶ - ۱۳۴۷ء) میں صوفیا کی تحریروں اور شاعری میں ملتے ہیں، نظامی کی مثنوی "کدم راؤ" "پدم راؤ" کو دکنی دور کی شاعری کی اولیں باقاعدہ تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ تخلیقِ ادب کے نقطہ نظر سے بیجا پور کے عادل شاہی اور گول کنڈہ کے قطب شاہی ادوار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان ریاستوں کے کئی بادشاہ خود بھی صاحب کلام تھے اور ان کے درباروں میں اردو شاعروں اور مصنفین کو بہت عروج حاصل ہوا۔ عادل شاہی حکمرانوں میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۶۲۶ - ۱۵۸۰ء) کی گیتوں پر مبنی تصنیف "نورس" کو علمِ موسیقی کے لحاظ سے بہت اعلیٰ خیال کیا جاتا ہے۔ شاعری اور شاعروں کی سرپرستی کی روایت آئندہ حکمرانوں کے ادوار میں بھی جاری رہی۔ ملک خوشنود، نصرتی اور ہاشمی اس دَور کے اہم شاعر ہیں۔

گول کنڈہ کے حکمرانوں میں شاعری اور شاعروں کی سرپرستی کے لحاظ سے محمد قلی قطب شاہ کا نام سرِفہرست ہے۔ عرصہ تک ان کو اردو کا پہلا شاعر خیال کیا جاتا رہا اور یہ بات ابھی تک تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ قطب شاہی دور کے اہم شعرا میں وجہی اور غواصی بہت مشہور ہیں۔

دکنی شاعری کے آخری دور میں ولی اور سراج جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے۔ آزاد نے ولی کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا ہے۔ اس دور کی شاعری اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہاں پہنچ کر زبان میں مقامی اثرات اور عناصر کم تر ہو جاتے ہیں اور ایک ایسی زبان سامنے آتی ہے جو ہندوستان کے وسیع تر علاقوں میں سمجھی جاتی تھی۔ ولی نے ۱۷۰۰ء میں دلی کا سفر بھی کیا تھا۔ اس نے اپنے لسانی اور فنی شعور کے باعث اردو شاعری کی نئی روایت کا آغاز کیا لہٰذا جب ۱۷۲۱ء میں اس کا

دیوان دلی پہنچا تو اس کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔

ولی سے پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری کو فارسی کے مقابلے میں ثانوی حیثیت حاصل تھی لیکن اس کے دیوان کے دلی پہنچنے سے اردو شاعری کو ایک نئی تحریک ملی اور بہت سے شاعروں نے اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اس عہد کے شاعروں میں خان آرزو، مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم بہت مشہور ہیں۔ اسی دور میں اردو شاعری میں "ایہام گوئی" کی تحریک نے مقبولیت حاصل کی جس میں لفظی شعبدہ بازی اور زبان دانی کی مہارت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ شاعری کا یہ انداز غیر فطری اور مصنوعی تھا لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اردو زبان کو نکھرنے اور سنورنے کا موقعہ ملا۔ جلد ہی شعرا اس لفظی گورکھ دھندے کو چھوڑ کر جذبہ و احساس کے فطری اظہار اور زبان و بیان کی سادگی اور اثر آفرینی کی طرف مائل ہو گئے جس سے اردو شاعری کا ایک روشن دور شروع ہوا۔ میر درد، سودا اور میر تقی میر اس دَور کے درخشاں ستارے تھے۔

میر درد (۱۷۸۵ - ۱۷۱۲ء) ایک باعمل صوفی تھے۔ انھوں نے اردو زبان کو تصوف کی روایت اور اس کی واردات و تصورات کے ابلاغ کے لیے نہایت صفائی، سادگی اور اثر کے ساتھ استعمال کیا۔ سودا (۱۷۸۱ - ۱۷۰۶ء) کی اہم خصوصیات، ان کی زبان و بیان کا آہنگ، شان اور دلکشی ہے جسے انھوں نے قصیدہ گوئی کے لیے استعمال کیا۔ قصیدہ کے ساتھ ساتھ سودا کا دوسرا میدان 'ہجو نگاری' تھا۔ میر تقی میر (۱۸۱۰ - ۱۷۲۵ء) نے اردو غزل کی روایت کو سادگی بیان، درد مندی اور سوز و گداز کی اعلیٰ ترین منزلوں تک پہنچا دیا۔ میر کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے دکھ کے ساتھ ان کے عہد کی سیاسی و معاشی بربادی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

مغلیہ سلطنت کی کمزوری، افراتفری، طوائف الملوکی، انتشار، احمد شاہ اور نادر شاہ کے حملے اور دلی کی بربادی نے اکثر اہل کمال کو نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ اس دور میں لکھنؤ اپنے امن و سکون، فارغ البالی اور اہل علم اور شعرا کی سرپرستی کی وجہ سے بڑی کشش رکھتا تھا۔ سودا اور میر بھی دلی چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔ اس عہد میں اردو شاعری کی روایت نے فروغ پایا جس کی اہم خصوصیت، خارجیت اور معاملہ بندی تھی۔ لکھنؤ میں ابھرنے والے شاعروں میں انشا، جرأت، مصحفی، ناسخ اور آتش خاص اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے اردو غزل گوئی کی روایت کو ترقی دی اور زبان و بیان میں نیا نکھار اور صفائی پیدا کی۔ لکھنؤ میں اردو میں اعلیٰ پایہ کی مثنویاں بھی لکھی گئیں جن میں میر حسن کی "سحر البیان" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزارِ نسیم" خاص طور پر مشہور ہیں۔

لکھنؤ میں مرثیہ گوئی نے چند مخصوص وجوہات کی وجہ سے بہت رواج پایا۔ ان مرثیہ

گو شعرا میں خلیق ، ضمیر ' میر انیس اور مرزا دبیر بہت مشہور ہوئے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنے اپنے رنگ میں مرثیہ کو اردو شاعری میں "رزمیہ" کے مماثل بنا دیا۔

شاعری کے ان دو بڑے مراکز کے علاوہ آگرے (اکبر آباد) میں نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰-۱۸۳۰ء) نے اردو شاعری میں عوامی روایت کو فروغ دیا۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم گوئی کو اپنایا اور اپنی شاعری میں عام لوگوں کی زندگی ' رسم و رواج ' موسموں ' تہواروں اور خیالات و تصورات کی بھرپور عکاسی کی۔

مغلیہ عہد سلطنت کے آخری دَور کے نامور شعرا میں بہادر شاہ ظفر ' ان کے استاد ملک الشعرا ابراہیم ذوق ' غالب اور مومن کے نام نمایاں ہیں۔ غالب نے ابتدا مشکل پسندی سے کی لیکن بعد ازاں انھوں نے اردو غزل کو زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت ہی اعلیٰ ترین نمونے دیے۔ انھوں نے اپنی اردو شاعری کو اپنے عہد اور شخصیت کا ایک مرقع بنا کر پیش کیا۔

شمالی ہند میں اردو نثر نگاری کا باقاعدہ آغاز انگریزوں کے استعماری تقاضوں کا مرہونِ منت ہے۔ انھیں اپنی وسعت پذیر حکومت کے عمال و حکام کے مقامی لوگوں کے ساتھ ارتباط اور ابلاغ کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو وسیع تر ہندوستان میں سمجھی جائے اور اس کے لیے انھوں نے اردو کا انتخاب کیا۔ لیکن اس عہد میں اردو میں نثر کی کتابیں موجود نہ تھیں۔ لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی کے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کیا گیا جہاں ڈاکٹر گل کرسٹ کی نگرانی میں اردو نثر کی کتابیں لکھوانے کا اہتمام کیا گیا جو بول چال کی زبان کے قریب تر تھیں۔ ان میں سے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اور حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ لکھنؤ میں مجلسی زندگی کی رنگا رنگی کے باعث داستان کہنے اور لکھنے کا رواج بڑھا اور وہاں بھی نثر میں داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں انشا اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" اپنے اسالیبِ بیان کی وجہ سے اہم ہیں۔

اس دور کی نثر کی تاریخ میں "غالب کے خطوط" ایک منفرد اور بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ غالب نے اپنے دوستوں ' عزیزوں اور شاگردوں کو کثرت سے خط لکھے۔ ان خطوط کے مجموعے "عُودِ ہندی" "اردوئے معلیٰ" اور مکاتیبِ غالب کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ غالب کے خطوط کی خصوصیت ' ان کی سادہ ' رواں اور شگفتہ زبان ' انوکھا اور دلچسپ زاویۂ نظر اور مراسلے کو مکالمہ بنا دینے کا انداز ہے جس کی وجہ سے ان کی دلچسپی آج بھی قائم ہے۔

سیاسی ، سماجی ، معاشرتی ، معاشی ، تمدنی ، مذہبی اور ادبی تمام پہلوؤں سے ۱۸۵۷ء کا سال برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال ، جنگ آزادی کی ناکامی کے ساتھ ہی برصغیر سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان ، تاج برطانیہ کے تحت ایک محکوم کالونی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ گویا شہنشاہیت ، جاگیرداری ، قدامت پرستی ، رواداری اور تمدنی سکون کا خاتمہ تھا۔ اس کی جگہ جس انگریزی سامراج نے لی وہ یورپ کے صنعتی انقلاب ، توسیع پسندانہ عزائم ، صنعتی و معاشی استحصال کا آلۂ کار تھا جس کی بنیاد سائنسی ، علمی اور تکنیکی ترقی اور فوجی بالادستی پر تھی۔

جنگ آزادی کی ناکامی ، ہندوستان کی تعلیم یافتہ قیادت اور مسلمان راہ نماؤں کے لیے ایک شدید صدمہ تھا جس سے ان کو احساس ہوا کہ اگر وہ جدید دور کے نئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکے تو بہ حیثیت قوم ان کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس احساس کے زیر اثر ہندوستان بھر میں اصلاح و ترقی اور تبدیلی کی کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان تحریکوں میں سے کئی ایک نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کا اردو ادب اسی "عہدِ اصلاح" کا ادب ہے۔ ان تحریکوں میں سے ایک سر سید احمد خاں نے شروع کی جس کو "علی گڑھ تحریک" بھی کہا جاتا ہے اور دوسری تحریک "انجمنِ پنجاب" نے لاہور میں شروع کی۔

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر تعلیمی و اصلاحی تحریک تھی۔ سر سید احمد خاں نے اپنے خیالات کے فروغ اور ابلاغ کے لیے سادہ اور سلیس اردو نثر کو استعمال کیا۔ قومی سطح پر سلیس اور جدید اردو نثر کا آغاز سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا کا کارنامہ ہے۔ سر سید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" ان کا خاص پیامبر تھا جس میں سر سید نے سب سے پہلے انشائیے اور مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ سر سید کے دیگر رفقا نے اس عمل میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ کو ایک نئے رنگ سے لکھنا شروع کیا۔ انکی کتابوں میں الفاروق ، المامون اور سیرۃ النبیؐ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی عہد میں مولوی نذیر احمد نے اردو ناول نگاری کا آغاز کیا اور اگرچہ وہ سر سید تحریک کا باضابطہ حصہ نہ تھے لیکن اصلاح کا اثر ان کی تحریروں پر بھی حاوی ہے۔ ان کے ناولوں میں مرآۃ العروس ، بنات النعش ، توبتہ النصوح اور ابن الوقت کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ حالی نے اپنی شاعری کی ابتدا غالب اور شیفتہ کے زیر اثر کی لیکن بعد میں لاہور کے قیام کے دوران میں "انجمن پنجاب" میں شریک ہوئے اور آزاد کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ بعد ازاں وہ سر سید کے زیرِ اثر آئے۔ حالی نے نئے انداز کی غزل گوئی کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے ایک طویل

نظم "مد و جزرِ اسلام" جو "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہے لکھی جس نے مقبولیت، شہرت اور مسلم قوم پرستی کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا، انھوں نے اپنے شعری نظریات و خیالات کو "مقدمۂ شعر و شاعری" کے نام سے قلم بند کیا جو ابتدا میں ان کے دیوان کا مقدمہ تھا۔ اسے اردو تنقید کی اولیں کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ حالی نے "حیاتِ جاوید" اور "یادگارِ غالب" کے نام سے سوانح عمریاں بھی لکھیں۔

سرسید تحریک، کے شانہ بشانہ "انجمن پنجاب کی تحریک بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس تحریک کا خاص کارنامہ "آزاد" اور "حالی" کے ہاں جدید خیالات کا فروغ ہے۔ آزاد کا لیکچر جو انجمن پنجاب کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں دیا گیا شاعری کی نوعیت 'ماہیت' ذریعے اور شعرو شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ خیالات دراصل اصلاحی سے زیادہ تخلیقی ہیں جو لاہور میں جدید شاعری کے آغاز اور رومانوی شاعری کے فروغ کا باعث بنے۔ آزاد کی تصنیفات میں "نظمِ آزاد"، "آبِ حیات"، "سخن دانِ فارس" اور نیرنگِ خیال اہم ہیں۔ دورِ اصلاح کے ادیبوں میں آزاد واحد شخصیت ہیں جن کا مطمحِ مقصود خالص ادب اور اس کی تخلیق و ترویج تھا۔

اصلاح کے اس دور میں اور بھی بہت سے ادیب و شاعر پیدا ہوئے جن میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے حالی اور آزاد کی روایت کو جاری رکھا۔ اس عہد میں اکبر الہ آبادی ایسے شاعر تھے جنھوں نے اصلاح کی تحریک اور خاص کر سرسید تحریک کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ اودھ پنچ سے وابستہ ادیب بھی طنز و مزاح کی اس تحریک کا حصہ تھے۔ اردو ادب کے اس اصلاحی دور میں قدیم شاعری کی روایت بھی جاری رہی۔ اس کے اہم علم برداروں میں امیر مینائی، داغ اور جلال قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے قدیم روایتی طرز کی غزل گوئی کو مقبول بنائے رکھا۔ اسی دور کے اہم ادیبوں میں مولانا عبدالحلیم شرر کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے جنھوں نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ ان کے ناولوں میں "فردوسِ بریں" اور "منصور موہنا" خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی دور میں سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے نام سے اپنے عہد کے لکھنؤ کے دلچسپ اور زندہ مرقعے پیش کیے۔

اصلاح کی تحریکوں، چھاپے خانے، انگریزی زبان و ادب کی تعلیم اور جدید سیاسی و سماجی تصورات و خیالات کی ترویج نے برصغیر کے نئے تعلیم یافتہ طبقات اور نوجوانوں کو جدید علم و فن اور رجحانات سے روشناس کرایا لہٰذا بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی تعلیم یافتہ، قوم پرست،

جدت پسند اور اولوالعزم نوجوانوں کا ایک گروہ میدان میں آگیا جنھوں نے ادب و شاعری میں رسوماتی آداب اور قدیم روایات کو ترک کیا اور فکر و خیال اور شعر و ادب میں ایک نئی جرات اور جدت پرستی کے ساتھ نئی لطافت اور شعریت کو فروغ دیا۔ شیخ سر عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" اس گروہ کا پیامبر اور داعی تھا اور اقبال اس کے سرخیل۔ برصغیر میں بیسویں صدی کا ورود ' اردو ادب میں رومانوی تحریک کا آغاز تھا۔

اس تحریک کے اہم شعرا میں اقبال ' چکبست ' محروم ' جوش ' حفیظ ' ناظر اور اختر شیرانی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعرا نے روایت سے بغاوت کر کے موضوع اور ہیئت میں نئے تجربات کا آغاز کیا۔ جذبے کو خیال پر ترجیح دینے کی روایت ڈالی۔ اس دور کے نثر نگاروں میں یلدرم ' نیاز فتح پوری ' ابوالکلام آزاد ' مجنوں گورکھپوری ' خلیق ' سجاد ' حجاب امتیاز علی ' عبدالقادر ' عبدالرحمان بجنوری ' چوہدری افضل حق اور مہدی افادی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں اردو میں مختصر افسانے کا آغاز ہوا جس نے ناول کو نئی وسعت دی۔ اس ضمن میں اہم نام پریم چند کا ہے جنھوں نے قوم پرستی اور رومانویت کے زیر اثر لکھنا شروع کیا لیکن حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کے راستے سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں ' ناانصافیوں اور تضادات کے اظہار کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں میں میدانِ عمل ' اور گئودان اور افسانوں کے مجموعوں میں زادِ راہ اور واردات اہم ہیں۔

۱۹۳۵ء سے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس نے اردو ادب ' ادیب اور قاری تینوں کو شدت سے متاثر کیا۔ اس تحریک نے ادب میں معاشی و معاشرتی مسائل اور ناہمواریوں اور مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا۔ روس میں کمیونزم کی کامیابی سے اس تحریک کو مہمیز ملی۔ اس دور کے اہم ادیبوں میں کرشن چندر ' احمد ندیم قاسمی ' عصمت چغتائی ' راجندر سنگھ بیدی ' حیات اللہ انصاری اور سعادت حسن منٹو قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں فیض احمد فیض ' اسرار الحق مجاز ' ساحر لدھیانوی اور احسان دانش نے نام پیدا کیا۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس تحریک میں توازن پیدا ہوا اور بہت سے نئے لکھنے والے بھی میدان میں آئے ' جن میں نثر نگاروں میں قرۃ العین حیدر ' غلام عباس ' انتظار حسین ' حسن عسکری ' مولانا صلاح الدین احمد ' میرزا ادیب ' امتیاز علی تاج اور شاعروں میں ن۔ م۔ راشد ' میراجی ' تصدق حسین خالد ' مجید امجد ' ناصر کاظمی اور ابنِ انشا کے نام اہم ہیں۔ اس دَور میں قوم پرستی اور جدیدیت کا رجحان غالب رہا اور ادیب بدلتے ہوئے حالات میں اپنے فن

کی بنیادوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

اردو ادب میں ڈراماکی صنف بہت سے نشیب و فراز کی حامل ہے۔ اردو ڈراما کا آغاز واجد علی شاہ کے عہد (۱۸۵۶ - ۱۸۴۷ء) کے لکھنؤ میں ہوا۔ امانت (وفات ۱۸۵۸ء) کی "اندر سبھا" (۱۸۵۲ء) کو اردو کا پہلا باقاعدہ ڈراما قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اردو ڈراما تھیٹر سے وابستہ رہا۔ بیسویں صدی میں آغا حشر اردو ڈراما میں ایک نامور شخصیت کے طور پر ابھرے۔ ان کے بعد سید امتیاز علی تاج نے ڈراما نویسی اور سٹیج کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن جدید دَور سے پہلے اردو میں ڈراما صحیح طور پر مقبول نہ ہو سکا۔ ریڈیو کے شروع ہونے سے اردو میں ریڈیائی ڈراموں کا آغاز ہوا۔ امتیاز علی تاج، میرزا ادیب اور دوسرے ادیبوں نے ریڈیو کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے۔ ٹی۔وی کے آغاز سے اردو میں ڈراما نگاری اور سٹیج ڈراما کو نئی مہمیز ملی ہے۔ ممکن ہے اس سے ڈراما کے مستقبل پر کوئی اچھا اثر پڑے۔

ادب کی روایت کو اجاگر کرنے میں محققین اور ناقدین کا ہاتھ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو ادب میں تحقیق کی روایت نہایت مضبوط رہی ہے اور اس میں محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، وحید الدین سلیم، حافظ محمود شیرانی، سید عبداللہ، گیان چند جین، نور الحسن ہاشمی، حامد حسن قادری، محی الدین قادری زور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر حسن اختر، مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نقادوں میں عبدالقادر شیخ، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، کلیم الدین احمد، حسن عسکری، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر اے۔بی۔ اشرف کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس کا آغاز جعفر زٹلی سے ہوا اور اودھ پنچ اور اکبر الہ آبادی نے اس کو ادبی وقار اور مرتبہ دیا۔ بیسویں صدی میں عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مجید لاہوری، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی نے اس کو آگے بڑھایا، نئے لکھنے والوں میں شفیق الرحمان، کرنل محمد خاں اور مشتاق یوسفی کے نام نمایاں ہیں۔

— ooo —

داستان

قصہ کہانی اتنے ہی قدیم ہیں جتنا خود انسان۔ ان کی بنیاد انسان کا جذبہ تجسس اور فطری طور پر قصہ پسندی کا رجحان ہے جس کی تسکین کے لیے معاشروں میں قصہ گو اور داستان طراز وجود میں آئے جو اپنی قوت تخیل سے واقعات کو ترتیب دے کر داستانوں کی تخلیق کرتے ' ان کو دلکش ' دلچسپ اور زندگی سے برتر کرداروں اور طلسماتی و پراسرار ماحول سے سجاتے اور اپنی قوت گویائی ' چرب زبانی اور زبان دانی کی مہارت سے لوگوں کو سناکر اپنا گرویدہ بناتے۔ جیسے جیسے سماجی زندگی ترقی کرتی گئی اور علم و شعور کی حدیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے کہانیوں کے مواد ' موضوعات ' ان کی شکل اور انداز بیان بھی بدلتے گئے۔ انسان نے لکھنا سیکھا تو یہ کہانیاں بھی لکھی گئیں جو رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے حکایت ' داستان ' تمثیل ' ناول ' افسانے اور ڈرامے کی منزلوں تک پہنچیں ' انھیں مجموعی طور پر "افسانوی ادب" کہا جاتا ہے۔

داستان ایک "افسانوی صنف ادب" ہے جو ایسی لکھی ہوئی کہانیوں پر مشتمل ہے جن کی بنیاد تخیل ' رومان اور مافوق الفطرت عناصر پر استوار ہے۔ جو تحیر خیز ' پیچیدہ واقعات ' مبالغہ آمیز اور غیر حقیقی بیان ' حیرت انگیز کردار ' حسن و عشق اور اولوالعزمی کی رنگینیاں ' طلسماتی اور حیران کن فضا زبان و بیان کی لطافت و دلکشی کی خصوصیات رکھتی ہے اور جس کا مقصد اپنے قاری کو مسرت و فرحت بہم پہنچانا ہوتا ہے۔

اردو ادب میں داستانوں کی ابتدا ان منظوم قصوں سے ہوئی ہے جو دکن میں لکھے گئے۔ اس دور کی مشہور منظوم داستانوں میں غواصی کی "سیف الملوک" ' نصرتی کی "گلشنِ عشق" ' غواصی کا "طوطی نامہ" اور نشاطی کی "پھول بن" مشہور ہیں اور نثر میں ملا وجہی کی "سب رس" نے بہت مقبولیت حاصل کی۔

شمالی ہند کی منظوم داستانوں میں میر تقی میر کی "شعلہ عشق" اور "دریائے عشق" ' میر حسن کی "سحر البیان" ' نسیم کی "گلزارِ نسیم" اور شوق کی "زہرِ عشق" مشہور ہیں۔ سودا نے میر کی "شعلہ عشق" کو نثر میں لکھا اور میر عطا حسین خاں تحسین نے "چہار درویش" کو "نوطرز مرصع" کے نام سے پیش کیا۔

انیسویں صدی شروع ہوتے ہی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ذریعے سے اردو میں نثری داستانوں کا بیش بہا اضافہ ہوا اور حسبِ ذیل ادیبوں نے داستانیں پیش کیں :

۱۔	میر امن	باغ و بہار۔
۲۔	حیدر بخش حیدری	طوطا کہانی۔ آرائشِ محفل۔
۳۔	بہادر علی حسینی	نثر بے نظیر۔ اخلاقِ ہندی۔
۴۔	مرزا کاظم علی جوان	شکنتلا
۵۔	خلیل خاں رشک	داستان امیر حمزہ۔
۶۔	نہال چند لاہوری	قصہ گل بکاؤلی۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر جو داستانیں لکھی گئیں ان میں انشاء اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی" کی کہانی اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" مقبول ہوئیں۔ فسانہ عجائب میں مسجع و مقفی اندازِ بیان استعمال کیا گیا ہے۔

ان داستانوں میں باغ و بہار اپنی معنوی اور صوری خوبیوں کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ یہ بھی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے لیکن اس میں مولف نے حقیقت پسندانہ انداز نظر سے کام لیا ہے اور جادو یا سحر سے کم سے کم مدد لی ہے۔ چنانچہ پہلے درویش کے قصے میں فوق الفطرت عناصر کو دخل نہیں ہے' البتہ عشق کی کرامات ہر جگہ موجود ہیں۔ دوسرے قصوں میں تائید غیبی اور فوق الفطرت عناصر سے بھی مدد لی گئی ہے۔ ان چار الگ الگ قصوں کو آزاد بخت کے قصے نے ایک لڑی میں پرو دیا ہے جس کی وجہ سے جدت پیدا ہو گئی ہے۔ باغ و بہار کے کردار بھی اپنے زمانے کے جاگیردارانہ اخلاق کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں ان میں کردار نگاری کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اور انسانی کمزوریوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میرامن نے باغ و بہار میں جو کلوش کی ہے اس میں دہلی کی تہذیب اور معاشرت' طعام و لباس کی کہیں واضح اور کہیں دھندلی تصویریں ملتی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے یہ داستان' دلی کی ٹھیٹھ زبان میں ہے۔ کہیں کہیں قافیے کا التزام بھی کیا گیا ہے لیکن عام طور پر زبان بامحاورہ اور سلیس ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے ذریعے سے جب داستانیں چھپ کر منظر عام پر آئیں تو دوسرے ادیب بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور یوں ایک پورا داستانوی ادب معرضِ وجود میں آیا۔ ان تمام داستانوں میں یکساں قسم کی ترتیب و ساخت سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن انہی کے ذریعے اردو زبان پر نکھار آیا اور اس میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوئی۔ اس میں طرح طرح کے مفاہیم ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور اسے باقاعدہ ایک ادبی درجہ ملا۔ ورنہ فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو نثر کی اہمیت کا احساس عام لوگوں میں قطعی نہیں تھا اور اسے کم مایہ تصور کیا جاتا تھا۔

داستانوں کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ رومانی' تخیلی اور غیر حقیقی ہوں لیکن کوئی ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ ادیب جو اس دنیا ہی کا ایک فرد ہے گرد و پیش کے حالات سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے؟ چنانچہ ان داستانوں میں زندگی کا عکس بھی ملتا ہے' منظر نگاری' جذبات نگاری اور کردار نگاری کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں لیکن عوامی کردار بہت کم دکھائی دیتے ہیں' اگر کہیں ہیں بھی تو انھیں خدام اور خواجہ سراؤں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جب کہ خواص اور اعلیٰ طبقے کو بہت تفصیل اور اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان داستانوں میں ہیرو کو زمانے کی تمام خوبیوں سے متصف دکھایا جاتا ہے' بہادر' جری' لائق' عالم و حسین۔ اسی طرح ہیروئین بھی تمام اعلیٰ نسوانی خوبیوں کی مالک ہوتی ہے۔ ہیرو کے معاون یا مخالف کرداروں میں بھی یکسانیت ہوتی ہے اور وہ بھی سب مثالی ہوتے ہیں۔ عام زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ سب کے سب خوابوں اور خیالوں میں ہی اپنا وجود رکھتے ہیں۔ پھر بھی ان کا ایک اخلاقی رخ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والوں میں ہمدردی کے جذبے کو ابھارتے ہیں اور اس اخلاق کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں کہ فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔

جہاں تک اسلوبِ بیان کا تعلق ہے داستانوں میں ہمیں دو طرح کے اسلوب ملتے ہیں۔ ایک سادہ' سلیس' بامحاورہ اور دوسرا رنگین، مقفیٰ، مسجع۔ باغ و بہار' آرائش محفل' رانی کیتکی کی کہانی سادہ اسلوبِ بیان کی مثالیں ہیں۔ ان کے برعکس نوطرز مرصع' فسانہ عجائب' گل صنوبر' شگوفہ محبت' سروش سخن' طلسم حیرت وغیرہ میں رنگین طرز نگارش ملتا ہے۔

اردو کی بیشتر داستانیں ترجمہ ہیں یا دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں پھر بھی ان داستانوں کی ادبی' تاریخی اور لسانی حیثیت مسلم ہے جس سے ادب کا کوئی قاری انکار نہیں کر سکتا۔

میر امَّن دہلوی

(۱۷۴۳ء - ۱۸۱۲ء)

میر امان نام تھا اور لطف تخلص ۔ "میر اَمَّن" کے نام سے معروف ہوئے۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں صرف وہی حالات معلوم ہیں جو انھوں نے اپنی تصانیف کی تمہید میں لکھ دیے ہیں۔ ان کے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں سلطنت دہلی سے وابستہ تھے۔ میر امن نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ دہلی میں گزارا۔ جب دہلی لٹی اور حالات خراب ہوئے تو یہ بھی وہاں سے نکلے۔ عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ کئی برس وہاں رہے پھر کلکتے چلے گئے۔ کلکتہ پہنچ کر دو سال تک ایک نواب کے چھوٹے بھائی کے اتالیق رہے بعد ازاں ۱۸۰۱ء میں میر بہادر علی حسینی کی وساطت سے جان گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں ملازم ہو گئے جہاں وہ ۱۸۰۶ تک کام کرتے رہے۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران میں میر امن نے دو کتابیں تحریر کیں۔ "باغ و بہار" اور "گنج خوبی"۔ ان میں سے "باغ و بہار" کو بہت شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔ "باغ و بہار" اردو نثر میں داستان کا اولین نمونہ ہے جس میں چار درویشوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ "قصہ چہار درویش" طبع زاد نہیں بلکہ میر امن نے اسے میر عطا حسین خاں تحسین کی "نو طرزِ مرصع" سے اخذ کیا ہے اور فورٹ ولیم کالج کی نصابی ضروریات کے پیش نظر آسان اور دہلی کی بامحاورہ زبان میں بیان کر دیا ہے۔

"باغ و بہار" گو اردو نثر کی اولین تصانیف میں سے ہے لیکن اس کی زبان اور انداز بیان نے اس کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ "باغ و بہار" کی زبان دہلی کی بول چال کی خالص بامحاورہ زبان ہے جو اپنی سادگی، صفائی، دل کشی، فصاحت اور روانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ "باغ و بہار" کا موضوع ایک ایسی داستان ہے جو نئی یا انوکھی نہ تھی لیکن میر امن کے طرز تحریر نے اس کو اردو ادب میں نہایت ہی منفرد اور نمایاں مقام دے دیا ہے۔ "باغ و بہار" اٹھارویں صدی کی دلی کی زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے اور اردو نثر میں دلی کے دبستانِ ادب کی تابندہ مثال۔ زیرِ نظر اقتباس باغ و بہار سے لیا گیا ہے۔

سیر دوسرے درویش کی

اے دَلق پوشو! یہ عاجز، بادشاہ زادہ، فارس کے ملک[۱] کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ "اصفہان نصف جہان" مشہور ہے۔ ہفت اقلیم میں اس اقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں، کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وہ ساتوں کواکب میں نیر اعظم ہے۔ آب و ہوا وہاں کی خوش، اور لوگ روشن طبع اور صاحبِ سلیقہ ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے (جو بادشاہ

۱۔ ایران، فارس جدید ایران کا ایک صوبہ ہے۔

اس ملک کے تھے) لڑکپن سے قاعدے اور قانون سلطنت کے ترتیب کرنے کے واسطے 'بڑے بڑے دانا استاد ' ہر ایک علم اور کسب کے 'چن کر میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے 'تو تعلیم کامل ' ہر نوع کی ' پا کر قابل ہوں۔ خدا کے فضل سے چودہ برس کے سن و سال میں سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول 'نشست و برخاست پسندیدہ اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور درکار ہے 'سب حاصل کیا۔ اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں 'قصے ہر ایک ملک کے 'اور احوال اولوالعزم بادشاہوں اور نام آوروں کا 'سنا کروں۔

ایک روز ایک مصاحب دانا نے 'کہ خوب تواریخ دان اور جہاں دیدہ تھا' مذکور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسا نہیں 'لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ ان کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک زبانوں پر بہ خوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا "اگر تھوڑا سا احوال اس کا مفصل بیان کرو تو میں سنوں اور اس پر عمل کروں۔" تب وہ شخص حاتم طائی [1] کا ماجرا اس طرح سے کہنے لگا کہ "حاتم کے وقت میں 'ایک بادشاہ عرب کا نوفل نام تھا۔ اس کو حاتم کے ساتھ 'بہ سبب نام آوری کے 'دشمنی کمال ہوئی۔ بہت سا لشکر 'فوج جمع کر کر لڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ حاتم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا یہ سمجھا کہ 'اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں تو خدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خوں ریزی ہو گی۔ اس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ بات سوچ کر 'تن تنہا' اپنی جان لے کر 'ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی 'سب اسباب اور گھر بار حاتم کا قرق کیا اور منادی کروا دی کہ جو کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر پکڑ لاوے 'پان سے اشرفی 'بادشاہ کی سرکار سے انعام پاوے۔ یہ سن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم کی کرنے لگے۔

ایک روز ایک بوڑھا اور اس کی بڑھیا 'دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لیے ہوئے ' لکڑیاں توڑنے کے واسطے اس غار کے پاس 'جہاں حاتم پوشیدہ تھا' پہنچے اور لکڑیاں اس جنگل سے چننے لگے۔ بڑھیا بولی "اگر ہمارے کچھ دن بھلے آتے تو حاتم کو کہیں ہم دیکھ پاتے 'اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا اور ہم آرام سے کھاتے' اس دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔" بوڑھے نے کہا "کیا ٹرٹر کرتی ہے؟ ہمارے طالع میں یہی لکھا ہوا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں۔ تب لون 'روٹی میسر آوے 'یا ایک روز جنگل سے باگھ [2] لے جاوے۔ لے اپنا کام کر۔ ہمارے ہاتھ حاتم کاہے کو آوے گا اور بادشاہ اتنے روپے

---

[1]۔ قدیم عرب کے قبیلہ طے کا سردار جو اپنی سخاوت و شجاعت کی وجہ سے ضرب المثل ہے۔
[2]۔ شیر/چیتا

دلاوے گا! عورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چپکی ہو رہی۔

یہ دونوں کی باتیں حاتم نے سنیں۔ مردی اور مروت سے بعید جانا کہ اپنے تئیں چھپائے اور جان کو بچائے اور ان دونوں بے چاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں' وہ قصائی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

غرض حاتم کی جواں مردی نے نہ قبول کیا کہ اپنے کانوں سے سن کر چپکا ہو رہے۔ وہ باہر نکل آیا اور اس بوڑھے سے کہا کہ "اے عزیز! حاتم میں ہی ہوں' میرے تئیں نوفل کے پاس لے چل۔ وہ مجھے دیکھے گا' جو کچھ روپے دینے کا اقرار کیا ہے تجھے دیوے گا۔" پیر مرد نے کہا' سچ ہے اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے لیکن وہ کیا جانیے تجھ سے کیا سلوک کرے؟ اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں؟ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ سے انسان کو' اپنی طمع کی خاطر' دشمن کے حوالے کروں۔ مال کے دن کھاؤں گا اور کب تک جیوں گا؟ آخر مر جاؤں گا۔ تب خدا کو کیا جواب دوں گا؟ حاتم نے بہتیری منت کی کہ مجھے لے چل' میں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میرا جان و مال کسو کے کام آوے تو بہتر ہے۔ لیکن وہ بوڑھا کسو طرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاوے اور انعام پاوے۔ آخر لاچار ہو کر حاتم نے کہا' اگر تو مجھے یوں نہیں لے جاتا تو میں آپ سے آپ بادشاہ کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھے جنگل میں ایک پہاڑ کی کھوہ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ بوڑھا ہنسا اور بولا بھلائی کے بدلے برائی ملے تو یا نصیب۔ اس رد و بدل کے سوال و جواب میں آدمی اور بھی آن پہنچے' بھیڑ لگ گئی۔ انھوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے ترت پکڑ لیا اور حاتم کو لے چلے۔ وہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا۔ جب نوفل کے روبرو لے گئے' اس نے پوچھا کہ اس کو کون پکڑ لایا؟ ایک بدذات' سنگ دل بولا کہ ایسا کام سوائے ہمارے کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے' ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک ڈینگ مارنے لگا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں۔ میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے' سو دیجیے۔ اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا۔ وہ بوڑھا چپکا ایک کونے میں لگا ہوا' سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا روتا تھا۔

جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہ چکے' تب حاتم نے بادشاہ سے کہا' اگر سچ

بات پوچھو تو یہ کہ وہ بوڑھا، جو الگ سب سے کھڑا ہے مجھ کو لایا ہے۔ اگر قیافہ پہچان جانتے ہو، تو دریافت کرو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قول کیا ہے پورا کرو کہ سارے ڈیل میں زبان حلال ہے۔ مرد کو چاہیے، جو کہے، سو کرے۔ نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے۔ پھر حیوان اور انسان میں کیا تفاوت ہے؟

نوفل نے اس لکڑہارے بوڑھے کو پاس بلا کر پوچھا کہ سچ کہہ اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا؟ اس بچارے نے، سر سے پانوں تک جو گزرا تھا، راست کہہ سنایا اور کہا، حاتم میری خاطر آپ سے آپ چلا آیا ہے۔ نوفل یہ ہمت حاتم کی سن کر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت! اپنی جان کا خطرہ بھی نہ کیا۔ جتنے جھوٹ دعوے حاتم کو پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم کیا کہ ان کی ٹنڈیاں کس کر[1]، پانسو اشرفی کے بدلے پان پان سے جوتیاں ان کے سر پر لگاؤ، کہ ان کی بھی جان نکل پڑے۔ وونھیں تڑاتڑ پیزاریں[2] پڑنے لگیں، کہ ایک دم میں سر ان کے گنجے ہو گئے۔ سچ ہے جھوٹ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اس کو نہیں پہنچتا۔ خدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ اور جھوٹ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جھوٹ موٹ بکے جاتے ہیں، لیکن آزمائش کے وقت سزا پاتے ہیں۔

غرض ان سب کو، موافق ان کے انعام دے کر، نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے (کہ ایک عالم کو اس سے فیض پہنچتا ہے اور محتاجوں کی خاطر جان اپنی دریغ نہیں کرتا اور خدا کی راہ میں سرتاپا حاضر ہے) دشمنی رکھنی اور اس کا مدعی ہونا شرط آدمیت اور جواں مردی سے بعید ہے۔ وونھیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا اور کہا "کیوں نہ ہو، جب ایسے ہو تب ایسے ہو۔" تواضع، تعظیم کر کر پاس بٹھلایا اور حاتم کا ملک و املاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا وونھیں چھوڑ دیا۔ نئے سرے سے سرداری قبیلہ طے کی اسے دی۔ اور اس بوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دلوا دیں۔ وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا۔"

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے تمام سنا۔ جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا، جس نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تلک مشہور ہے۔ میں خدا کے حکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں، اگر اس نعمت سے محروم رہوں تو بڑا افسوس ہے۔ فی الواقع دنیا میں کوئی کام، بڑا داد و دہش سے نہیں، اس واسطے کہ آدمی جو کچھ دنیا میں دیتا ہے،

1۔ دونوں بازو باندھ کر۔

2۔ جوتیاں۔

اس کا عوض عاقبت میں لیتا ہے۔ اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے تو اس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات دل میں ٹھہرا کر، میر عمارت کو بلوا کر حکم کیا کہ ایک مکان عالیشان جس کے چالیس دروازے بلند اور بہت کشادہ ہوں، باہر شہر کے جلد بنواؤ۔ تھوڑے عرصے، میں ویسی ہی عمارت وسیع، جیسا دل چاہتا تھا، بن کر تیار ہوئی اور اس مکان میں ہر روز، ہر وقت، فجر سے شام تک، محتاجوں اور بے کسوں کے تئیں روپے اشرفیاں دیتا، اور جو کوئی جس چیز کا سوال کرتا، میں اسے مالا مال کرتا۔

غرض چالیسوں دروازے سے حاجت مند آتے اور جو چاہتے، سو لے جاتے۔ ایک روز کا یہ ذکر ہے کہ ایک فقیر سامنے کے دروازے سے آیا اور سوال کیا۔ میں نے اسے ایک اشرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروازے سے ہو کر آیا۔ دو اشرفیاں مانگیں، میں نے پہچان کر درگزر کی اور دیں۔ اس طرح ان نے ہر ایک دروازے سے آنا اور ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا۔ اور میں بھی جان بوجھ کر انجان ہوا اور اس کے سوال کے موافق دیا گیا۔ آخر چالیسویں دروازے کی راہ سے آکر چالیس اشرفیاں مانگیں۔ وہ بھی میں نے دلوا دیں۔ اتنا کچھ لے کر وہ درویش پھر پہلے دروازے سے گھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا۔ میں نے کہا "سن اے لالچی! تو کیسا فقیر ہے کہ ہرگز فقر کے تینوں حرفوں سے بھی واقف نہیں۔ فقیر کا عمل ان پر چاہیے۔" فقیر بولا "بھلا داتا تمھیں بتاؤ۔" میں نے کہا "ف سے فاقہ، ق سے قناعت، ر سے ریاضت نکلتی ہے۔ جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ فقیر نہیں۔ اتنا جو تجھے ملا ہے اس کو کھا پی کر پھر آئیو اور جو مانگے گا لے جائیو۔ یہ خیرات، احتیاج رفع کرنے کے واسطے ہے نہ جمع کرنے کے لیے۔ اے حریص! چالیس دروازوں سے تو نے ایک اشرفی سے چالیس اشرفیاں تک لیں۔ اس کا حساب تو کر کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں ہوئیں اور اس پر بھی تجھے حرص پھر پہلے دروازے سے لے آئی اتنا مال جمع کر کر، کیا کرے گا؟ فقیر کو چاہیے کہ ایک روز کی فکر کرے، دوسرے دن پھر نئی روزی رزاق دینے والا موجود ہے۔ اب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما۔ یہ کیسی فقیری ہے جو تجھے مرشد نے بتائی ہے؟"

یہ میری بات سن کر خفا اور بد دماغ ہوا اور جتنا مجھ سے لے کر جمع کیا تھا، سب زمین میں ڈال دیا اور بولا "بس بابا! اتنے گرم مت ہو۔ اپنی کائنات لے کر رکھ چھوڑو۔ پھر سخاوت کا نام نہ لیجو، سخی ہونا بہت مشکل ہے۔ تم سخاوت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اس منزل کو کب پہنچو گے؟ ابھی دلی دور ہے۔ "سخی" کے بھی تین حرف ہیں پہلے ان پر عمل کرو تب سخی کہلاؤ۔" تب تو میں ڈرا اور کہا "بھلا داتا! اس کے معنے مجھے سمجھاؤ۔" کہنے لگا "س سے سمائی اور "خ سے خوف الٰہی اور ی سے

یاد رکھنا اپنی پیدائش اور مرنے کو۔ جب تلک اتنا نہ ہو لے تو سخاوت کا نام نہ لے۔ اور سخی کا یہ درجہ ہے کہ اگر بد کار ہو' تو بھی دوست خدا کا ہے۔ اس فقیر نے بہت ملکوں کی سیر کی ہے' لیکن سوائے بصرے کی بادشاہ زادی کے 'کوئی سخی دیکھنے میں نہ آیا۔ سخاوت کا جامہ خدا نے اس عورت پر قطع کیا ہے اور سب نام چاہتے ہیں پر ویسا کام نہیں کرتے۔" یہ سن کر میں نے بہت منت کی اور قسمیں دیں کہ "میری تقصیر معاف کرو اور جو چاہیے 'سو لو" میرا دیا ہرگز نہ لیا، اور یہ بات کہتا ہوا چلا۔ "اب اگر اپنی ساری بادشاہت مجھے دے تو اس پر بھی نہ تھوکوں۔"

وہ تو چلا گیا پر بصرے کی بادشاہ زادی کی یہ تعریف سننے سے دل بے کل ہوا 'کسی طرح کل نہ تھی۔ اب یہ آرزو ہوئی کہ کسی صورت سے بصرے چل کر اس کو دیکھا چاہیے۔

(باغ و بہار)

سوالات

۱۔ داستان گوئی 'حسنِ بیان کا کمال ہے۔ میرامن کی باغ و بہار سے دیے گئے اقتباس کے پیشِ نظر اس پر تبصرہ کیجیے۔

۲۔ اس اقتباس میں الفاظ "فقر" اور "سخی" کے حروف کی جو وضاحت کی گئی ہے' اس پر بحث کیجیے۔

۳۔ "باغ و بہار" کی زبان اور طرزِ بیان کی خصوصیات کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ حاتم کے کردار پر ایک نوٹ لکھیں۔

۵۔ اس داستان سے جو اخلاقی سبق ملتے ہیں' ان کی وضاحت کیجیے۔

—— ○○○ ——
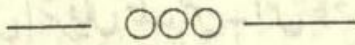
رجب علی بیگ سرور

(۱۷۸۷ء - ۱۸۶۷ء)

لکھنؤ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا اصغر بیگ تھا۔ لکھنؤ میں ہی تعلیم حاصل کی اور عربی و فارسی کے علاوہ خطاطی، موسیقی، شہ سواری اور تیر اندازی میں کمال حاصل کیا۔ سرور شاعری بھی کرتے تھے لیکن شہرت نثر نگاری کی بدولت حاصل کی۔ نہایت زندہ دل، خوش رو اور خوش خو تھے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلاوطن ہونا پڑا اور کانپور چلے گئے اور وہیں اپنے دوست حکیم اسد علی کی فرمائش پر "فسانۂ عجائب" لکھی۔ جب واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے "سرور" کو معافی دے دی اور لکھنؤ بلا کر بڑی عزت و تکریم بخشی۔ سقوط اودھ کی وجہ سے "سرور" کو دوسری بار لکھنؤ چھوڑ کر بے وطن ہونا پڑا۔ اپنے کمالات کی وجہ سے مہاراجہ بنارس، مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ کے درباروں میں رہے۔ بنارس میں انتقال کیا۔

سرور نے تمام زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ ان کی تصانیف میں "فسانۂ عجائب" (۱۸۵۶ء) "شگوفہ محبت" (۱۸۵۶ء) "گلزار سرور"، "شبستان سرور"، "سرور سلطانی" اور "انشائے سرور" (خطوط) شامل ہیں۔ سرور کی شہرت اور اہمیت کی بنیاد ان کی کتاب "فسانۂ عجائب" ہے۔ جس طرح میر امن کی "باغ و بہار" اردو فن داستان گوئی اور نثر نگاری میں دہلوی دبستان کی خصوصیات کی اعلیٰ ترین نمائندہ ہے، اسی طرح "فسانہ عجائب" لکھنوی دبستان کے اسلوب نثر نگاری اور داستان گوئی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ دراصل سرور نے کسی حد تک "فسانہ عجائب" کو "باغ و بہار" کا جواب بنانے کی کوشش اور دعویٰ بھی کیا ہے۔

سرور کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیات میں، مشکل پسندی، دقیق زبان اور مسجع اور مقفیٰ انداز بیان شامل ہیں۔ سرور کثرت سے فارسی و عربی کے مشکل اور نامانوس الفاظ، تلازمات، صنعتیں، مترادفات، تشبیہہ اور استعارے جو دراصل شاعری کے لوازمات ہیں، استعمال کرتے ہیں۔ عبارت آرائی اور تخیل آفرینی ان کے ہاں عام ہے۔ اس وجہ سے ان کی عبارت آج کے قاری کے لیے ادق، مشکل اور متیجتاً غیر دلچسپ ہو جاتی ہے لیکن سرور کے عہد میں یہ خصوصیات داستان گو کی مہارت، زبان و بیان پر قدرت، علمیت اور کمال کا حصہ سمجھی جاتی تھیں۔ اس طور پر یہ اپنے دور کی تہذیب و معاشرت کی نمائندہ بھی ہیں۔ زیر نظر اقتباس جو "فسانۂ عجائب" سے لیا گیا ہے، اس طرز تحریر کا نمونہ ہے۔

بیان جلسۂ شادی

سرور سرایانِ بزمِ شادی و نغمہ پردازانِ محفلِ عروسی و دامادی، انجمن بیاں میں یوں زمزمہ سنج ہوئے ہیں کہ جب جلسۂ عیش و طرب سے فرصت سب کو ہوئی۔ ایک روز بادشاہ جم جاہ محل سرائے خاص میں جلوہ بخش تھا، بی بی سے خلوت میں فرمایا کہ حقوق اور احسان جیسے جان عالم کے ہمارے ذمہ ہمت پر ہیں، تمام عالم جانتا ہے اور یہ بھی نزدیک و دور مشہور ہے کہ عشقِ انجمن

آرا میں نادیدہ مبتلا ہو، سلطنت کھو، یہاں آیا ہے اور کس مردانگی سے جادوگر کو مارا اور اس کے پھندے سے چھڑایا ہے۔ اس سے قطع نظر، صورت، سیرت، خلق، مروت، ہمت، جرأت، یہ جتنی صفتیں ہیں، سب خالق نے عطا کی ہیں۔ حسب عالی، نسب والا، حسن میں مہر و ماہ سے نرالا۔ مناسب کیا، ضرورت ہے کہ جلد سامان شادی درست کر، منعقد کرو۔ خدا جانے آج کیا ہے، کل کیا ہو، کار امروز را بہ فردا مگزار[1]۔ اس نے عرض کی، جو رائے اقدس میں گزرا، یہی میرا عین مطلب تھا۔ بادشاہ نے فرمایا، آج انجمن آرا سے یہ مقدمہ اظہار کر کے، جواب باصواب حاصل کر لو۔ کل سے سرگرم سامان شادی ہو۔

یہ کہہ کے بادشاہ دیوان عام میں رونق افروز ہوا۔ انجمن آرا کو ماں نے طلب کیا اور دو چار مغلانیاں[2]، آتو[3]، سن رسیدہ، محلداریں[4] جہاں دیدہ، قدیم جو تھیں، انھیں بلایا۔ شہ زادی کی جلیسیں بھی یہ خبر سن کر، بے بلائے آئیں۔

اس نے پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا، پیار کیا، پھر کہا، سنو پیاری! دنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک، بیٹی کسی کی، ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور غیرت دار کے گھر میں لڑکی جوان، ہروقت رنج کا نشان، خفت کا سامان ہے۔ اور خدا و رسولؐ کا بھی حکم یہی ہے کہ جوان کو بٹھانہ رکھو، شادی کر دو۔ ورائے ان باتوں کے، ایک شخص نے تمھارے واسطے گھر بار چھوڑا۔ سلطنت سے ہاتھ اٹھا کسی آفت سے منہ نہ موڑا۔ جی پر کھیل گیا، کیا کیا بلائیں جھیل گیا۔ سرکھپی[5] اور جان جوکھوں کی۔ جب تم نے ہم کو دیکھا ہم نے تمھاری صورت دیکھی۔ شکل میں پری شمائل، فرخندہ خو، فرشتہ خصائل۔ تمام شہر عاشق زار ہے۔ چھوٹا بڑا اس پر فریفتہ و نثار ہے۔ ہرچند، تم پارہ جگر، نور نظر ہو، مگر واری، جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میں اس میں بڑا فرق ہے۔ تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے۔ وہ مرد میدان نبرد ہے۔

انجمن آرا نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ رونے لگی۔ کہا حضرتؑ صورت شکل کا مذکور یہاں کیا ضرور تھا۔ یہ اللہ کی قدرت ہے، کسی کو بنایا، کسی کو بگاڑا۔ بہت سے لولے لنگڑے، کانے کھدرے، گونگے بہرے ہیں۔ وہ چاہیے، نہ جئیں۔ کہیں نور ہے، کہیں نار ہے، گل کے پہلو میں خار ہے، یہ

۱۔ آج کا کام کل پر مت چھوڑ۔
۲۔ رئیسوں کے گھر کی وہ ملازم عورتیں جن کے ذمے گھر کے کپڑے سینے پرونے کی خدمت ہو۔
۳۔ استانی۔
۴۔ وہ عورتیں جو محل کا انتظام کرتیں اور ملازمان محل کی افسر ہوتی تھیں۔
۵۔ بہت کوشش کی، جان لڑا دی۔

خار ہے' یہ سب صفت پروردگار ہے' دنیا میں کون سی شے بے کار ہے۔ بلکہ بروں سے اچھوں کی تمیز ہے' یوں تو بادشاہ مصر' غلام عزیز ہے۔ اور جو بار احسان سے دب کر فرماتی ہو کہ ایسا کرو' تو دنیا عالم اسباب ہے۔ ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے۔ یہ شخص نہ آتا اور میرے مقدر میں رہائی ہوتی' کچھ ایسا سامان نکل آتا' اور کوئی اللہ کا ولی پیدا ہو جاتا' میری بند چھڑاتا۔

نیک و بد زمانہ نہیں اختیار میں
ہوتا وہی سرور ہے' جو سرنوشت ہو

میری قسمت کم بخت بری ہے۔ ایک مصیبت سے چھڑایا' دوسری آفت میں پھنسایا۔ ہردم کے طعنے اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا' مجھے قید سے چھڑایا۔ خدا جانے وہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے! اپنے منہ سے میاں مٹھو' شہ زادہ ہونے کا سب میں غل مچایا ہے۔ میں آپ کی لونڈی ہوں' بہ ہر صورت فرماں بردار۔ اگر کنویں میں جھونک دو' چاہ سے گر پڑوں' اف نہ کروں۔ مگر جو آپ اس کی صورت شکل پر ریجھ' محنت اور مشقت کو سمجھ بوجھ' یہ مقدمہ' کیا چاہتی ہیں' تو میں راضی نہیں۔ اگر مزدوری کی اجرت' خدمت کا انعام منظور ہے' کہ بادشاہوں کے نزدیک احسان کسی کا اٹھانا' بہت دور ہے۔ تو روپیہ' اشرفی' جاگیر عنایت کرو کہ اس کا بھلا ہو' کام ہو' آپ کا نام ہو۔

یہ فقرہ سن کر وہ بہت ہنسی' کہا' شاباش بچی' اس کی جانفشانی کی خوب قدر دانی کی۔ واقعی وہ بے چارہ تمھارے ملک کا یا روپے پیسے کا محتاج ہے۔ اری نادان! وہ تو خود صاحب تخت و تاج ہے۔ اس بات پر ہم سنوں نے قہقہہ مارا' کہا حضور' بس ان کا یہ شعور ہے۔ ان کے نزدیک وہ شاہ زادہ نہیں' مزدور ہے۔ انجمن آرا نے جھنجھلا کے کہا' روپیہ وہ شے ہے اور ملک وہ چیز ہے کہ اس کے واسطے اسفندیار سا روئیں تن مارا گیا' فریدون و افراسیاب کا سر اتار اگیا۔

وہ جو دائی' ددا[1]' آتو' مغلانیاں پرانی پرانیاں حاضر تھیں۔ بولیں' قربان جائیں' واری' تمھیں انکار مناسب نہیں۔ اور ماں باپ کی عدول حکمی میں خدا رسول کی نافرمانی ہوتی ہے۔ خدانخواستہ یہ کیا تمھاری دشمن ہیں' جو راہ چلتے کے حوالے' کسی کے کہے سنے سے' بے دیکھے بھالے کر دیں گی۔ آدمی روز بروز عقل و شعور سیکھتا ہے۔ نشیب فراز' بات کا محل موقع سوچتا سمجھتا ہے۔ تم سلامتی سے' ابھی تک وہی بچپنے کی باتیں کرتی ہو' کھیلنے کودنے کے سوا قدم نہیں دھرتی ہو۔

ا۔ وہ عورت جو بچوں کی پرورش کے لیے ملازم ہو۔

انجمن آرا نے جواب نہ دیا، سرزانو پر رکھ لیا۔ لیکن وہ جو امیر زادیاں، اس کی ہم نشین، جلیسیں تھیں، جن سے راتوں کو اسی دن کے روز مشورے رہتے تھے۔ بولیں ہے ہے، لوگو تمھیں کیا ہوا ہے۔ آتو جی صاحب، بے ادبی معاف، آپ نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا ہے۔ خیر ہے صاحبو! دلھن سے صاف صاف کہوایا چاہتی ہو۔ دنیا کی شرم و حیا نگوڑی کیا اڑ گئی۔ اتنا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے، جو یہ نہ مانیں گی۔ الخاموشی نیم رضا۔ بوڑھے بڑے کے رو بہ رو اور کہنا کیا۔ یہ سن کے آتو قدیم، جس نے انجمن آرا کو ہاتھوں پر کھلایا تھا، پڑھایا لکھایا تھا، بسم اللہ کہہ کے اٹھی، انجمن آرا کی ماں کو نذر دی، مبارک بادی کہہ کے ہنسنے لگی۔ محل میں قہقہے مچے۔ شہ زادی بناوٹ سے رونے لگی۔ نواب ناظر، بیگم کی نذر لے کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ نذر دی، خلعت مرحمت ہوا۔ یہاں تو ارکان سلطنت اسی دن کے روز منتظر رہتے تھے، یہ مژدہ فرحت افزا دریافت کر کے اٹھے، بہ مراتب نذریں گزریں۔ توپ خانوں میں شلک[1] کا حکم پہنچا۔ نوبت خانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ تمام شہر آگاہ ہوا کہ اب بیاہ ہوا۔ مبارک سلامت کی صدا زمین و آسمان سے پیدا ہوئی۔

فلک پر یہ مبارکباد ہے اب کس کے ملنے کی
یہ ایسا کون بختاور ہے، جس کا بخت جاگا ہے

بادشاہ نے وزیر اعظم سے ارشاد کیا۔ جان عالم یہاں مسافرانہ وارد ہوا ہے، تم امورات محل میں مستعد رہو، ہم اس کا سامان سرانجام کریں۔ وزیر آداب بجالایا۔ خلعت فاخرہ ملا۔ ہاتھی، پالکی سے سرفراز ہوا۔ جان عالم کا یہ نقشہ تھا، چہرے پر بشاشت سے سرخی، باچھیں تابنا گوش کھلیں۔ فرحت کے باعث بند قبا ٹوٹے جاتے تھے۔ پھولے نہ سماتے تھے، مگر شرم کے باعث آپ سر نہ اٹھاتے تھے۔

بادشاہ نے رمال، نجومی، پنڈت، جفرداں، جو جو علم ہیئت اور ہندسہ اور نجوم میں طاق، شہرۂ آفاق تھے، طلب کیے اور ساعتِ سعید کا سوال کیا۔ کسی نے قرعہ پھینکا، زائچہ[2] کھینچا، شکلیں لکھیں۔ کسی نے پوتھی[3] کھولی۔ کوئی حرف مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا۔ اور بالاتفاق ایک روز مقرر کیا۔ حضور سے، بہ قدر علم و کمال، خلعت اور انعام عنایت ہوا اور بعد جلسۂ شادی، بہ امید دیگر و

۱۔ توپوں کی باڑھ جو سلامی کے واسطے یا کسی خوشی کے موقع پر چھوڑی جائے۔
۲۔ رمل کی شکلیں۔
۳۔ علم نجوم کی کتاب جو ہندوؤں میں رائج ہے۔

امداد وافر امیدوار کیا۔

القصہ بہ موجب احکام اختر شناسانِ بلند بیں، فلک سیر، ماضی، مستقبل کے حال دان، باریک خیال و منجمانِ صدر نشین مسندِ کنشت و دَیر [1]، حکم روایانِ خوش فال، مانجھے کا جوڑا، دلھن کے گھر سے چلا۔ مزدور سے تا فیل نشیں، زن و مرد فرد فرد، بالباس رنگین۔ پکھراج کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے۔ سنہرے خوانوں میں پینڈیاں [2]۔ مقوی، مفرح، ذائقہ ٹپکتا، خوان تک بسا اور دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے۔ طلائی چوکی، جواہر جڑا زمرد نگار کٹورا بٹنا ملنے کا۔ کنگنا بہ از عقد ثریا، در یکتا بڑا بڑا۔ لنگی ملتان کی تھی۔ بیل بوٹے میں گلستان کی تھی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پر خندہ زن ہو۔ معطر دماغ انجمن ہو۔ کنٹروں [3] میں عطر سہاگ، مہک پری، ایجاد نصیر الدین حیدری، ارگجا محمد شاہی [4]۔ فتنے کی بو چار سو، زعفران کا تختہ کھلا، کوسوں تک خوان سے خوان ملا۔ نوبت نشان، گھوڑوں پر شہنا نواز، نقارچی جوان جوان۔ سکھپال [5] اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں۔

اس سامان سے وہ سب مانجھالے کے، در دولت نوشاہ پر جو بس گئے، شہر کے کوچہ و بازار بس گئے۔ وہاں دولھا، یہاں دلھن نے مانجھے کے جوڑے پہنے۔ مبارک سلامت سب لگے کہنے۔ منادی نے ندا کی۔ جو سفید پوش نظر آئے گا، اپنے خون سے سرخ ہو گا، یعنی گردن مارا جائے گا۔ بادشاہ نے خود ملبوس خاص رنگین زیب جسم کی، رنگ کھیلنے لگا۔ تمام خلقت ہولی کی کیفیت بھولی۔ شہر میں شہاب اور زعفران کے سرخ و زرد نالے بہے۔ گلیوں میں عبر [6] و گلال [7] کے ٹیلے ٹیکرے رہے۔ کوچہ ہر بازار کا زعفران زار کشمیر تھا۔ ایک رنگ میں ڈوبا امیر و فقیر تھا۔

پھر بہ تاکید تمام خاص و عام کو حکم ہوا کہ آج سے چوتھی تک، سوائے اہل حرفہ، اپنے امور ضروری موقوف کر، گھروں میں ناچ دیکھو، جشن کرو۔ جو کچھ احتیاج ہو، سرکار سے لو۔ اور ہر رئیس محلّہ، سردار قوم سے فرمایا، جو جو تم سے متعلق ہوں، ان کی فرد درست کر، حضور میں گزرانو، سب کو ہمارا مہمان جانو۔ ان کے کھانے پینے کا سامان، خواہ ہندو ہو یا مسلمان، حضور سے

۱۔ آتش خانہ اور بت کدہ۔
۲۔ لڈو کی قسم۔
۳۔ شیشے کی مینا / برتن۔
۴۔ مرکب عطر کا نام، صندل، گلاب، کافور، مشک اور عنبر سے مرکب۔
۵۔ پالکی کی قسمیں۔
۶۔ ایک خوشبو دار مرکب جو مشک، گلاب، صندل وغیرہ سے تیار کیا جاتا تھا اور کپڑوں پر چھڑکا جاتا تھا۔
۷۔ سرخ رنگ۔

ملے گا۔

دکان داروں کو ارشاد ہوا، دن رات دکانیں کھلی رہیں، قریب قریب ناچ ہو۔ ان کے کھانے کا صرف، تصرفی[1] باورچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندو کو، پوری، کچوری، مٹھائی، اچار، مسلمان کو، پلاؤ قلیہ[2]، زردہ، قورمہ، ایک آبی[3]، دوسری شیرمال، فرنی کا خوانچہ، تشتری کباب کی، بہت آب و تاب کی۔ شہر میں گلی گلی عیش و طرب، خوشی میں چھوٹے بڑے سب، نہ کسی کو کسی سے غرض نہ مطلب۔ پکا پکایا کھانا کھانا، دکانوں میں بیٹھے ہر وقت ناچ دیکھنا، سرکار کا کام بنانا، بغلیں بجانا۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد[4]

اور اس سے پہلے بہ تعین تاریخ روز شادی، نامے بادشاہوں کو، فرمان راجا بابو کو، صوبے داروں کو شقے[5] عاملوں کو پروانے جا چکے تھے۔ دو چار منزل گرد و پیش، سر راہ دو دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور حلوائی، کھانا، مٹھائی گرما گرم تیار کیے رہتے تھے کہ اس عرصے میں جو مسافر گزرے، یا طلیدہ بادشاہ آئے، بھوکا نہ جائے۔

(فسانہ عجائب)

سوالات

۱۔ فسانہ عجائب کی سب سے بڑی خوبی لکھنوی تہذیب کی آئینہ داری ہے۔ مثالوں سے وضاحت کیجیے۔
۲۔ اس سبق میں داستان کے عناصر کی نشاندہی کیجیے۔
۳۔ اس سبق سے مقفّیٰ جملوں کی دس مثالیں دیجیے۔
۴۔ اس سبق میں ایسے الفاظ کی فہرست بنائیے جو اب عام طور پر مستعمل نہیں ہیں۔

—— OOO ——

۱۔ جو عوام اور ملازمین کے لیے ہو، خاصہ کی ضد۔
۲۔ شوربہ دار گوشت۔
۳۔ ایک قسم کے میدے کی روغنی روٹی۔
۴۔ بہشت وہ جگہ ہے جہاں کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی اور کسی کو کسی سے کچھ سروکار نہیں ہوگا۔
۵۔ رقعہ یا خط جو بادشاہ اپنے کم مرتبہ حاکموں کو لکھتے ہیں۔

ناول

ناول بنیادی طور پر اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی نیا یا انوکھا کے ہیں۔ ناول کی صنف اردو ادب میں انگریزی کے زیر اثر شروع ہوئی۔ ناول ایسی افسانوی صنف ادب ہے جس میں ناول نگار اپنے نقطہ نظر کے مطابق ایک ایسا تخلیقی قصہ پیش کرتا ہے جس میں اپنے تخیل سے کام لیتے ہوئے واقعات ' پلاٹ اور کرداروں کا خاکہ تیار کرتا ہے تاکہ وہ زندگی کے ایک رخ کی مکمل اور حقیقی تصویر یا تعبیر پیش کرنے کی کوشش کرے۔ تخلیق کو حقیقت کا جامہ پہنا کر اس طرح پیش کرنا کہ قصے کی حیثیت سے اس کے تمام اجزا میں ہم آہنگی قائم رہے ' ناول ہے۔

فنی اعتبار سے ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ 'کردار' مکالمہ' منظر نگاری اور نظریہ حیات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قصے کے واقعات میں جب ایسا معنوی اور باطنی ربط و تسلسل پیدا ہو جاتا ہے کہ اگلا واقعہ پچھلے واقعے کا لازمی اور منطقی نتیجہ معلوم ہو تو اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ کے ابتدائی حصے میں ناول نگار کرداروں کو روشناس کرا دیتا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے معاملات میں گتھیاں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔ تیسرے حصے میں وہ معاملات الجھ جاتے ہیں۔ یہ حصہ کہانی کا نقطہ عروج کہلاتا ہے۔ چوتھے حصے میں معاملات سلجھنے لگتے ہیں اور پانچویں اور آخری حصے میں نتائج بر آمد ہوتے ہیں اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

ناول انسانی زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ اس کے کردار بھی عام انسان ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی ناول کے کردار حقیقی زندگی سے جس قدر قریب ہوں گے اسی قدر وہ ناول کامیاب کہلایا جائے گا۔ گویا ناول کا سفر تخیل سے حقیقت کی طرف ہوتا ہے چنانچہ ہر ناول ایک ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے اور فطرت انسان سے نقاب اٹھانے کی ایک کوشش۔ ناول جس قدر خوبصورتی کے ساتھ زندگی کی تہ در تہ حقیقتوں سے پردہ اٹھائے گا اسی قدر مقبول بھی ہو گا۔ اس میں انسانی جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ اس اظہار کے لیے ناول نگار کو مکالمے کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ مکالمہ اظہار خیال کا ایک موثر ذریعہ ہے' اسی لیے مکالمہ ناول کا ضروری جزو ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مکالمہ فطری' مناسب' موزوں' واضح اور دلچسپ ہو اور اس میں عمر' رشتہ' طبقات اور جغرافیائی حالات کا خیال رکھا گیا ہو تاکہ ناول مجموعی طور پر بالکل حقیقی لگے۔

منظر نگاری بھی ناول کے عناصر ترکیبی کا ایک جزو ہے۔ اس سے ناول کے تاثرات اجاگر ہوتے ہیں اور زمان و مکان کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ منظر کردار کی ذہنی کیفیت سے جس قدر قریب ہو گا اتنی ہی کردار کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے۔ ایک اچھا ناول نگار مناظر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس جگہ کی مکمل تصویر آ جاتی ہے۔ شرر' پریم چند اور کرشن چندر کے ناولوں میں منظر نگاری کے کامیاب ترین نمونے ملتے ہیں۔

ہر تحریر کسی نہ کسی مقصد کا اظہار کرتی ہے۔ ناول نگار بھی کسی مقصد کے تحت ناول کی تخلیق کرتا ہے لیکن اس مقصد کو وہ تقریر' وعظ یا خطاب کی صورت میں بیان نہیں کرتا بلکہ کہانی کے پردے میں اپنا نقطہ نظر اس طرح واضح کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ ناول نگار اسے کسی خاص مقصد کی طرف لے جا رہا ہے۔ ناول نگار کا نقطہ نظر ناول کے پلاٹ 'کردار نگاری اور بیان کی تہ میں زندگی کی حرارت کی طرح موجود رہتا ہے۔

انگریزی میں رچرڈ سن اور فیلڈنگ ناول کے موجد کہے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں نذیر احمد کی کہانیوں کو ناول کا اولین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو میں جس وقت ناول وجود میں آیا اس وقت برصغیر مختلف قسم کی تبدیلیوں سے دو چار تھا لیکن یہ تبدیلیاں یورپ کی طرح صنعتی ترقی کا فطری نتیجہ نہیں تھیں بلکہ وہ غیر ملکی سامراج سے یہاں کے جاگیردارانہ ساکن تمدن کے تصادم کے زیر اثر سامنے آرہی تھیں اور بڑی حد تک اس عہد کی اصلاحی تحریکوں کا نتیجہ تھیں۔ نذیر احمد بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے تھے چنانچہ اسی زمانے میں ان کے ہاتھوں ناول کا آغاز ہوا۔ اور ۱۸۶۰ء میں انھوں نے پہلا ناول "مرآۃ العروس" لکھا۔ اس کے چند ہی سال بعد "توبتہ النصوح" لکھا گیا۔ ان کے علاوہ "بنات النعش"، "رویائے صادقہ"، "فسانہ مبتلا" اور "ابن الوقت" ان کے مشہور ناول ہیں۔

ناول کے یہ اولین نمونے جو نذیر احمد کے قصوں کی شکل میں وجود میں آئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے لیکن اس کے باوجود ان کے قصوں میں جو ارضیت ہے، فوق الفطرت عناصر سے جو گریز ہے اور اپنے زمانے کی معاشرت اور گھریلو زندگی کا جو بھرپور عکس ہے اس نے انھیں ناول کے فن سے قریب کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ چونکہ یہ ناول خصوصیت کے ساتھ معاشرتی اصلاح کی خاطر تحریر کیے گئے تھے اس لیے ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

نذیر احمد کے بعد جو نام ناول کے حوالے سے بہت مشہور ہوا وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ ان کا پہلا ناول "فسانہ آزاد" ۱۸۷۹ء میں پہلے اودھ اخبار میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔ فسانہ آزاد کا موضوع لکھنؤ میں جاگیردارانہ عہد کی زوال پذیر معاشرت ہے لیکن اس محدود دائرے میں سرشار نے جو وسعت پیدا کی ہے وہ ان کے مشاہدے کی گہرائی کا ثبوت ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں واقعات میں باہمی ربط و اتحاد نہیں ہے۔ البتہ کردار نگاری میں جذبات کا جو تنوع اس میں ملتا ہے اس نے فسانہ آزاد کو ایک ممتاز حیثیت بخشی ہے۔ اس میں ہر پیشے اور ہر طبقے کے افراد جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اس کے علاوہ بھی کئی ناول لکھے لیکن وہ فسانہ آزاد کے مقابلے میں ماند پڑ گئے۔

اردو ناول نگاروں میں مولانا عبدالحلیم شرر پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ناول نگاری کے فن کو سمجھنے، اپنانے اور برتنے کی کوشش کی اور تاریخی ناول کا آغاز کیا۔ انھوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے یورپ کے قیام کے دوران میں وہاں کی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون پر نظر ڈالی تھی جس کی جھلک ان کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں مسلمانوں کے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی عروج اور عیسائی قوم کے زوال سے پس منظر کا کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے ناول اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے دلکش انداز بیان، برجستہ مکالموں اور منظر نگاری کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ دوسری طرف انھوں نے اپنے ناولوں کا پلاٹ عشق و محبت کی واردات اور جرأت و بہادری کے واقعات سے بنایا ہے اسی لیے ان کے ناول کسی مقام پر بھی اپنی دلچسپی نہیں کھوتے۔ ان کے ناولوں میں "فردوس بریں" اور "منصور موہنا" سرفہرست ہیں۔

اردو میں مرزا ہادی رسوا کے ناولوں سے ایک نیا رنگ شروع ہوتا ہے۔ وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے

حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا' روز مرہ زندگی سے پلاٹ اخذ کیے اور چند معمولی شخصیتوں کو لے کر ان کی عظمت اور دلآویزی کا احساس دلایا۔ ان کا طرز تحریر صاف ' واضح اور رواں ہے اور اپنے عہد کی زبان ' معاشرت اور سوچ کا مکمل ترجمان ہے۔ انھوں نے کئی ناول لکھے اور بہت سے ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کے طبع زاد ناولوں میں "امراؤ جان ادا" ' "شریف زادہ" اور "ذات شریف" زیادہ مشہور ہوئے۔ لیکن امراؤ جان ادا سب سے بہتر ناول ہے اور یہی سب سے زیادہ مقبول بھی ہوا ' اسے آج بھی اردو ادب کا ایک بے مثال ناول تصور کیا جاتا ہے۔

اب تک اردو ناول نگاروں نے جس معاشرت کو پیش کیا تھا وہ شہری زندگی سے متعلق تھی اور زیادہ بڑی آبادی پر مشتمل دیہاتی زندگی کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ پریم چند نے دیہاتی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنے دور کے پیچیدہ مسائل پر غور و فکر کیا اور اپنے ناولوں میں اس عہد کے انسانوں کی تصویر ان کے سماجی ' سیاسی اور تہذیبی رابطوں کے پس منظر کے ساتھ پیش کی۔ انھوں نے ناول ' افسانے ' ڈرامے اور مضامین سب کچھ لکھے لیکن ان کی شہرت ان کے افسانوں اور ناولوں کی وجہ سے ہے ' ان کے ناولوں میں "بازار حسن" ' "گوشہ عافیت" ' نرملا ' پردہ مجاز ' چوگان ہستی ' میدان عمل اور گئو دان اہم ہیں۔ گئو دان ان کا آخری ناول ہے اور ان کا نمائندہ ناول کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

پریم چند کے بعد جن ادیبوں نے اردو ناول کی روایات کو آگے بڑھا کر مزید فروغ دیا ان میں کرشن چندر ' خواجہ احمد عباس ' علی عباس حسینی ' صالحہ عابد حسین ' قرۃ العین حیدر ' عزیز احمد ' خدیجہ مستور ' عبداللہ حسین ' قاضی عبدالستار اور سجاد ظہیر کے علاوہ عصمت چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں کی طرح ان کے ناولوں میں بھی رومان اور حقیقت کی خوبصورت آمیزش ہے۔ ان کا سب سے خوبصورت اور کامیاب ناول "شکست" تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ "دل کی وادیاں سو گئیں" ' "آسمان روشن ہے" اور "سڑک واپس جاتی ہے" ان کے نمائندہ ناول تصور کیے جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "آگ کا دریا" جدید اردو ناول نگاری میں بے مثل اور گراں قدر اضافہ ہیں۔ "آگ کا دریا" بلاشبہ ان کا شاہکار اور اردو کے چند بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔

اسی طرح خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" ہے جو فن ناول نگاری کا ایک اچھا اور معیاری نمونہ ہے اور اسے اردو کے بہترین ناولوں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" یقیناً ناول کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ عصمت چغتائی کے ناول "ضدی" اور "ٹیڑھی لکیر" جہاں اردو کے نمائندہ ناول ہیں وہاں قاضی عبدالستار کا ناول "شب گزیدہ" جدید اردو ناول میں قابل قدر اضافہ ہے۔

اگرچہ اردو میں ناول بکثرت لکھے گئے لیکن ابھی تک ایسے معیاری اور مکمل ناولوں کی تعداد کم ہے جنھیں ہم ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل رکھ سکیں۔ تاہم اس طرف دَور حاضر میں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور ہمارے ادیب ناول کی ترویج و ترقی میں جس قدر کوشاں ہیں اس سے اس امید کو تقویت پہنچتی ہے کہ مستقبل قریب میں بہت سے معیاری ناول منظرِ عام پر آئیں گے۔

مولوی نذیر احمد دہلوی
(۱۸۳۶ء - ۱۹۱۲ء)

نذیر احمد موضع ریٹر، تحصیل نگینہ، ضلع بجنور (یو۔ پی بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ابتدائی تعلیم کچھ مکتب اور کچھ والد صاحب سے حاصل کی۔ ۱۴ برس کی عمر میں دہلی آ گئے۔ کچھ عرصہ مسجد کے مکتب میں بسر کیا جہاں گزر بسر کے لیے روٹیاں بھی جمع کیا کرتے تھے، پھر "دہلی کالج" میں داخلہ مل گیا۔ دہلی کالج میں ادب، عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ کالج میں ان کے ساتھ محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، منشی کریم الدین اور ماسٹر پیارے لال آشوب بھی پڑھتے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں کنجاہ، ضلع گجرات میں مدرس کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ قانون انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کے اردو میں ترجمے کیے جن کے صلے میں تحصیلدار بنا دیے گئے۔ بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد حیدر آباد دکن بلائے گئے جہاں ترقی کرتے ہوئے ممبر بورڈ آف ریونیو ہو گئے۔ ریٹائر ہونے پر دلی واپس آ گئے اور بقیہ عمر علمی و ادبی مشاغل میں بسر کی۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگریاں دیں۔ گورنمنٹ سے شمس العلما اور خان بہادر کے خطاب پائے۔

نذیر احمد کو اردو کا اولین ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ "مراۃ العروس" ان کا پہلا ناول ہے۔ اس میں دو بہنوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ نذیر احمد کی زبان دلی کی صاف اور بامحاورہ زبان ہے۔ ان کو کہانی کے بیان اور کردار کشی میں خاص ملکہ حاصل ہے لیکن ان کے کردار عموماً مثالی ہوتے ہیں۔ "مرآۃ العروس" میں اصغری کا کردار ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار، جب کہ اکبری کا کردار ایک پھوہڑ اور بد سلیقہ لڑکی کے کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہی صورت ان کے دیگر ناولوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ سبق آموزی اور اصلاح کے نقطہ نظر سے ترتیب دیے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ناولوں کی دلچسپی اور ہر دل عزیزی آج بھی قائم ہے۔ ان کے ناول اپنے دور کے متوسط طبقے کے مسلمان شرفا کے خاندانوں کی زندگیوں کے نہایت ہی دل چسپ مرقعے پیش کرتے ہیں اور دلی کی معاشرتی زندگی اور اندرون خانہ تہذیب کی نہایت دل چسپ تصویریں ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس "مرآۃ العروس" سے لیا گیا ہے۔

مولوی نذیر احمد کی اہم تصانیف میں "مرآۃ العروس" (۱۸۶۹ء)، "توبتہ النصوح" (۱۸۸۸ء)، "رویائے صادقہ"، (ایامیٰ)، "منتخب الحکایات"، "چند پند"، "موعظہ حسنہ"، "ترجمہ قرآن مجید"، "الحقوق و الفرائض"، "الاجتہاد"، "امہات الامہ" اور "مبادی الحکمت" شامل ہیں۔

مزاج دار بہو[1]

محمد عاقل اور محمد کامل دو بھائی حقیقی تھے۔ اکبری کا بیاہ بڑے بھائی محمد عاقل سے ہوا تھا اور اصغری

۱۔ اکبری کی عادات کے سبب اس کا لقب۔

کی بات محمد کامل سے ٹھہر چکی تھی مگر بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اکبری کی بدمزاجی کے سبب قریب تھا کہ اصغری کی منگنی بھی چھوٹ جائے لیکن ان لڑکیوں کی خالہ جو محمد عاقل کے گھر کے پاس رہتی تھی ہمیشہ اصلاح کیا کرتی تھی اور اگرچہ اکبری لڑ کر چلی گئی تھی لیکن خالہ نے بہت کچھ لعنت ملامت کی اور پس و پیش سمجھایا۔ آخر کار کئی مہینے بعد رمضان کی تقریب سے بھانجی کو سسرال لوا لائی۔ چند روز تک محمد عاقل مزاج دار بہو سے ناخوش رہا۔ آخر کو خلیا ساس نے میاں بی بی کا ملاپ کرا دیا، لیکن جب مزاجوں میں ناموافقت ہوتی ہے تو ہر ایک بات میں بگاڑ کا سامان موجود ہوتا ہے۔

محمد عاقل نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میں نے ایک دوست کی دعوت کی ہے۔ انطاری اور کھانے کا زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔ ماں نے جواب دیا، خدا جانے کس مصیبت سے میں روٹی بھی پکا لیتی ہوں۔ تین دن سے افطار کے وقت مجھ کو لرزہ چڑھتا ہے۔ مجھ کو اپنی خبر تک نہیں رہتی، خدا ہمسائی کا بھلا کرے کہ وہ اتنا بھی پکا دیتی ہے۔ تم نے دعوت سے پہلے گھر میں پوچھ تو لیا ہوتا۔ محمد عاقل نے تعجب کی راہ سے بی بی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اتنے کام کی بھی نہیں ہیں، بہو کو اتنا ضبط کہاں تھا کہ اتنی بات سن کر چپ رہے، سنتے ہی بولی "اس بوڑھی اماں سے پوچھو کہ بیٹے کا بیاہ کیا ہے یا لونڈی مول لی ہے۔ لو صاحب! روزے میں چولھا جھونکنا۔"

محمد عاقل نے سوچا "اب اگر میں کچھ رد و کد کرتا ہوں پہلے کی طرح رسوائی ہوگی۔" اپنا سامنہ لے کر رہ گیا اور افطار کے واسطے کچھ بازار سے مول لے آیا۔ غرض وہ بات ٹل گئی۔

اب محمد عاقل کو دوسری آفت پیش آئی، یعنی عید۔ بیچارے نے ایک ہفتہ آگے سے مزاج دار بہو صاحب کے جوڑے کی تیاری شروع کی۔ ہر روز طرح طرح کے کپڑے، رنگ برنگ کی چوڑیاں، ڈیڑھ حاشیے اور سلمے ستارے کی کامدار جوتیاں لاتا تھا۔ مزاج دار کی خاطر میں کچھ نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ عید کا ایک دن باقی رہ گیا۔ مجبور ہو کر اکبری خانم کی خالہ کے پاس گیا۔ انھوں نے آواز سن کر اندر بلا لیا۔ بلائیں لیں۔ پیار سے بٹھایا۔ پان بنا کر دیا اور پوچھا کہو "اکبری تو اچھی ہے؟"

محمد عاقل نے کہا "صاحب آپ کی بھانجی تو عجب مزاج کی عورت ہے۔ میرا تو دم ناک میں آگیا ہے۔ جو ادا ہے سو نرالی اور جو بات ہے سو ٹیڑھی۔"

خلیا ساس نے کہا۔ "بیٹا! اس کا کچھ خیال مت کرو۔ ابھی کم عمر ہے، بال بچے ہوں گے، گھر کا بوجھ پڑے گا، مزاج خود بخود درست ہو جائے گا اور آخر اچھے لوگ بروں سے بھی نباہ کرتے ہیں۔ بیٹا! تم کو خدا نے سب طرح لائق کیا ہے۔ ایسی بات نہ ہو کہ لوگ ہنسیں، آخر تمہاری

ناموس ہے۔"

محمد عاقل نے کہا۔ "جناب! میں تو خود اسی خیال سے درگزر کرتا رہتا ہوں' اب دیکھیے کل عید ہے۔ اس وقت تک نہ چوڑیاں پہنی ہیں' نہ کپڑے بنائے ہیں۔ ذرا آپ چل کر سمجھا دیجیے۔ میں نے بہت کچھ کہا۔ اماں نے بہت منتیں کیں' نہیں مانتیں۔"

خلیا ساس نے کہا۔ "اچھا تمھارے خالو ابا نماز پڑھنے مسجد میں گئے ہیں۔ وہ آلیں تو ان سے پوچھ کر میں چلتی ہوں۔"

غرض خالہ اماں نے جاکر چوڑیاں پہنائیں۔ کپڑے قطع کیے جلدی کے واسطے سب مل کر سینے بیٹھیں۔

خالہ نے کہا۔ "بیٹی! پائجامے میں کلیاں تو تم لگاؤ۔ گوٹ[1] تمھاری ساس کتریں' میں اتنے میں تمھارے دوپٹے میں توئی ٹانکتی ہوں۔"

جب اکبری کلیاں لگا چکی تو اس نے اترا کر خالہ سے کہا۔ "لو بی! تم کو ابھی دو پلے باقی ہیں اور میں دونوں پائچوں میں کلیاں لگا بھی چکی۔"

خالہ نے دیکھا تو سب کلیاں الٹی۔ اکبری کی ساس کے لحاظ سے منہ پر تو کچھ نہ کہا۔ لیکن چپکے چپکے دو چار چٹکیاں ایسی لیں کہ اکبری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اشارے سے کہا کہ "اے نامراد سوجھ تو! الٹی کلیاں لگا بیٹھی۔"

اکبری نے اپنا سیا ہوا سب ادھیڑا اور پھر کلیاں لگانی شروع کیں۔ جب لگا چکی' خالہ نے دیکھا تو سب میں جھول۔ اب تو خالہ سے نہ رہا گیا اور اکبری کی ساس کی آنکھ بچا ایک سوئی اکبری کے ہاتھ میں چبھو دی اور کلیاں پھر ادھیڑ کر آپ لگائیں۔

غرض خدا خدا کر کے مزاج دار بہو کا جوڑا سل سلا کر تیار ہوا۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ اکبری کی خالہ اپنے گھر کو رخصت ہوئیں۔ یہ سب لوگ بھی سو سلا رہے۔

بچے عید کی خوشی میں سویرے سے جاگے۔ کسی نے رات کی مہندی کھولی' کسی نے کھلی[2] اور بیسن کے لیے غل مچایا۔ کسی نے اٹھتے کے ساتھ عیدی مانگنی شروع کی۔ محمد عاقل بھی نماز صبح

1۔ کپڑے پر بنی بیل جو عورتیں دوپٹے پر ٹانکتی ہیں۔
2۔ سرسوں' تل یا بنولے کا پھوگ جو سر دھونے یا نہانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

سے فارغ ہو کر حمام میں غسل کرنے چلا گیا۔ نہا دھو کر چار گھڑی دن چڑھے واپس آیا۔ لڑکوں کو دیکھا کہ کپڑے بدل بدلا کر عید گاہ کے واسطے تیار بیٹھے ہیں لیکن مزاج دار بہو صاحب حسبِ عادت سو رہی ہیں۔

محمد عاقل نے اپنی چھوٹی بہن محمودہ سے کہا۔ "محمودہ جاؤ اپنی بھابی کو جگا دو۔"

پہلے تو محمودہ نے تامل کیا اس واسطے کہ یہ مزاج دار بہو سے بہت ڈرتی تھی۔ جب سے بیاہ ہوا، مزاج دار نے ایک دن بھی اپنی چھوٹی نند کے ساتھ محبت سے بات نہیں کی تھی اور نہ کبھی اس کو اپنے پاس آنے اور بیٹھنے دیا تھا۔ لیکن بھائی کے کہنے سے عید کی خوشی میں محمودہ دوڑی چلی گئی اور کہا۔ "بھابی اٹھو۔"

بھابی نے اٹھتے کے ساتھ محمودہ کے ایک طمانچہ صحیح کیا۔

محمودہ رونے لگی۔ باہر سے بھائی آواز سن کر دوڑا۔ اس کو روتا دیکھ کر گود میں اٹھا لیا اور پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

محمودہ نے روتے روتے کہا۔ "بھابی جان نے مارا۔"

مزاج دار بہو نے کہا۔ "دیکھو جھوٹی نامراد آپ تو دوڑتے میں گری اور میرا نام لگاتی ہے۔"

محمد عاقل کو غصہ تو آیا لیکن مصلحت وقت سمجھ کر ضبط کیا، محمودہ کو پیار چمکار کر چپ کیا اور بی بی سے کہا "خیر اٹھو، نہاؤ، کپڑے بدلو، دن زیادہ چڑھ گیا۔ میں عید گاہ جاتا ہوں۔"

مزاج دار بہو نے ناک بھوں سکیڑ کر کہا "میں تو ایسے سویرے نہیں نہاتی۔ ٹھنڈ کا وقت ہے۔ تم اپنے عید گاہ جاؤ۔ میں نے کیا منع کیا ہے۔"

محمد عاقل کو ایسی روکھی بات سن کر بہت رنج ہوا اور مزاج دار سدا کی ایسی کم بخت تھی کہ ہمیشہ اپنے میاں کو ناخوش رکھتی تھی۔ اتنے میں محمد عاقل کو ماں نے پکارا کہ بیٹا جاؤ بازار سے دودھ لا دو تو خیر سے عید گاہ کو سدھارو۔

محمد عاقل نے کہا۔ "بہت خوب، پیسے دیجیے میں دودھ لائے دیتا ہوں لیکن اگر میرے واپس آنے تک انھوں نے کپڑے نہ بدلے تو سب کپڑے چولھے میں رکھ دوں گا۔"

محمد عاقل تو دودھ لینے بازار گیا۔ ماں کو معلوم تھا کہ لڑکے کا مزاج بہت برہم ہے اور

طبیعت بھی اس کی اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اول تو اس کو غصہ نہیں آتا اور جو کبھی آجاتا ہے تو عقل اس کی ٹھکانے نہیں رہتی۔ ایسا نہ ہو سچ مچ نئے کپڑے جلا دے۔ جلدی سے بہو کے پاس گئیں اور کہا۔ "بیٹی! خدا کے لیے برس کے برس دن تو بدشگونی مت کرو۔ اٹھو۔ نہاؤ۔ کپڑے بدلو۔"

مزاج دار بہو نے کہا۔ "نہیں بی' میں تو اس وقت نہیں نہاتی۔ ٹھہر کر نہالوں گی۔"

بارے ساس نے منت سماجت کر کے بہو کو نہلا دھلا کر کنگھی چوٹی کر' کپڑے پہنا' محمد عاقل کے آنے سے پہلے دلہن بنا کر بٹھا دیا۔ محمد عاقل یہ دیکھ کر خوش ہوا۔ عیدہ گاہ چلتے ہوئے محمودہ سے پوچھا "کھوبی تمہارے واسطے بازار سے کون سا کھلونا لائیں۔"

محمودہ نے کہا۔ "اچھی خوبصورت سی رحل لا دینا۔ اس پر ہم اپنا سیپارہ رکھیں گے اور قلم دوات رکھنے کے لیے ایک ننھی سی صندوقچی۔"

مزاج دار خود بخود بولی "اور ہمارے لیے؟"

محمد عاقل نے کہا "جو تم فرمائش کرو۔ لیتا آؤں۔"

مزاج دار نے کہا۔ "بھٹے اور سنگھاڑے اور جھڑ بیری کے بیر اور مٹر کی پھلیاں اور بہت سی نارنگیاں' ایک ڈفلی' ایک خنجری۔"

یہ سن کر محمد عاقل ہنسنے لگا اور کہا۔ "ڈفلی اور خنجری کیا کرو گی؟"

مزاج دار احمق نے جواب دیا۔ "بجائیں گے اور کیا کریں گے؟"

محمد عاقل سمجھا کہ ابھی تک اس بیوقوف میں بے تمیز بچوں کی طرح کھانے اور کھیلنے کے پست خیالات موجود ہیں۔ کپڑے بدلنے سے جو خوشی محمد عاقل کو ہوئی تھی وہ سب خاک میں مل گئی اور اسی افسردہ دلی کی حالت میں عید گاہ چلا گیا۔

اس کا جانا تھا کہ مزاج دار نے ایک اور نئی بات کی۔ ساس سے کہا۔ "ہم کو ڈولی منگا دو ہم اپنی ماں کے گھر جائیں گے۔"

ساس نے کہا۔ "بھلا جانے کا یہ کیا موقع ہے؟ چار مہینے بعد تو تم ماں کے گھر سے اب آٹھ دن ہوئے کہ آئی ہو۔ عین عید کے دن جانا بالکل نامناسب ہے۔"

مزاج دار نے کہا۔ "آج میرا جی بہت گھبراتا ہے' دل الٹا چلا آتا ہے' مجھ کو اپنے میکے

کی سہیلی، باسو منہیار[1] کی بیٹی بنو بہت یاد آتی ہے۔"

ساس نے کہا۔ "بیٹی! نوج کسی کو کسی سے ایسا عشق ہو جیسا تم کو بنو کا ہے؟ اگر ایسا ہی دل چاہتا ہے تو اسی کو بلا بھیجو۔"

مزاج دار نے کہا۔ "واہ بڑی بے چاری بلانے والی۔ ایسا ہی بلانا تھا تو کل بلوا کر چوڑیاں پہنوائی ہوتیں۔"

ساس نے کہا۔ "بھلا بیٹی مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یکایک تم کو اس کی یاد گدگدائے گی۔"

مزاج دار نے کہا۔ "خیر بی، اس بحث سے کیا فائدہ؟ ڈولی منگوانی ہے تو منگوا دو، نہیں تو میں بوا سلمتی کے ابا سے منگوا بھیجوں۔"

ساس نے کہا۔ "لڑکی کوئی تیری عقل ماری گئی ہے؟ میاں سے پوچھا نہیں، گچھا نہیں آپ ہی آپ چلیں اور مجھ کو تو اپنا بڈھا چونڈا نہیں منڈوانا ہے جو لڑکے کی بے اجازت ڈولی منگوا دوں۔"

مزاج دار بولی۔ "کیسے میاں اور کیسا پوچھنا۔ اب کوئی اپنے ماں باپ سے عید بقرعید کو بھی نہ ملا کرے؟"

اتنا کہ کر، مولن کنجڑن[2] سے ڈولی منگوا یہ جاوہ جا۔

تھوڑی دیر بعد محمد عاقل عید گاہ سے لوٹا۔ گھر میں گھستے ہی پکارا "لو بی! اپنی خنجری اور ڈفلی لو بجاؤ۔" دیکھا تو سب چپ ہیں۔

ماں سے پوچھا۔ "کیا ہوا خیر تو ہے؟"

محمودہ نے کہا۔ "بھابی جان تو چلی گئیں۔"

محمد عاقل نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آئیں! کیونکر گئیں؟ کہاں گئیں؟ کیوں جانے دیا؟"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹھے بٹھائے یکایک کہنے لگیں۔ میں تو اپنی ماں کے یہاں جاؤں گی میں نے ہرچند منع کیا۔ ایک نہ مانی۔ مولن سے ڈولی منگوا کر چلی گئیں۔ میں روکتی کی روکتی رہ گئی۔"

۱۔ چوڑی گر۔
۲۔ سبزی فروش کی بیوی۔

محمد عاقل یہ سن کر غصے کے مارے تھرا اٹھا اور چاہا کہ سسرال جاکر ابھی اس نابکار عورت کو سزا دے۔ یہ سوچ کر باہر کو چلا۔ ماں سمجھ گئی۔ جاتے کو ماں نے پکارا۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

ماں نے کہا۔ ”شاباش بیٹا شاباش ! میں تم کو پکار رہی ہوں' اور تم سنتے ہو' جواب نہیں دیتے۔ تیرھویں صدی میں ماؤں کا یہی وقر رہ گیا ہے ؟“

یہ سنتے ہی محمد عاقل الٹے پاؤں پھرا۔

ماں نے کہا۔ ”بیٹا ! تو یہ بتا کہ اس دھوپ میں کہاں جاتا ہے ؟ ابھی عید گاہ سے آیا ہے۔ اب پھر باہر چلا۔ اماں صدقے گئی' جی ماندہ ہو جائے گا۔“

محمد عاقل نے کہا۔ ”بی ! میں کہیں نہیں جاتا۔ مسجد میں حافظ جی سے ملنے جاتا ہوں۔“

ماں نے کہا۔ ”اے لڑکے ہوش میں آ۔ میں نے دھوپ میں اپنا چونڈا نہیں سفید کیا ہے۔ لو صاحب' ہمیں سے باتیں بنانے چلا ہے۔ حافظ جی کے پاس جاتا ہے تو انگرکھا اور دوپٹا اتار کر رکھ جا اور شوق سے مسجد میں بیٹھ۔“

یہ سن کر محمد عاقل مسکرانے لگا۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا اور اس کے سر کی طرف دیکھ کر بولی کہ عید گاہ کے آنے جانے میں تمھارے بال تمام گرد آلود ہو گئے ہیں۔ ذرا تکیے پر لیٹ جاؤ تو میں صاف کر دوں۔

محمد عاقل ماں کے کہنے سے ذرا لیٹ گیا۔ محمودہ بھائی کو لیٹا دیکھ کر پنکھا جھلنے لگی۔ کچھ تو عیدہ گاہ کے آنے جانے کی تکان ادھر کی ٹھنڈی ہوا اور ماں نے جو دست شفقت سر پر پھیرا سب سے زیادہ اس کی راحت ہوئی۔ غرض محمد عاقل سو گیا۔ جاگا تو دن ڈھل چکا تھا اور وہ غصہ بھی دھیما ہو گیا تھا۔

ماں نے کہا۔ ”لو' ہاتھ منہ دھوؤ وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھو۔ وقت تنگ ہے' پھر آؤ تو تم کو کام بتائیں۔“

نماز پڑھ پڑھا کر محمد عاقل آیا تو ماں نے کہا۔ ”لو' اب سسرال جاؤ اور تجھے میری ہی جان کی قسم ہے جو تو وہاں کچھ لڑا یا بولا۔“

محمد عاقل نے کہا۔ ”تو مجھ کو مت بھیجو۔“

ماں نے کہا۔ "لڑکے خیر منا! الٰہی کیسی بری زبان ہے۔ سسرال تو تیری' اور بھیجوں کس کو؟ لو یہ ایک روپیہ تو اپنی سالی اصغری کے ہاتھ میں عیدی کا دینا اور یہ ایک اٹھنی اپنی خلیا ساس کے بیٹے میاں مسلم کو اور آدھے کھلونے بھی لیتے جاؤ۔ ایک خوان میں سویاں اور دودھ اور مٹھائی کی ٹوکری بھی ماما عظمت کے ہاتھ اپنے ساتھ لوائے جاؤ۔ دیکھو خبردار کچھ بولنا چالنا مت۔"

محمد عاقل نے کہا۔ "اور اماں خنجری اور ڈفلی بھی لیتا جاؤں؟"

ماں نے کہا۔ "بس کہیں ایسی بات وہاں مت بول اٹھنا۔"

غرض محمد عاقل ساس کے گھر پہنچے۔ گھر میں اکبری خانم اپنی سہیلیوں کے ساتھ ادھم مچا رہی تھی اور باہر گلی میں تمام غل کی آواز چلی آتی تھی۔ ماما عظمت اندر گئی۔ اصغری نے ماما کو دور سے دیکھ کر دبی آواز سے کہا: "اے بی آپا! اے بی آپا! چپ کرو تمہاری سسرال سے ماما آئی ہے۔"

عظمت نے اندر پہنچ کر محمد عاقل کو بلایا۔ "صاحب زادے آئیے۔"

غرض محمد عاقل اندر گئے۔ ساس کو سلام کیا۔

انھوں نے کہا۔ "جیتے رہو۔ عمردراز۔"

اتنے میں اصغری بھی اپنی اوڑھنی سنبھال سنبھول کوٹھری سے نکلی اور نہایت ادب سے جھک کر بہنوئی کو سلام کیا۔ اصغری اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر نہایت سلیقے کے ساتھ اجلا دستر خوان بہنوئی کے آگے لا بچھایا اور ایک رکابی میں سویاں' ایک پیالے میں دودھ 'تشتری میں قند اور ایک چمچہ لاکر سامنے رکھ دیا۔

ساس نے کہا۔ "بیٹا! کھاؤ۔"

محمد عاقل نے عذر کیا کہ مجھ کو عید گاہ میں زیادہ دیر ہو گئی تھی ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں نے کھانا کھایا ہے۔

ساس نے کہا۔ "کیا مضائقہ ہے۔ سویاں تو پانی ہوتی ہیں۔ کھاؤ بھی۔"

جب تک محمد عاقل سویاں کھاتا رہا اصغری الائچی ڈال ایک مزیدار پان بنا لائی۔ کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد محمد عاقل نے کہا۔ "جناب میں رخصت ہوتا ہوں۔"

ساس نے کہا "اب کہاں جاؤ گے۔ یہیں سو رہنا۔"

محمد عاقل نے کہا۔ "آج عید کا دن ہے۔ آئے گئے سے ملنا ہے۔ دوسرے کہیں کچھ بھیجنا بھجوانا۔ اور میں اماں سے رات کے واسطے کہ کر بھی نہیں آیا۔"

ساس نے کہا "ملنے ملانے کا تو اب وقت نہیں رہا۔ شام ہونے آئی اور بھیجنے بھجوانے کو سمدھن کافی ہیں" اور ہنس کر یہ بھی کہا "تم کچھ سمدھن کا دودھ نہیں پیتے۔ آخر عظمت جائے گی۔ خبر کر دے گی۔"

غرض محمد عاقل نے بہت کچھ حیلے کیے۔ ساس نے ایک نہ مانی اور محمد عاقل کو زبردستی رہنا پڑا۔ چار گھڑی رات گئے جب کھانے پینے سے فراغت ہوئی تو اصغری نے برتن بھانڈا گری پڑی چیز سب قرینے سے رکھی۔ باہر کے دروازے کی زنجیر بند کی۔ کوٹھریوں کو قفل لگا کر کنجیاں ماں کے حوالے کیں۔ باہر کے دالان اور باورچی خانے کا چراغ گل کیا اور ماں اور آپا اور بہنوئی سب کو پان بنا کر دیے اور فراغت سے جا کر سو رہی۔

اب ساس نے محمد عاقل سے کہا۔ "کیوں بیٹا؟ تم میاں بی بی میں یہ کیا آئے دن لڑائی رہا کرتی ہے؟ اکبری کی تو ایسی بری عادت ہے۔ کبھی بھول کر بھی سسرال کی بات مجھ سے نہیں کہتی۔ دنیا جہان کی بیٹیوں کا دستور ہوتا ہے کہ سسرال کی ذرا ذرا بات ماؤں سے لگایا کرتی ہیں۔ نہیں معلوم اس کو کیا خدا کی سنوار ہے[1]۔ بہتیرا پوچھ پوچھ کر اپنا منہ تھکاؤ حاشا کہ یہ کچھ بھی بتائے۔ لیکن محلے کی بات کانوں کان پہنچ ہی جاتی ہے۔ اوپری لوگوں سے میں بھی گھر بیٹھی بیٹھی سنا کرتی ہوں۔"

محمد عاقل نے ساس سے یہ بات سن کر تھوڑی دیر تامل کیا اور لحاظ کے سبب جواب منہ سے نہیں نکلتا تھا۔ مگر اس نے خیال کیا مدت کے بعد ایسا اتفاق ہوا ہے اور خود انھوں نے چھیڑ کر پوچھا ہے، ایسے موقع پر سکوت کرنا سراسر خلاف مصلحت ہے۔ بہتر ہے کہ عمر بھر کا زہر اگل ڈالیے۔ شاید آج کی گفتگو میں آئندہ کے واسطے کوئی بات نکل آئے۔

غرض محمد عاقل نے شرماتے شرماتے کہا "آپ کی صاحبزادی موجود ہیں۔ انھیں سے پوچھیے کہ ہمارے یہاں ان کو کیا تکلیف پہنچی۔ خاطر داری و مدارات میں کسی طرح کی کمی ہوئی یا ان سے کوئی لڑا یا کسی نے ان کو برا کہا؟ آپ کو معلوم ہے گھر میں ہم گنتی کے آدمی ہیں۔ والدہ صاحبہ

---

[1] محاورہ۔ خدا کی مار کی دعائیہ صورت۔

سے تو تمام محلہ واقف ہے۔ ایسی صلح کل ہیں کہ تمام عمران کو کسی سے لڑنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر کوئی ان کو دس باتیں سخت بھی سنا جائے تو چپ ہو جاتی ہیں۔ محمد کامل دن بھر لکھنے پڑھنے میں لگا رہتا ہے۔ صبح کا نکلا رات کو گھر آتا ہے۔ کھانا کھایا اور سو رہا۔ میں نے اس کو ان سے کبھی بات کرتے بھی نہیں دیکھا۔ محمودہ ان کی صورت سے ڈرتی ہے' رہا میں سو موجود بیٹھا ہوں جو شکایت مجھ سے ہو بے تکلف بیان کریں۔"

محمد عاقل کی ساس اب بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر بولیں "ہاں بھائی! جو کچھ تمھارے دل میں ہو تم بھی صاف صاف کہہ گزرو۔ بات کا دل میں رہنا کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ دل میں رکھنے سے رنج بڑھتا ہے۔ اور فساد زیادہ ہوتا ہے۔"

اکبری اگرچہ جھوٹ بولنے پر بہت دلیر تھی لیکن اس وقت محمد عاقل کے روبرو کوئی بات کہتے نہ بن پڑی اور جی ہی جی میں ڈر رہی تھی کہ میں نے بہت سی جھوٹ باتیں ماں سے آکر لگائی ہیں ایسا نہ ہو کہیں اس وقت قلعی کھل جائے یہ سوچ سمجھ کر اس نے اس بات ہی کو ٹال دیا اور کہا تو یہ کہا کہ "ہم تو الگ گھر کریں گے۔"

اکبری کی ماں نے داماد سے کہا۔ "کیوں بھائی تم کو الگ ہو کر رہنے میں کیا عذر ہے؟ خدا کا فضل ہے خود نوکر ہو' خود کماتے ہو کسی بات میں ماں باپ کے محتاج نہیں' اپنا کھانا' اپنا پینا' پھر دوسرے کا دست نگر ہو کر رہنا کیا فائدہ؟ بیٹا بہو کیسے ہی پیارے ہوں پھر بھی جو آرام الگ رہنے میں ہے' ماں باپ کے گھر کہاں' جو چاہا کھایا اور جو چاہا سو پکایا اور ذرا غور کرنے کی بات ہے' ماں باپ کے ساتھ رہ کر لاکھ کماؤ پھر بھی نام نہیں۔ لوگ کیا جانیں تم اپنا کھاتے ہو یا ماں باپ کے سر پڑے ہو۔"

محمد عاقل نے کہا۔ "آرام کی جو پوچھیے تو ہم کو جو اب حاصل ہے الگ ہوئے پیچھے اس کی قدر معلوم ہو گی۔ دونوں وقت روٹی پکائی کھائی اور بے فکر ہو کر بیٹھ رہے۔ الگ ہونے پر آٹا' دال' گوشت' ترکاری' لکڑی سب کا فکر کرنا پڑے گا۔ اور آپ ہی انصاف فرمایئے کہ خانہ داری میں کتنے بکھیڑے ہیں۔ بے سبب ان سب آفتوں کو اپنے سر لینا میرے نزدیک تو عقل کی بات نہیں۔ رہی یہ بات کہ جو چاہا سو کھایا اور جو چاہا سو پکایا' اب بھی حاصل ہے۔ انھیں سے پوچھیے کبھی کوئی فرمائش کی ہے جس کی تعمیل نہ ہوئی ہو۔ بڑے کنبوں میں البتہ اس طرح کی تکلیف ہوا کرتی ہے' ایک کا دل میٹھے چاولوں کو چاہتا ہے دوسرے کو بھنی مونگ کی کھچڑی چاہیے۔ تیسرے کو پلاؤ درکار ہے۔ چوتھے کو قورمہ کھانا منظور ہے۔ پانچویں کو پرہیزی کھانا حکیم نے بتایا ہے۔ دس کے

واسطے دس ہنڈیاں ' روز کے روز کہاں سے آئیں۔ ہمارے ہاں کنبہ کون بہت بڑا ہے۔ فرمائش کریں تو ہم اور نہ کریں تو ہم اس کو بھی جانے دیجیے اگر ان کو ایسا ہی لحاظ ہے تو آپ کھانے کا اہتمام کیا کریں۔ خود والدہ کئی مرتبہ کہ چکی ہیں انھیں سے پوچھیے کہا ہے یا نہیں ! اور نام کو جو آپ نے فرمایا یہ بھی میرے نزدیک عقل کی بات نہیں اپنے آرام سے کام ہے۔ لوگ اپنے دلوں میں جو چاہیں سو سمجھیں اور فرض کیجیے لوگوں نے یہی جانا کہ ہم ماں باپ کے سر پڑے ہیں تو اس میں ہماری کیا بے عزتی ہے ؟ ماں باپ ہیں کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ ماں باپ نے ہم کو پالا پرورش کیا' کھلایا' پہنایا' پڑھایا' لکھایا' شادی بیاہ کیا۔ ان سب باتوں میں بے عزتی نہیں ہوئی تو اب کون سا سرخاب کا پر ہم میں لگ گیا ہے کہ ان کا دست نگر ہونا ہماری بے عزتی کا موجب سمجھا جائے ؟"

ساس نے جواب دیا۔ "اگر سب لوگ تمھاری طرح سمجھا کریں تو کیوں الگ ہوں۔ دنیا کا دستور ہے اور ہوتی چلی آئی ہے اور ہوتی چلی جائے گی کہ بیٹے ماں باپوں سے جدا ہو جاتے ہیں اور میں تو جانتی ہوں کہ دنیا میں کوئی بہو ایسی نہ ہو گی جس کا میاں کماؤ ہو اور وہ ساس نندوں میں رہنا پسند کرے۔"

محمد عاقل نے کہا "یہ آپ کا فرمانا درست ہے اگر بیٹے ماں سے جدا نہ ہوا کرتے تو شہر میں اتنے گھر کہاں سے آتے لیکن ہر ایک کی حالت جدا ہے۔ الگ ہو کر رہنا میری حالت کے لیے ہرگز مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دس روپیہ کا تو میں نوکر ' اتنی آمدنی میں الگ گھر سنبھالنا نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ اور پھر اس نوکری کا بھی اعتبار نہیں۔ خدانخواستہ الگ ہوئے پیچھے اگر نوکری جاتی رہی تو پھر باپ کے گھر آنا مجھ پر نہایت شاق ہو گا۔ اس وقت البتہ بے عزتی ہو گی کہ میاں الگ تو ہو گئے تھے پھر جھک مار کر باپ کے ٹکڑوں پر آ پڑے۔ لوگوں کی ریس اس معاملے میں ٹھیک نہیں۔ اپنے حال پر خود غور کرنا چاہیے وہ نقل آپ نے سنی ہے کہ :

"ایک شخص نے بازار سے نمک اور روئی مول لی۔ نمک تو خچر پر لادا اور روئی گدھے پر۔ چلتے چلتے راہ میں ایک ندی واقع ہوئی۔ ندی پایاب تھی۔ اس شخص نے خچر اور گدھے کو لدا لدایا پانی میں اتار دیا۔ بیچ ندی میں پہنچ کر خچر نے غوطہ لگایا۔ تھوڑی دیر بعد سر ابھارا تو گدھے نے پوچھا کیوں یار خچر؟ یہ تم نے کیا کیا؟

"خچر نے جواب دیا۔ کہ بھائی تم بڑے خوش قسمت ہو۔ تم پر روئی لدی ہے اس کا بوجھ تو بہت ہلکا ہوتا ہے۔ مجھ کمبخت پر نمک ہے۔ بوجھ کے مارے میری کمر کٹ کر لہولہان ہو گئی ہے۔ یہ

ہمارا مالک ایسا بے رحم ہے کہ اس کو مطلق ہماری تکلیف کا خیال نہیں۔ الاپ شناپ جتنا چاہتا ہے لاد دیتا ہے۔ میں نے سمجھا کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے کمر ندارد ہے۔ آؤ غوطہ لگاؤ نمک پانی میں بھیگ کر کچھ تو گھل جائے گا۔ جس قدر ہلکے ہوئے غنیمت۔ مالک بہت کرے گا چھے سات ڈنڈے اور مار لے گا۔ سو یوں بھی راہ بھر ڈنڈے کھاتا آیا ہوں۔ دیکھو اب میرا بوجھ آدھا رہ گیا ہے۔

گدھے بے وقوف نے بھی خچر کی ریس کر کے غوطہ لگایا۔ روئی بھیگ کر اور وزنی ہو گئی۔ سر ابھارا تو ہلا نہ جاتا تھا۔

خچر ہنسا اور کہا۔ کیوں بھائی گدھے کیا حال ہے؟

گدھے نے کہا۔ یار میں تو مرا جاتا ہوں۔

خچر نے کہا۔ اے بے وقوف! تو نے میری ریس کی لیکن اتنا تو سمجھ لینا تھا کہ تیری پیٹھ پر روئی، ہے 'نمک نہیں ہے۔

اماں جان ایسا نہ ہو لوگوں کی ریس کرنے سے میرا حال بھی اس گدھے کا سا ہو۔

(مرآۃ العروس)

سوالات

۱۔ نذیر احمد کی ناول نگاری پر نوٹ لکھیے۔

۲۔ داستان اور ناول کا فرق واضح کرتے ہوئے بتائیے کہ زیر نظر اقتباس گزشتہ دونوں اقتباسات سے جو داستانوں سے لیے گئے ہیں کس طرح مختلف ہے؟

۳۔ نذیر احمد کردار نگاری میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اکبری کے کردار کی نمایاں خصوصیات کے پیش نظر بحث کیجیے۔

۴۔ محمد عاقل کے کردار پر نوٹ لکھیے۔

———— ○○○ ————

سیّد غلام الثقلین نقوی

(ولادت : ۱۹۲۳ء)

غلام الثقلین نقوی آزاد کشمیر میں چوکی پنڈن کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مدرس تھے۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں سیالکوٹ اور دیپال پور میں حاصل کی، مرے کالج سیالکوٹ سے بی۔ اے اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ٹی کرنے کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب میں استاد مقرر ہوئے۔ دوران ملازمت ایم اے کیا اور گورنمنٹ کالج جھنگ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے اور بقیہ ملازمت یہیں مکمل کی۔

غلام الثقلین نقوی کی اہم تصانیف میں افسانوں کے مجموعے "بند گلی"، "شفق کے سائے"، "نغمہ اور آگ" اور "لمحے کی دیوار" ہیں۔ ان کا ناول "میرا گاؤں" پنجاب کے دیہات کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور اسے اردو ناول نگاری میں اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی کی اہم خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ انھوں نے پنجاب کے دیہات اور ان میں بسنے والے لوگوں کی زندگیوں کو بڑے خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے۔ وطن کی محبت، پاکستان سے گہری وابستگی اور عوام الناس کی زندگی سے ہمدردی ان کی تحریروں میں حرارت کی طرح گردش کرتی ہے۔ ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے جو حقیقت نگاری، کردار کشی اور واقعات کو پیش کرنے میں ان کی معاون ہے۔ ان کے مکالمے کرداروں کی نفسیات اور ماحول سے خاص مطابقت رکھتے ہیں۔ زیر نظر اقتباس ان کے ناول "میرا گاؤں" سے لیا گیا ہے جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں پنجاب کے سرحدی گاؤں کے لوگوں کے ردعمل اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

معرکۂ ستمبر ۱۹۶۵ء

یہ برسات کے موسم کی ایک رات تھی:

لیکن اس رات میں برسات کی خنکی نہیں تھی، نہ وہ حبس تھا جو ہوا کے سانسوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے کیونکہ پندرہ بیس دنوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں پڑا تھا اور یہ رات اوس کی نمی سے بھی محروم تھی اور فضا میں گرد سی چھائی تھی ..... ایک مہین سی دھول ..... اس دھول میں ایک خطرے کا سایہ بھی منڈلا رہا تھا ..... دور چھمب جوڑیاں میں توپیں گرج رہی تھیں ..... ان بجلیوں کی طرح جو امڈتے بادلوں میں مسلسل گھن گرج بن جاتی ہے ..... ایک گڑگڑاہٹ جس سے کڑک کی وہ آواز نہیں آتی جو زمین کو دہلا دیتی ہے اور کانوں کو بہرا کر دیتی ہے۔

چھمب جوڑیاں کا علاقہ ہم سے بیس پچیس میل دور تھا اور جنگ کے میدان اور

ہمارے درمیان چناب کی بپھری ہوئی موجیں حائل تھیں۔ ہم خطرے سے دور تھے لیکن مسلسل گڑگڑاہٹ ورمے کی طرح ہمارے سکون کو چھیدتی چلی جارہی تھی جیسے کوئی سیلاب اُمڈ کر آرہا ہو اور وہ دھیرے دھیرے ہمیں اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہو۔ جب سورج نکلتا اور زندگی جاگتی تو گڑگڑاہٹ کا شور اس کے نیچے دب کر رات کا بھیانک خواب بن جاتا۔ وہ خواب جو بھوت کی طرح چمٹ جاتا ہے اور سائے کی طرح ساتھ لگا رہتا ہے۔ دن کو ہم ریڈیو سنتے رہتے اور بھا[1] اسلم جب کبھی شہر سے ہو کر آتا تو وہ اخبار کے ساتھ ڈھیروں خبریں بھی لے کر آتا۔ ان خبروں کو سن کر ہم آنے والے خطرے کو بھول جانے کی کوشش کرتے۔

اس رات سے تین چار دن پہلے ہم نے پہلی بار ہوائی جہازوں کو گاؤں کے اوپر سے اڑتے دیکھا تھا۔ اتنی گڑگڑاہٹ کہ کلیجا منہ کو آگیا۔ یہ جہاز جھمب جوڑیاں جا کر بم گراتے اور دور جہاں زمین اور آسمان کے کنارے ملتے ہیں' درختوں کی پھننگوں[2] کو چھو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ہم اس نظارے سے مانوس ہو گئے تو ہم صبح کا اجالا پھیلتے ہی آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے اور ہوائی جہازوں کا اڑنا ہمارے لیے ایک تماشا بن گیا۔ ہم نے اس رات سے دو دن پہلے دشمن کے ایک ڈولتے ہوئے جہاز کو آگ لگتے اور دور کہیں دھوئیں کا مرغولہ بن کر زمین کی طرف گرتے دیکھا اور ہم نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور اس سے اگلے دن ہم نے ریڈیو پر سنا کہ دشمن نے چپکے چوری لاہور پر حملہ کر دیا ہے اور ہماری فوجوں نے حملے کو روک لیا ہے تو ہمیں کسی خطرے کا احساس نہ ہوا کیونکہ ہم محاذ سے دور تھے۔

پر اس رات جنگ نے ہمیں اچانک چپکے سے آلیا!

جب مسجد سے اذان کی آواز آئی' تو جموں کی سرحد سے آنے والے لوگوں کا پہلا قافلہ ہمارے گاؤں میں پہنچا۔ انکے سروں پر گٹھڑیاں تھیں اور وہ اپنے ڈھور ڈنگروں کو ہانک لائے تھے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے ہمارے گاؤں سے پکی سڑک تک ایک تانتا سا بندھ گیا۔ لوگ جن کے چہروں پر ڈر کی دھول تھی' کہتے "بھاگ جاؤ —— گاؤں سے نکل جاؤ —— دشمن کی فوجیں اب زیادہ دور نہیں۔"

ہم نے پوچھا "سرحد کے ساتھ جو ہمارے گاؤں تھے' ان کا کیا حال ہوا؟"

۱۔ بھائی۔
۲۔ شاخوں کے آخری سرے، جو نرم پتیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

"ہمیں کچھ پتہ نہیں۔"

جس آدمی سے بھی ہم نے بات کی' وہ چلتے چلتے ایک لمحے کو بھی نہ رکا جیسے انھیں کوئی پیچھے سے دھکیل رہا ہو۔ اس افراتفری میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں تھا۔ یوں لگتا جیسے قیامت آچکی ہو اور ہر آدمی پر نفسانفسی طاری ہو۔ یکایک گل بہار کی طرف سے توپ کی پہلی آواز آئی۔ نجانے گولا کہاں گرا پر ہم چک مراد کے لوگ اس آواز سے چونک اٹھے' جو لوگ کنوؤں اور ٹیوب ویلوں پر تھے' وہ دوڑتے ہوئے گاؤں میں آئے' جو گاؤں میں تھے وہ چولھوں کی آگ نہ بجھا سکے اور دروازوں کو تالے بھی نہ لگا سکے۔ ہم نے تھوڑا بہت سامان گٹھڑیوں میں باندھا اور ہمیں اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ اپنے مکانوں اور دیواروں اور دروازوں پر ایک حسرت بھری نگاہ بھی ڈال لیتے کیونکہ ایک گولا گاؤں کے شمالی حصے کے ایک مکان پر گرا اور گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بچے چیخنے لگے اور عورتیں رونے لگیں۔ جوہڑ کے کنارے میرا باپ بھی ہم سے آملا۔ اس نے کہا "ماہنے! تم عورتوں اور بچوں کو لے کر نکل جاؤ۔ میں اور عبدالغفار مویشی ہانک کر لائیں گے۔ کہیں نہ کہیں ہم تمہارے ساتھ مل جائیں گے۔" اس اثناء میں بھا اسلم اور عائشہ بھی گھر سے نکل آئے۔ میں نے سر پر ایک بڑا سا گٹھڑ رکھا اور زینت کا سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا لیا۔ زینت نے بچے کو اٹھا لیا۔ بھا اسلم نے سائیکل پر کچھ سامان باندھ لیا تھا۔ میری ماں کے سر پر بھی ایک گٹھڑی تھی۔

ہم پکی سڑک پر پہنچے تو ہم نے گاؤں کی طرف سے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنی۔ کچھ گولے ہم سے ذرا پیچھے گر کر پھٹے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم پوری طرح سے جنگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ میں نے اپنے بھٹے کے قریب کھڑے ہو کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دور دور تک دھان کے کھیت لہرا رہے تھے اور ان پر صبح کی دھوپ نے ایک چادر سی تان دی تھی اور ہوا بند تھی اور گاؤں کے کچے پکے مکان دھوپ میں چمک رہے تھے۔ یہ کتنا پر سکون منظر تھا: پر یہ منظر مجھے ایک دھوکا معلوم ہوا۔ میں نے سوچا' یہ تو کوئی جادو کا تماشا ہے۔ یہ کھیت ..... یہ دکان ..... یہ سڑک ..... اس گاؤں نے ابھی ابھی رات کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور ابھی دھوپ کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔"

"ماہنے کیا سوچ رہے ہو؟" بھا نے پوچھا۔

میں چونک گیا۔ یکایک بادل کے ایک ٹکڑے نے سورج کا چہرہ ڈھانپ دیا اور دھوپ کجلا سی گئی اور یکایک برسات کی وہ کالی رات میری آنکھوں کے سامنے چھا گئی' جب بھا نے ہمارے گاؤں میں پناہ لی تھی۔ میں نے کہا "بھا! میں سوچ رہا تھا' چک مراد دھوپ کے سمندر میں ڈوب گیا تو کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میرا دل کہ رہا ہے، ہم جلد گاؤں لوٹ آئیں گے۔"

"جب تم آج سے اٹھارہ سال پہلے اپنے گاؤں سے نکلے تھے، تو تم نے بھی اپنے گاؤں کو دھوپ کے سمندر میں ......"

"نہیں ماہنے! دھوپ کے سمندر میں نہیں، خون کے سمندر میں ڈوبتے دیکھا تھا۔" بھا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

میری ماں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماہنے! چلو ......"

ہم نے گاؤں کی طرف سے منہ موڑ لیا اور شہر کا رخ کر لیا۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے درخت تھے اور سڑک پر ان کا سایا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کسی قلعے کی خفیہ سرنگ میں سے گزر رہے ہوں۔ اس سڑک پر ہم نے اتنا بڑا ہجوم کبھی نہ دیکھا تھا۔ اردگرد کے دیہات نے اپنی ساری آبادی کو اگل دیا تھا۔ اکثر لوگ پیدل تھے۔ کچھ لوگ چھکڑوں، رہڑوں اور یکوں پر سوار تھے۔ سید پور کی طرف سے آنے والی ایک دو لاریوں نے ہارن بجا بجا کر اپنا رستہ بنایا۔ وہ رینگ رینگ کر چل رہی تھیں اور سواریاں چھت پر بھی بیٹھی تھیں۔ اتنے بڑے ہجوم میں مجھے ایک عجیب کیفیت محسوس ہوئی جیسے مرا دکھ سب میں بٹ گیا ہو اور اس میں سے جو دکھ میرے حصے میں آیا ہو وہ اتنا تھوڑا ہو کہ اسے محسوس بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔

میری ماں نے پوچھا "ماہنے! تیرا باپ کہیں نظر نہیں آ رہا؟"

"فکر نہ کرو ماں۔ وہ اور عبدالغفار مویشیوں کو ہانک کر لا رہے ہیں کہیں نہ کہیں ہم سے ملیں گے۔"

ابھی ہم سیالکوٹ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھے کہ سڑک پر ایک جیپ نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ایک جوان نے جیپ سے اتر کر کہا "دیکھو! پکی سڑک چھوڑ دو اور کھیتوں میں سے ہو کر آگے بڑھو۔ خطرہ ہے کہ ابھی دشمن کا فائر آئے گا۔ جب کوئی گولہ چلے یا تمہارے سروں پر سے کوئی جہاز گزرے تو زمین پر لیٹ جاؤ۔ سڑک سے کم از کم ایک میل دور چلے جاؤ اور پھیل کر چلو ....." ہم سڑک کو چھوڑ کر کھیتوں میں چلنے لگے۔ سڑک کے اردگرد مورچے کھد رہے تھے اور جوان پوزیشن لے رہے تھے۔ یکایک توپیں گرجنے لگیں۔ ایک دم اتنے سارے گولے چلے کہ ہم بوکھلا گئے۔ مویشیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بچے چیخنے لگے۔ میری ماں نے میرا دامن تھام لیا۔ میں نے کہا "ماں! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہماری توپیں چل رہی ہیں۔"

ان کے جواب میں جب دشمن کی طرف سے کچھ گولے ہمارے پیچھے گر کر پھٹے تو مجھے یوں لگا جیسے میرا کلیجا منہ کو آگیا ہو اور میرے ماتھے پر موت نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا ہو یا کسی بھوت نے نوکیلا پنجہ میرے سینے میں گاڑ دیا ہو۔ پر خوف کے یہ لمحے بہت جلد گزر گئے۔ گولے ہم سے دور پیچھے پھٹے تھے۔ اب لوگ کھیتوں کی مینڈھوں پر بکھر گئے تھے اور سڑک پر ٹینک اور جیپیں چل رہی تھیں۔ تب جموں کی سرحد کی طرف سے ایک ہوائی جہاز زناٹے کے ساتھ آیا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے اور جہاز تڑ تڑ گولیاں برساتا ہوا سیالکوٹ چھاؤنی کی طرف اڑتا ہوا چلا گیا۔ دور درختوں کے ایک جھنڈ سے دھم کی آواز آئی اور دھوئیں کا بادل اٹھا۔ ہمارے دل دہل گئے۔ چھاؤنی کی طرف سے "ایک ایک ڈم ڈم" کی کئی آوازیں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی ہم تک پہنچیں چند لمحوں بعد وہی جہاز واپس ہمارے سروں پر سے گزرا تو اس کی دم سے کالا کالا دھواں نکل رہا تھا۔ دھوئیں کی لکیر نیلے آسماں کے نیچے دور تک چلی گئی۔ تب اس لکیر سے ایک شعلہ نکلا اور پھر ہمیں کچھ بھی نظر نہ آیا اور دھان کے کھیتوں سے لوگ یوں اٹھے جیسے برسات میں " کھمبیں" نکل آئی ہوں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگ زخمی ہو گئے ہیں اور دور درختوں کے جھنڈ میں جو توپ لگی تھی، اس نے پھر ڈم سے گولا اگلا تو ہمیں خود بخود معلوم ہو گیا کہ یہاں ہوائی جہاز نے بم کیوں گرایا تھا پر توپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

ہم پھر چلنے لگے۔ پکی سڑک سے دو تین کوس دور جا کر میں نے ماں سے پوچھا "ماں! ہم آج کی رات کہاں گزاریں گے؟"

"جہاں رات پڑ گئی، لیٹ رہیں گے۔" میری ماں کی بجائے بھا نے جواب دیا۔ "کل ہم لائلپور[1] جانے کے لیے شہر سے گاڑی پر سوار ہو جائیں گے۔"

"نہیں بھا! ابھی کوئی خطرہ نہیں۔ کیا پتہ ہمیں کل پرسوں ہی گاؤں لوٹ آنا پڑے۔"

بھا نے مسکرا کر کہا "ماں جی! عقل کی بات کرو۔ ہمارا گاؤں جنگ کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ اب خدا خیر کرے تو جنگ کے بعد گاؤں لوٹنا نصیب ہو گا۔"

"جنگ کب ختم ہو گی اسلم؟" میری ماں نے پوچھا۔

"کیا پتہ کب؟ ......" اس نے کہا۔

"ہماری فصلوں کا کیا ہو گا؟ اگلے مہینے دھان کی فصل کٹنے والی تھی۔"

1۔ فیصل آباد کا پرانا نام۔

"ہاں! جہاں جنگ ہو وہاں فصلیں اجڑ جاتی ہیں۔ انھیں ٹینک روند ڈالتے ہیں۔ کھیتوں میں گولے گرتے ہیں تو انھیں آگ لگ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ماہنے! تم اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" بھا کے لہجے میں ذرا سا غصہ تھا۔ ایک جھڑکی کا انداز .....

اس نے میری ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اماں! اللہ پر بھروسا رکھو۔ یہ سوچو کہ آج کی رات تو ہم کہیں نہ پہنچ سکیں گے۔ اگر کل بھی لائلپور جانے کا انتظام نہ ہوا تو ہم ایک دو راتیں کہاں گزار سکتے ہیں۔"

ماں نے کچھ سوچ کر کہا "یاد آیا۔ شہر سے دکھن[1] کی طرف ایک سڑک جاتی ہے ..... اس سے کچھ ادھر ہٹ کر کوٹلی نام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ماسی اللہ رکھی کا گھر ہے۔ ایک دو راتیں ان کے ہاں کیوں نہ گزار لیں۔"

"اماں! تم کبھی وہاں گئیں؟"

"ہاں! ایک بار گئی تھی جب ماسی کی بیٹی جیواں کا بیاہ ہوا تھا۔ کچی سڑک پر اتنی دھول تھی کہ یکے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ بھوت بن گئے تھے۔ جب ماہنے کے باپ نے مجھے یکے سے اتارا تو میں اسے دیکھ کر ہنس پڑی اور وہ مجھے دیکھ کر ..... اس نے کہا تھا "کوٹلی والے کیا کہیں گے؟" میں نے کہا "یہی نا کہ یہ بھوت اور بھتنی کہاں سے آ گئے ....."

ہم ہنسنے لگے تو اس نے کہا "ماہنے! تیرا باپ ابھی تک ہم سے نہیں مل سکا..... اسے تلاش کرو۔"

ہم نے سیالکوٹ چھاؤنی سے ذرا مغرب کی طرف سے نالہ پلکھو پار کیا۔ اس میں بہت کم پانی تھا۔ یہ پانی جموں کی طرف سے آ رہا تھا اور ادھر ہی سے دشمن نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ پلکھو کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہم تھک سے گئے اور ایک شیشم کے نیچے آرام کرنے کو بیٹھ گئے۔ لوگ ہمارے پاس سے گزرتے رہے۔ یہیں میرا باپ اور عبدالغفار ہم سے آ کر مل گئے۔ وہ اپنے سارے مویشیوں کو ہانک لائے تھے۔ وہ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ مویشی نالے کے کنارے کی گھاس چرنے لگے۔ میرے باپ نے کہا "ماہنے! جب پچھلی لام[2] لگی تھی تو تم چھوٹے سے تھے پر یہ

۱۔ جنوب کی سمت۔
۲۔ جنگ۔

لام ہم سے بہت دور تھی۔ ہم نے نہ کسی توپ کی آواز سنی' نہ کوئی جہاز ہمارے سروں پر سے اڑا ..... یہ لام جو اب لگی ہے ابھی اس کا ایک دن پورا نہیں ہوا' اور ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔"

"چاچا! کبھی کبھار ایسا وقت ہر قوم پر آتا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔" بھا نے کہا "شکر کرو۔ مشرقی پنجاب[1] میں جو قیامت گزری تھی' وہ تم نے نہیں دیکھی۔ اس وقت کوئی توپ ہماری حفاظت نہیں کر رہی تھی اور ہم تلواروں' چھویوں' ٹوکوں اور بندوقوں کی زد پر آکر اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے جنگل میں کھدیڑا ہوا شکار۔"

بھا کے لہجے میں غم کی کسک ابھری تو میرے باپ نے کہا "اسلم! اب تم محفوظ ہو۔ گزرے دنوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ چلو اٹھو! پینڈا[2] کھوٹا نہ کرو۔"

ہم چھاؤنی سے مغرب میں رہ کر چلتے رہے اور توپیں مسلسل گرجتی رہیں۔ چھاؤنی سے قریب کے گاؤں ابھی خالی نہیں ہوئے تھے۔ اس دن ہم کوٹلی ارائیاں نہ پہنچ سکے۔ ہم نے وہ رات کوٹلی بہرام جی سے باہر گزاری جہاں اردگرد کے دیہات کے لوگوں نے ہمارے لیے کیمپ لگا رکھا تھا۔ ہمیں وہاں کھانا بھی ملا اور مویشیوں کے لیے چارا بھی۔ اگلی صبح ہم نے کوٹلی ارائیاں کا رخ کر لیا۔ اور شہر کے تحصیل بازار اور حاجی پورہ سے گزر کر ہم اس سڑک پر پہنچے جو ڈسکے جاتی ہے۔ اس دن شہر میں امن و سکون تھا۔ بازار کھلے تھے اور شہر کی چہل پہل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شہر میں بسیں آ رہی تھیں اور باہر جا رہی تھیں۔ شہر میں سے گزرتے ہوئے خطرے کا سائرن بجا۔ لوگ چند منٹوں کے لیے دکانوں کے چھجوں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ جب سائرن نے "سب ٹھیک" کا اعلان کیا تو ہم پھر چل پڑے۔ ہم اس دوپہر کو کوٹلی ارائیاں پہنچ گئے۔ کوٹلی ارائیاں میں لوگ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے اور دور سے توپوں کی آواز آ رہی تھی۔ ٹیوب ویل پھک پھک چل رہے تھے۔ دھان کی فصلیں سرسبز و شاداب تھیں۔ کبھی کبھار ہمارے سروں پر سے کوئی ہوائی جہاز زن سے گزر جاتا تو لوگ کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگ جاتے۔ ماسی اللہ رکھی اور اس کے گھر والوں نے ہمیں خوش آمدید کہی۔ بوڑھی ماسی ہم سب پر صدقے واری جا رہی تھی۔ رات کو لوگ ہمیں ملنے کے لیے ماسی کے گھر آئے۔ آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔

"سنا ہے' اس وقت چونڈے کے اردگرد سخت لڑائی ہو رہی ہے۔" گاؤں کے ایک

1۔ اشارہ قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب میں ہونے والے مسلم کش فسادات کی طرف ہے۔

2۔ سفر۔

نوجوان نے کہا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیسے؟ اڑتی سی ایک خبر ہے۔ صبح ریڈیو پر خبر آئے گی تو اس کی تصدیق ہو جائے گی۔"

صبح تک ریڈیو سے بھی اس کا اعلان ہو گیا اور چونڈے کی طرف سے لوگ ہماری طرح گٹھڑیاں سر پر رکھے ہوئے آئے تو ان کی زبانی اس خبر کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس رات چونڈے کے کھیتوں میں دشمن کے سیکڑوں ٹینک دندناتے ہوئے آئے۔ لیکن ہماری فوج نے ان کا حملہ روک دیا۔ ان خبروں سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ بھا اور میں اگلے دن شہر گئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ چونڈے کے میدان میں ٹینکوں کی زبردست جنگ ہو رہی ہے۔ اڈے سے ہمیں پتہ چلا کہ لاریاں لائل پور جاتی بھی ہیں اور وہاں سے آتی بھی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ کوٹلی ارائیاں میں ایک دو دن اور گزار کر ہم لائل پور چلے جائیں گے۔ پر جب ماسی اللہ رکھی نے سنا تو وہ بہت ناراض ہوئی۔ اس نے کہا "موج دینا! تو نے ہمیں غیر سمجھا ہے، جو دو چار دن بھی یہاں ٹھہرنا تمھیں اچھا نہیں لگا۔"

"نہیں ماسی! یہ بات نہیں۔ لام لگی ہے۔ کیا پتہ کب ختم ہو اور کب ہمیں گاؤں لوٹنا نصیب ہو۔"

"اللہ سے خیر مانگ ..... اس کی مرضی کے آگے کون دم مار سکتا ہے پر تیرے یہاں رہنے سے ہمارا رزق تو ختم نہیں ہو گا۔"

"ماسی! لائل پور کے ضلعے میں میرے جوائی اسلم کا گاؤں ہے، وہاں ٹھیکے بٹائی پر زمین مل جائے گی۔ ہاڑی کی فصل ہاتھ سے نکل گئی تو اچھی بات نہیں ہو گی۔"

"اچھا چلے جانا پر دو چار دن اور یہاں رہ لو تو کوئی آفت تو نہیں آ جائے گی۔"

میرے باپ نے مسکرا کر ہتھیار ڈال دیے۔ کہتے ہیں انسان نئی جگہ سے مانوس ہونے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ پر کوٹلی ارائیاں میں دو چار دنوں کے بعد ہم اس کی دھرتی سے اور اس کے بسنے والے لوگوں سے پیار کرنے لگے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں کے لوگ بہت اچھے تھے اور وہاں کے ہر گھر میں محاذ کی طرف سے آنے والے لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی یا جب انسان پر کوئی سانجھی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے نزدیک آ جاتا ہے۔ یہاں سے چونڈے کا محاذ

کچھ دور نہیں تھا۔ دن رات توپیں گرجتی تھیں اور ٹینکوں کی جنگ کے متعلق عجیب و غریب خبریں ملتی تھیں تو ہمیں یوں لگتا جیسے ہم ٹینک سے ٹینک کے ٹکرانے کی آواز سن رہے ہوں تاہم کوٹلی ارائیاں کے لوگ ڈرے نہیں تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔

جب سیالکوٹ کے قلعے پر وہ بم گرا جس کی گونج ہم نے بھی سنی کیونکہ ہم شہر سے صرف پانچ چھے میل کے فاصلے پر تھے' تو ہم ایک دوسرے سے اور قریب ہو گئے۔ ہم نے موت کے سائے تلے ایک دوسرے کی ہمدردی' محبت اور اپنائیت کا وہ مزہ چکھا جو امن و امان کے دنوں میں چھوٹی چھوٹی دشمنیوں اور خود غرضیوں میں بدل جاتا ہے۔ اس سے ایک دن بعد بھا اور میں شہر گئے تو دور ہی سے تباہی کا منظر دیکھ کر ہماری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ اس دن ہم نے شہریوں کے چہروں پر ڈر کی زردی دیکھی۔ وہ لوگ جو روپے پیسے' کوٹھیوں اور کاروں کے مالک تھے' شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو سب سے پہلے انھیں لوگوں کے پاؤں اکھڑتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ حوصلہ ہار جاتے ہیں۔

ہم کوٹلی ارائیاں میں دو چار دن اور ٹھہرے۔ میں اور بھا عورتوں اور بچوں کے ساتھ بس میں بیٹھ کر لائل پور پہنچے۔ میرا باپ اور عبدالغفار پیدل چل کر لائل پور پہنچے کیونکہ مویشی ان کے ساتھ تھے۔ جب ہم بھا کے چک میں پہنچے تو اس کا چچا ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دو چار دن بعد اس نے اپنے مکان سے ایک کوٹھا ہمارے لیے الگ کر دیا اور بھا کے حصے کا غلہ ہمیں دے کر کہا "چوہدری موج دین! میں میں الگ اس لیے کر رہا ہوں کہ عورتوں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اکٹھے رہنے میں لڑائی جھگڑے کا ڈر ہے۔"

کئی دنوں بعد جب ماں اپنا چولھا گرم کر کے روٹیاں پکانے بیٹھی تو وہ بہت خوش تھی۔ عورت کو اپنا گھر بسانے میں بڑا سکھ ملتا ہے۔ نجانے میرا باپ کیوں خوش نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ رہتا اور کسی سے ہنس بول کر اس کے چہرے پر رونق بھی نہ آتی۔ میں نے ایک دن وجہ پوچھی تو اس نے کہا "ماہنے! ہم جاٹوں میں دھی بہن کے ہاں کا پانی پینا بھی طعنے مہنے کی بات ہوتی ہے اور ہم تو اب گھر سے بے گھر ہو کر جوائی کے ٹکڑوں پر آ پڑے ہیں۔"

"بابا! بھا اسلم تمھارا جوائی ہی نہیں' بیٹا بھی ہے۔ جب ہم جنگ کے بعد اپنے گاؤں میں واپس پہنچیں گے تو ساری کسر نکال دیں گے۔ ہم اپنے زیور گروی رکھ کر بھا اسلم کی دکان پھر سے چالو کریں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

میں نے جب بھا کو یہ بات بتائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے کہا۔ "ماہنے! چاچا پرانے زمانے کا آدمی ہے۔ ماں باپ کی خدمت بیٹوں پر ہی نہیں، بیٹیوں پر بھی فرض ہوتی ہے۔"

لائل پور کے اس چک کی زمین بہت زرخیز تھی۔ اسے نہری پانی لگتا تھا۔ یہاں کنویں نہیں تھے۔ ابھی تک ٹیوب ویل بھی یہاں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ نیچے کا پانی کھاری تھا۔ کماد، مکی اور جوار کی فصلیں بڑی اچھی تھیں پر وہ سرسبزی نہیں تھی جو برسات کے موسم میں ہمارے علاقے کی چپہ بھر زمین کو بھی ننگا نہیں رہنے دیتی اور صبح اٹھ کر وہ پہاڑ بھی نظر نہ آتے جو نیلے آسمان کے نیچے نیلم کی دیواریں بن کر یکایک اندھیرے سے ابھر کر اجالے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اور چوٹیوں پر برف کو آگ لگ جاتی ہے اور جب دھوپ پھیلتی ہے تو ان پر چاندی کے کلس جگمگ جگمگ کرنے لگتے ہیں۔

اس چک میں بڑی خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ملک میں کہیں جنگ نہ ہو رہی ہو۔ کبھی کبھار کوئی جہاز ہمارے اوپر سے گزرتا تو ہمیں جنگ کا احساس ہوتا۔ پر سرحد کی طرف سے جنگ کی مسلسل گونج یہاں نہ سنائی دیتی۔ پہلے دو ایک دن یہ چپ چاپ زندگی بوجھ سی معلوم ہوئی۔ اتنے شور کے بعد اتنی خاموشی! جب ہم اس سے مانوس ہوئے تو اچانک ایک دن خبر آئی کہ جنگ بند ہو گئی ہے۔ ہمارا جی چاہا کہ پر لگا کر اڑیں اور چک مراد پہنچ جائیں۔

میری ماں نے پوچھا "ماہنے! ہم چک مراد کب چلیں گے؟"

میں نے کہا "ماں! بہت جلد ....."

پر میں جانتا تھا کہ ہمارے علاقے میں جنگ ہوتی رہی ہے، ہمیں اتنی جلد وہاں جانا کیسے نصیب ہو گا۔ کیا پتہ ہمارا علاقہ دشمن کے قبضے میں آ گیا ہو۔ وہاں لوگوں سے ملنے اور ان سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی تو صرف عارضی فائر بندی ہوئی ہے۔ دونوں ملک ایک دوسرے سے صلح کریں گے تو اصل حقیقت کا پتہ چلے گا۔ گھر آ کر میں نے ماں کو ساری بات بتائی تو اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ پر واپسی کے انتظار میں بھی ایک مزہ تھا۔ اب امید تو بندھ گئی تھی۔

اس چک کی دھرتی پرائی نہیں تھی پر ابھی اس نے اپنائیت کا پلو ہم پر نہیں ڈالا تھا۔ ہم نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر اس سے ناتا جوڑنا چاہا تو مٹی سے وہ بھیگی مہک نہ آئی جو برسات کے بعد ہمارے کھیتوں کی مٹی سے ابھرتی تھی پر مٹی مٹی ہوتی ہے اور کسان مٹی کا کیڑا ہے۔ ہم نے بھا اسلم کے کھیتوں میں ایک بار نہیں، دو تین بار ہل چلایا اور اس طرح مٹی سے ناتا جوڑ دیا۔ گندم کی

بوائی کے لیے کھیت تیار ہوئے تو آہستہ آہستہ موسم کا رخ بدلنے لگا۔ ہوا میں ذرا سی سردی رچی تو ہم نے کھیتوں میں بیج ڈال دیا۔ نہری زمینوں پر کام کم ہوتا ہے۔ بوائی کے بعد ہمیں کام کاج سے اچانک فرصت ملی تو چک میں ہمارا جی نہ لگا۔ ایک دن میں نے اور بھا نے اچانک سیالکوٹ جانے کی ٹھان لی۔ لائل پور سے سیالکوٹ پہنچنے میں ہمیں یہی پانچ چھے گھنٹے لگے۔ فائر بندی ہوئے مشکل سے ایک ڈیڑھ مہینا گزرا تھا لیکن زندگی کے سارے کاروبار معمول پر آگئے تھے۔ سیالکوٹ شہر کی رونق بحال ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دکانداروں کی فطری خود غرضی اور کمینگی بھی۔ انھوں نے پھر ترکڑی کی ڈنڈی ٹیڑھی کر لی تھی اور ڈنڈی مار کر بھی خوش نہیں ہوتے تھے۔ جنگ کے چند دنوں نے ہمیں جس بے غرضی کا سبق دیا تھا' وہ شاید فائر بندی کے پہلے لمحے ہی میں ہم نے بھلا دیا تھا یا اب ہم اس عارضی گھاٹے کو پورا کرنے کے لیے ایک ایک لمحے کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو جنگ کے دوران ہم نے اچانک اٹھایا تھا۔ آج سے ڈیڑھ مہینا پہلے جب چک مراد سے لے کر لائل پور کے اس چک تک کے سفر میں ہم نے لوگوں سے بہت پیار پایا تھا۔ لوگ ہمیں بے گھر سمجھ کر مہربانی سے پیش آتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ بسوں کے ڈرائیور اور کلینر بھی میٹھی زبان میں بات کرتے تھے ' اب ہر ایک کے بولوں میں پھر وہی خود غرضی کا زہر بھر گیا تھا۔

"بھا! جو یہ لڑائی لمبی ہو جاتی تو اچھا نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"کیوں؟" بھا نے پوچھا۔

"کیا پتہ ہماری قوم کی فطرت بدل جاتی۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا ماہنے! جنگ نے ہمیں اچانک آلیا تھا۔ موت سر پر منڈلا رہی ہو تو ہم یکایک ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا دکھ درد ایک ہو جاتا ہے۔ اب خطرہ باقی نہیں رہا تو ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہو چکے ہیں۔"

"ابھی تو فوجیں آمنے سامنے مورچہ لگا کر بیٹھی ہیں۔ ہر سپاہی کا ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر ہے۔ کیا پتہ کب گھوڑا دب جائے؟" میں نے کہا۔

سیالکوٹ کے اڈے پر لاری سے اتر کر میں نے بھا سے مشورہ کیا کہ اب ہمیں کہاں جانا چاہیے۔ بھا نے اداس سے لہجے میں کہا "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اس وقت اڈے سے

ا۔ ترازو۔

قریب کی ایک مسجد سے دیگر[1] کی اذان ابھری اور دھوپ سمٹ کر عمارتوں کی منڈیروں سے لپٹنے لگی تو میرے جی میں ایک سناٹا سا بھر گیا۔ جب شام کے اندھیرے لپک کر آئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے ہی شہر میں کسی دوسرے ملک کا مسافر ہوں، ایک اجنبی جسے رات کا ٹھکانا میسر نہیں۔ وہ رات ہم نے سٹیشن کے مسافر خانے میں سوتے جاگتے گزاری۔ صبح اٹھ کر ہم نے قلعے کے پاس کا وہ محلہ دیکھا جہاں قریب ہی بمب[2] گرا تھا۔ ایک بمب نے پورے بازار کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ اب تک بہت سا ملبہ ہٹایا جا چکا تھا لیکن ٹرنک بازار کے ٹوٹے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی ابھی پوری طرح مرمت نہیں ہو سکی تھی۔

ایک چھوٹی سی دکان سے ہم نے چائے پی اور بند کھائے۔ باتوں باتوں میں دکاندار نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں اور سیالکوٹ کیوں آئے ہیں۔ اس طرح بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے بتایا کہ جس رات شہر میں بمب گرا تھا وہ محلہ رنگ پورہ میں اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ دھماکے سے پورا شہر گونج اٹھا تھا "بھائی صاحب! یوں معلوم ہوا جیسے حشر کا میدان بپا ہے اور میں نیند سے نہیں کسی قبر سے اٹھایا گیا ہوں اور میرا نامہ اعمال میرے ہاتھوں میں ہے۔ جب صبح کے وقت ہمیں معلوم ہوا کہ بمب قلعے کے نزدیک گرا ہے تو میں دوڑتا دوڑتا اپنی دکان پر آیا۔ اس کے دروازے کے پٹ دور جا گرے تھے اور چائے کے برتن باہر سڑک پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہی حال باقی دکانوں کا تھا جیسے غصے میں آئے ہوئے کسی جن نے پورے بازار کو تہ و بالا کر ڈالا ہو۔" اس نے بتایا "قلعے کی ان سیڑھیوں کے سامنے جہاں بمب گرا تھا، صرافوں کی گلی ہے، ان کے سونے چاندی کے زیور باہر گلی میں بکھر گئے تھے اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ دکانیں کئی دنوں تک دروازوں اور کھڑکیوں سے محروم رہیں لیکن ان کا سامان محفوظ رہا۔"

"ان دنوں لوگوں کے اخلاق بدل گئے تھے۔ چور اچکے اور ڈاکو غنڈے دوسروں کے مال اسباب اور عزت آبرو کے رکھوالے بن گئے تھے۔ پر جونہی جنگ ختم ہوئی لوگوں کی فطرت بدل گئی۔ کئی محلوں میں بند مکانوں کے تالے ٹوٹ گئے اور پھر ایک کا ہاتھ دوسرے کے گریبان پر جا پڑا۔" دکاندار نے ہنس کر کہا "بھائی صاحب! ہماری قوم بھی عجیب ہے۔ اس نے جنگ کو تماشا سمجھا۔ ہوائی جہاز ہمارے سروں کے اوپر سے ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے اڑتے تو لوگ پتنگ بازی کا تماشا سمجھ کر گلیوں اور بازاروں میں نکل آتے اور "بو کاٹا۔ بو کاٹا" کا شور مچاتے۔"

1۔ عصر کی نماز۔

2۔ بم۔

ہم نے سید پور جانے والی سڑک پر پہلا قدم رکھا تو بھانے کہا "اس شہریے نے ہمیں اتنا مایوس کیوں کر دیا ہے ماہنے ؟"

"بھاوہ سچی بات کر رہا تھا اور سچ اکثر مایوس کرتا ہے۔" میں نے جواب دیا ہم نے جنگ کے سترہ دنوں میں جو خواب دیکھا تھا' وہ ٹوٹ رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ قوموں پر ایسے وقت آتے ہیں اور توپوں کی گھن گرج 'بموں کے دھماکے اور گولیوں کے زناٹے 'ان کا حوصلہ بلند کرتے ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت اونچا اٹھ جاتی ہیں۔

"ہم تو سترہ دن کے بعد پھر وہیں پہنچ گئے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"کہاں ؟" بھانے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھا! یونہی ایک خیال آیا تھا۔"

شہر سے باہر نکلتے ہی دفعتاً" ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ چھاؤنی کی بیرکیں خالی تھیں۔ ساری چھاؤنی سنسان نظر آتی تھی۔ کیونکہ فوج ابھی محاذ جنگ پر تھی۔ چھاؤنی کے ساتھ کے گاؤں ابھی پورے طور پر آباد نہیں ہوئے تھے۔ البتہ کنویں اور ٹیوب ویل چل رہے تھے اور کسان گندم کی بوائی میں مصروف تھے۔ ہم سڑک سے ایک طرف کو ہٹ کر ایک ٹیوب ویل پر پہنچے۔ ٹیوب ویل پھک پھک چل رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھا ہوا ایک کسان بڑے اطمینان سے حقہ پی رہا تھا۔ ہم نے سلام دعا کے بعد کہا کہ ہم لائل پور سے آ رہے ہیں۔ اس نے چارپائی کی پائنتی کی طرف کھسک کر کہا "بیٹھ جاؤ پہلے لسی پانی پیو۔ پھر باتیں کریں گے۔"

"مہربانی۔ پیاس نہیں ہے۔"

"کہاں جاؤ گے ؟" اس نے پوچھا۔

"چک مراد۔" میں نے کہا۔

"چک مراد ؟" اس نے چونک کر کہا "تم چک مراد کے رہنے والے ہو۔ سفید پوش دین کے گاؤں کے ؟"

"ہاں ! ہاں !" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ تو دشمن کے قبضے میں ہے 'تم وہاں کیسے جاؤ گے ؟"

"ہمارا بھی یہی خیال تھا پر تم جانتے ہو' اپنے گاؤں کی مٹی میں کتنی خوشبو ہوتی ہے ! بس

وہی یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ تمہارا گاؤں بھی تو اجڑا اجڑا سا نظر آتا ہے۔"

"جنگ میں کئی گولے ہمارے گاؤں پر بھی آن گرے تھے۔ ہم نے عورتوں اور بچوں کو گاؤں سے نکال کر ذرا دور کے دوسرے گاؤں میں بھیج دیا۔ دیکھو چوہدری ! عزت سب سے پہلے ..... مال اسباب تو آنی جانی چیز ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"تم گاؤں چھوڑ کر کیوں نہ کہیں چلے گئے چوہدری ؟" بھا نے کہا۔

یہی سمجھو کہ مٹی نے ہمارے پاؤں پکڑ لیے۔ سارے مرد گاؤں ہی میں رہے۔ ہم لوگ پورے سترہ دن گولوں کی زد پر رہے۔ گولے ہمارے سروں پر سے اڑتے رہے اور ہر وقت موت کا دھڑکا لگا رہا۔ ہمارے آگے پیچھے توپیں لگی تھیں اور فوج مورچوں میں بیٹھی تھی۔ دشمن کے ہوائی جہاز بار بار آتے اور گولیاں اور بم برساتے رہے۔ ایک بم تو ٹیوب ویل سے اتنا نزدیک پھٹا کہ اس کے ٹکڑے اڑ کر یہاں تک پہنچے اور میرا ایک بیل زخمی ہو گیا۔ پر دو چار دنوں کے بعد دشمن کی یلغار رک گئی اور اس کا زور ٹوٹ گیا تو ہم اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ اب دیکھو کتنی خاموشی ہے ! کبھی کبھار فائر بندی ٹوٹ بھی جاتی ہے اور توپیں دنا دن چلتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے' لڑائی پھر سے شروع ہو گئی ..... اچھا ! اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے ؟"

"لائل پور لوٹ جائیں گے۔ شہر سے شام تک بسیں چلتی رہتی ہیں۔"

"نہیں ..... ایک رات یہیں گزار لو۔ کل صبح چلے جانا۔"

اس کسان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے روٹی پکا کر کھلائی اور وہ رات ہم نے اس کے ٹیوب ویل پر گزاری۔ ہم گاؤں سے اتنا قریب پہنچ کر بھی وہاں نہ جا سکے تھے۔ اس کا ہمیں افسوس تھا۔ رات کو چاند نکلا۔ چاندنی میں کھیتوں کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ کماد کے کھیت گھنا جنگل معلوم ہوتے ہیں اور ہوا سرسراتی ہوئی گزرتی ہے تو چاندنی لرز جاتی ہے۔ جن کھیتوں کو تازہ تازہ پانی ملا ہوتا ہے' ان کی مٹی سے جو خوشبو نکلتی ہے' اس میں ہری ہری کونپلوں کا رس ملا ہوتا ہے۔ وہی خوشبو جو دودھ پیتے بچے کے منہ سے آتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ رات میں نے اپنے ہی گاؤں میں گزاری ہو اور گاؤں میرے لیے ماں کی کوکھ بن گیا ہو۔ صبح کے اجالے میں شمال کی طرف نیلم کی دیواریں ابھریں تو میرے بچپن نے آنکھیں کھول دیں اور ابھی بچپن نے آنکھ

بھی نہیں جھپکی تھی کہ مشرق سے سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور یکایک میری زندگی کے بتیس سال بیت گئے ..... چک مراد کے بتیس سال ..... تب ایک عجیب سی حسرت میرے دل میں اتر آئی۔

(میرا گاؤں)

سوالات

۱۔ اس اقتباس میں ناول نگار نے جنگ کے متعلق گاؤں کے لوگوں کا جو ردِ عمل بیان کیا ہے اس کا تجزیہ کیجیے۔

۲۔ جدید دَور کی جنگ صرف فوجیں ہی نہیں لڑتیں، تمام ملک اس میں شریک ہوتا ہے۔ زیرِ نظر اقتباس سے یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے؟

۳۔ اس اقتباس میں وہ کون سے اسباب گنوائے گئے ہیں جن کی وجہ سے جنگ کے ایام میں لوگ مثبت ردِ عمل اپنا لیتے ہیں۔

—— ○○○ ——
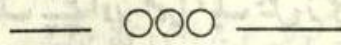
خدیجہ مستور

(۱۹۲۷ء - ۱۹۸۲ء)

بریلی کے ایک یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ بریلی کے نزدیک بلہ نامی گاؤں کے ایک متوسط پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام تہور علی خاں تھا اور وہ ملازمت پیشہ تھے لہٰذا مختلف مقامات پر ابتدائی زندگی گزاری۔ ان کی والدہ کا نام انور جہاں تھا جو کہ ایک اچھی شاعرہ اور مضمون نگار تھیں۔ اس طرح انھیں ابتدا ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر آیا۔ لیکن نو برس کی تھیں کہ والد وفات پاگئے اور خاندان والوں نے کفالت سے ہاتھ کھینچ لیا لہٰذا معاشی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور لکھنؤ میں اپنے نانا کے ہاں قیام کرنا پڑا۔ گھر پر ہی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنی محنت اور ذوق سے وسیع مطالعہ اور معاشرتی و معاشی حقائق کا ادراک حاصل کیا۔

خدیجہ مستور کو ابتدا ہی سے افسانوی ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور افسانوں کا پہلا مجموعہ "کھیل" ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "بوچھاڑ" (۱۹۴۶ء)، چند روز اور" (۱۹۵۱ء)، "تھکے ہارے" (۱۹۶۲ء) اور ناول "آنگن" (۱۹۶۲ء) میں شائع ہوئے۔ "آنگن" پر ان کو آدم جی ادبی انعام ملا۔ ان کی آخری تصنیف "زمین" ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

خدیجہ مستور اردو خواتین ناول نگاروں میں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے اپنے ناول "آنگن" میں سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ایک پورے عہد اور دور کی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس ناول کو قیام پاکستان کے پس منظر میں لکھے جانے والے ناولوں میں امتیاز حاصل ہے۔ ناول "آنگن" کی کہانی اگرچہ ایک خاندان کی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے آئینے میں انھوں نے گھریلو زندگی کے تصادم اور کشمکش کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی نظریات کے ٹکراؤ، سماجی رجحانات اور معاشی تحریکوں کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کا ایک خاص کارنامہ اپنے نسوانی کرداروں کی تصویر کشی اور ان کی نفسیات کا اظہار ہے۔

"آنگن" کی زبان نہایت شستہ، رواں اور روزمرہ کی زبان ہے۔ خدیجہ مستور کا اسلوب جدید دور کے سادہ، بے تکلف اور عام فہم انداز کا آئینہ دار ہے جو ناول کے موضوع، کرداروں اور ان کے تمام احساسات و معاملات کے اظہار پر قادر ہے۔ "آنگن" درحقیقت قیام پاکستان کے وقت کے ایک متوسط مسلمان گھرانے کی تصویر کشی پر مشتمل ہے۔ اور خدیجہ مستور کا اسلوب، اس کا زندگی کو سمجھنے کا انداز، اور اس کا نسوانی نقطہ نظر اس تصویر کشی میں حقیقت کا رنگ اجاگر کرتا ہے۔

(زیر نظر اقتباس "آنگن" سے لیا گیا ہے۔)

آنگن

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ چھاجوں پانی برس گیا۔ صبح بھی آسمان صاف نہ تھا۔ ابر

کے سیاہ ٹکڑے ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے تھے۔

عالیہ نے کھڑکی کے بھڑے ہوئے پٹ کھول دیے۔ سامنے ہائی اسکول کے احاطے کے درخت رات کی بارش سے نہا کر خوب نکھر گئے تھے اور کسی درخت میں چھپی ہوئی کویل برابر چیخے جا رہی تھی۔ گلی میں پڑی ہوئی آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کی بو ہوا میں رچی ہوئی تھی اور اخبار بیچنے والا بڑی تیزی سے گلی سے چیختا ہوا گزر رہا تھا ——— "خوفناک بم[1] جاپان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ہیروشیما تباہ ہو گیا' اتحادیوں کی فتح قریب ہے 'آ گیا' آ گیا آج کا اخبار 'ہیروشیما ———"

اچھا تو ایک پورا شہر ایک بم سے ختم ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ جمیل بھیا واپس آ جائیں گے۔ انگریزوں کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے سارے ہتھیار ختم کر کے خالی خولی واپس آ جائیں گے۔ مگر وہ بیچارے جو جنگ کی آگ میں جل مرے' اب ان کا انتظار کرنے والوں پر کیا گزرے گی؟ اس سوال کا جواب نہ پا کر عالیہ بستر سے اٹھ پڑی آج اسے اخبار پڑھنے کی بچی طلب ستا رہی تھی۔

بڑے چچا بیٹھک میں جا چکے تھے اور اخبار کے صفحے پلنگ پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے بے تابی سے اخبار کے سارے صفحے اٹھا لیے۔ ہیروشیما میں آگ کے شعلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ———

اخبار رکھ کر وہ گم سم سی بیٹھ گئی۔ اللہ یہ حکومتیں شہروں کو کیوں نشانہ بناتی ہیں۔ ان کا کیا قصور' انھیں کیوں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے۔ تاریخ کبھی مسکرائے گی بھی کہ نہیں۔ ایک ایک لفظ خون کی بوند معلوم ہوتا ہے۔ ہیروشیما کی آگ میں کیا کچھ نہ جل گیا ہو گا۔ پتہ نہیں لوگ اس وقت کس عالم میں ہوں گے۔ وہ اس وقت زندگی کے کتنے بہت سے کام انجام دینے کی سوچ رہے ہوں گے۔ وہ کیا کچھ کرنے کو گھروں سے نکلے ہوں گے اور کیا پتہ اس وقت بھی بچے جاپانی گڑیاں خریدنے کسی دکان پر کھڑے ہوں اور اس وقت اچانک بم کا دھماکا ہوا ہو گا ——— اور ———

"جلدی جلدی چائے پی لو عالیہ بیٹی' اسکول کا تانگا آنے والا ہو گا۔ یوں ہی بیٹھی کیا سوچ رہی ہو۔" کریم بوا نے ٹوکا تو وہ جلدی سے چائے پینے بیٹھ گئی۔ ابھی تو اسے تیار بھی ہونا تھا۔

"جاپان بھی ہارنے والا ہے۔ ان کا ایک پورے کا پورا شہر تو تباہ ہو گیا۔" غسل خانے

---

[1] دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما پر گرایا جانے والا ایٹم بم۔

سے نکل کر اماں نے بڑے اطمینان اور سکون سے خبر سنائی۔

"جی ہاں!" چائے پی کر وہ صحن میں آگئی۔ بڑی چچی نل کے پاس بیٹھی منہ دھو رہی تھیں۔ کیاری میں سارے پودے بارش کے بوجھ سے دب کر زمین پر جھک گئے تھے۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ بال ٹھیک کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی ——— "استانی جی تانگا آگیا ہے۔"

برقع ہاتھ پر ڈالے جب وہ زینے طے کرنے لگی تو آگے آگے نجمہ پھوپھی بہت اونچی ایڑیوں کی سینڈل پر جھومتی اتر رہی تھیں۔ "استانی جی تانگا آگیا ہے۔" نجمہ پھوپھی نے گردن گھما کر کہا۔ ان کے ہونٹوں پر کیسی مضحکہ خیز مسکراہٹ تھی۔

"ہم دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں۔ مگر آپ لکچرار کہی جاتی ہیں اور میں استانی۔ یہ فرق اگر نہ بھی مٹے تو کیا قیامت آجائے گی، نجمہ پھوپھی۔" عالیہ نے تلخی سے جواب دیا۔

"استانی جی، کالج سے تانگا آگیا ہے۔" باہر سے صدا آئی۔

"تانگے والوں کے لیے ہم اور آپ دونوں برابر ہیں۔" عالیہ زور سے ہنسی ——— آپ انھیں سمجھاتی کیوں نہیں؟" وہ تانگے پر جا بیٹھی۔ نجمہ پھوپھی کیا کہہ رہی تھیں۔ اس نے سنا نہیں۔

اسکول سے واپسی پر عالیہ نے دیکھا کہ کوئی صحن میں کھڑا ہے۔ وہ پشت سے پہچان نہ سکی مگر جیسے ہی دو قدم آگے بڑھی تو چھمی پلٹ کر اس سے لپٹ گئی۔

"ارے چھمی تم آگئیں؟" عالیہ اسے زور زور سے بھینچ رہی تھی۔ "اور وہ برآمدے میں کون لیٹا ہے کھٹولے پر؟"

"پتہ نہیں بجیا!" چھمی جھینپ گئی۔

"چھمی کی بٹیا ہے، اور کون ہے؟" بڑی چچی نے نہال ہو کر بتایا۔

"اوہ!" عالیہ برقع اتارنا بھول گئی اور بچی کی طرف بھاگی ——— "ہے کتنی پیاری ہے، بالکل چھمی کی طرح ———" عالیہ کا جی چاہا کہ اسے سوتے سے اٹھا کر خوب پیار کرے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اگر تہمینہ آپا زندہ ہوتیں تو شاید ان کے بھی دو بچے ہوتے۔

بچی کے منہ پر سے دوپٹا سرک گیا تھا اور گال پر مکھی آبیٹھی تھی۔ عالیہ نے مکھی اڑا کر منہ ڈھانک دیا۔ "کل میں اسکول سے آتے ہوئے اس کے لیے ایک چھوٹی سی مچھردانی خرید

لاؤں گی۔ پھر مکھیوں سے محفوظ ہو جائے گی۔" ـــــ عالیہ نے کہا۔

"لو بھلا مکھیوں سے کون بچتا ہے' یہ تو ہمارے ہاں موسمی تتلیاں ہیں بجیا۔" چھمی ہنس دی۔ اگر ہمارے میں کوئی ایسی بات کرے تو سب مذاق اڑانے لگتے ہیں' بھلا مکھیوں سے بھی کوئی بچ سکتا ہے۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔ کیسا دکھ تھا اس کی ہنسی میں۔ وہ دبلی ہو گئی تھی' اس لیے کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگ رہی تھی ـــــ جمیل بھیا نے چھمی کو کھو کر غلطی ضرور کی ہے ـــــ عالیہ کو خیال آیا اور وہ برقع اتارنے لگی۔

"بڑے چچا سے ملیں؟" اس نے برقع اتارتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں؟" وہ گھر میں آئے ہی نہیں۔" چھمی نے کہا اور پھر بڑی چچی کی طرف مڑ گئی۔

"اچھے تو ہیں بڑے چچا؟" اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح پوچھا۔

"بس اچھے ہی ہیں۔ کمزور ہو گئے ہیں۔" بڑی چچی نے جواب دیا۔

"تم کھانا کھا چکی ہو چھمی؟" عالیہ نے پوچھا۔

"نہیں' میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی بجیا۔"

چھمی کی بٹیا جاگ کر رونے لگی تو بڑی چچی نے اسے اٹھا کر کندھے سے لگا لیا اور بڑی محبت سے تھپکنے لگیں۔ اماں تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ انھوں نے ایک بار بھی چھمی یا بچی کی طرف نہیں دیکھا۔ جب سے عالیہ اسکول میں ملازم ہوئی تھی اماں کی نظروں میں سب کے لیے کتنی حقارت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر چھمی سے تو وہ ہمیشہ کا بیر رکھتی تھیں۔

" تمھارے میاں نہیں آئے چھمی؟"

"نہیں بجیا وہ کیسے آتے۔ ان کی بھینس بیمار تھی۔ انھوں نے مجھے زنانے ڈبے میں بٹھا دیا تھا اور ایک بوڑھی عورت سے کہہ دیا تھا کہ مجھے دیکھے رہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"تم بہت یاد آتی تھیں چھمی" ـــ عالیہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ چھمی اپنے ماحول سے مطمئن نہیں۔ یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا۔

"میں بھی آپ ہی سے تو ملنے آئی ہوں۔"

"ہوں! تمھارے جانے کے بعد گھر میں سکون ہو گیا تھا اس لیے تمھیں یاد کر کے

تڑپتی تھی۔" اماں نے جلی کٹی نظروں سے چھمی کو دیکھا۔

"اچھا!" چھمی ان کے طنز کو سن کر ہنس پڑی۔

ارے کیا چھمی اتنی ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ عالیہ کو یقین نہ آ رہا تھا۔ کیسی سنجیدہ اور بھاری بھرکم سی لگ رہی تھی۔

"چھمی اس کو مجھے دے دے۔ اسے پال کر زندگی کے دن کٹ جائیں گے۔" بڑی چچی چھمی کی بٹیا کو چوم چوم کر کہہ رہی تھیں۔

"لے لیجیے بڑی چچی۔" چھمی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ شاید چھمی کو اپنی پرورش کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ اسے بھی تو یہاں پلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھمی کی بٹیا بھوک سے بلبلا کر زور زور سے رونے لگی تو چھمی نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر اسے گود میں لے لیا۔ بڑی چچی کمرے میں چلی گئیں۔ اماں پہلے ہی چھمی کے کمرے میں پاندان لے کر جا چکی تھیں۔ شاید انھیں خطرہ ہو گا کہ چھمی اپنے کمرے میں ڈیرا نہ ڈال دے۔

کتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت حبس ہو رہا تھا۔ دوپہریں کاٹے نہیں کٹتیں۔

"کریمن بوا! صاحبزادی کے لیے یہ کھلونے لے جاؤ اور چھمی بٹیا کو میری دعا کہو اور اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو ــــــ" اسرار میاں بیٹھک کے کواڑوں کی آڑ میں کھڑے کہہ رہے تھے اور کریمن بوا سب کے آگے سے بچا ہوا سالن ایک پیالے میں جمع کر کے اسرار میاں کے ہیضہ مار کرنے کا سامان کر رہی تھیں۔

عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر کھلونے لے لیے تو کریمن بوا جیسے بلبلا اٹھیں۔ "خدا کی شان ہے، زمانے زمانے کی بات ہے اسرار میاں چھمی بٹیا کی اولاد کے لیے کھلونے لائیں۔" کریمن بوا نے سالن کا پیالہ اور روٹیاں ان کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پر پٹخ دیں۔

"یہ کھلونے اسرار میاں نے دیے ہیں اور دعا کہی ہے۔" عالیہ نے بچوں کی طرح جھنجھنا بجایا۔

"اس طرح تو اونچے ہونے سے رہے اسرار میاں، یوں پھلپھلائے پھرتے ہو، اپنی اوقات بھی نہیں پہچانتے۔" کریمن بوا برآمدے میں اب تک بڑبڑا رہی تھیں۔

"کریمن بوا اللہ کرے تم گونگی ہو جاؤ۔ یا اسرار میاں مرجائیں۔" عالیہ نے دل ہی دل میں دعا کی اور پھر بڑی چچی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کپڑوں کی گٹھڑیوں اور تلے دانیوں کو کھولے ریشمی ٹکڑے چن چن کر چھمی کی بٹیا کے لیے کرتہ ٹوپی سی رہی تھیں اور برابر باتیں کیے جا رہی تھی۔

"چھمی تمھاری ساس کیسی ہے! لڑتی تو نہیں' تمھارا میاں تو تم سے بہت محبت کرتا ہوگا۔"

چھمی ہنس ہنس کر ہر بات کا جواب ہاں میں دے رہی تھی مگر عالیہ دیکھ رہی تھی کہ چھمی سب سے نظریں بچا رہی ہے ـــــ "مجھے یہ اتنی پیاری کیوں ہے بجیا؟" تمام باتوں سے بچنے کے لیے چھمی نے دوسری بات شروع کر دی۔

"تمھاری بیٹی جو ہے۔"

"جب سے یہ سامنے آئی ہے ساری دنیا ہیچ ہو گئی ہے۔" چھمی نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی بٹیا کو سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔ "اس کے باپ اور دادی کو اس سے کوئی محبت نہیں' انھیں بیٹا چاہیے تھا۔"

ذرا سی دیر میں چھمی سو گئی اور سوتے میں لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی مگر عالیہ بڑی چچی کے ساتھ ساری دوپہر کرتہ ٹوپی سلاتی رہی۔

شام کو جب سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بڑے چچا آگئے۔ چھمی نے ان کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

"بڑے چچا کھڑے ہیں چھمی۔" عالیہ نے ملامت سے دیکھا۔

"اچھا بڑے چچا ہیں! میں تو پہچانی نہیں۔" وہ بڑے طنز سے ہنسی۔

"چھمی اب تو تم اتنی بڑی ہو گئی ہو' اماں بن چکی ہو' کچھ تو لحاظ کرتیں بڑے چچا کا۔" عالیہ نے ضبط کرنے کے باوجود چھمی کو ٹوک دیا۔

"بس جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں ان سے معافی مانگ لوں گی بجیا۔" وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ "میں صبح چلی جاؤں گی۔" وہ کریمن بوا کی طرف مڑ گئی۔ "کریمن بوا اسرار میاں سے کہہ دینا کہ صبح تانگا لے آئیں اور مجھے گاڑی پر بٹھا دیں"۔

"ارے تو کیا تم اتنی جلدی چلی جاؤ گی چھمی' ناراض ہو!" عالیہ اس کے پاس سرک کر کھڑی ہو گئی۔

"بھئی حد کرتی ہیں آپ بھی۔ میں آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں! آپ کو کیا پتہ کتنی مشکل سے ایک دن کی اجازت ملی ہے۔ آپ نہیں جانتیں عالیہ بجیا' آپ نہیں جانتیں ——" اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ "جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہیں پڑی رہوں پر اب یہ میری بٹیا جو ہے' ارے اس کا کوئی اچھا سا نام تو بتا دیں بجیا۔ اس کی دادی نے تو اس کا نام تمیزن رکھا ہے" چھمی نام بتا کر ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

"تم رک کیوں نہیں سکتیں' آٹھ دس دن تک مت جاؤ — گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے' لگتا ہے بہار آگئی ہے۔" عالیہ جذباتی ہو رہی تھی۔ — "تمہارے جانے کے بعد کیسا سناٹا چھایا ہے۔"

چھمی' جی اوبھ[1] جاتا ہے اس خاموشی سے۔"

"پھر آؤں گی بجیا۔" چھمی بڑے انہماک سے اپنی بٹیا کو تھپک رہی تھی۔

گلی میں تانگا رکا اور نجمہ پھوپھی ساڑی[2] کا پلو سنوارتی گھر میں داخل ہوئیں۔ "ارے واہ چھمی آئی ہے۔ کیا حال چال ہے اور یہ تمہاری بٹی ہے' بڑی پیاری ہے۔ باپ پر تو بالکل نہیں پڑی —" انھوں نے پیار سے بٹیا کے گال تھپتھپائے — "اسے خوب پڑھانا چھمی ورنہ یہ بھی جاہل رہ جائے گی سب کی طرح۔"

"آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ پڑھا دیجیے گا؟" چھمی کا چھوڑا ہوا تیر نجمہ پھوپھی کی پیشانی کو بگاڑ گیا۔ "اچھا تو پھر باتیں ہوں گی' ابھی تو میں تھکی ہوئی ہوں۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی زینے چڑھنے لگیں۔

"کچھ شکیل کی بھی خبر لگی!" چھمی نے سرگوشی کی۔

"نہیں چھمی!" عالیہ نے چپکے سے جواب دیا۔

"اور ہمارے ابا نے بھی کبھی خط لکھا؟"

عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بچے کے گال سہلاتی رہی۔ چھمی جواب نہ پا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

سب کو پوچھا مگر جمیل بھیا کو بھول گئی۔ اس محبت میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ عالیہ کو

۱۔ گھبرانا' اکتانا۔

۲۔ ساڑھی۔

عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

رات آسمان اس قدر صاف تھا کہ چاندنی دودھ میں نہائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ آنگن میں برابر سے بچھے ہوئے پلنگوں میں آج ایک ننھے سے کھٹولے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اس کھٹولے پر پڑی ہوئی ایک ننھی سی بچی کی غوں غاں رات کو اور بھی خوبصورت بنا رہی تھی۔ کل کی موسلا دھار بارش نے آج کی رات کو ہلکا سا سرد کر دیا تھا۔

آج تو عالیہ نے بھی چھت پر سونے کے بجائے آنگن میں چھمی کے برابر اپنا بستر لگا لیا تھا۔ عجیب سی رونق کا احساس ہو رہا تھا۔ سب ایک جگہ جمع تھے' باتیں ہو رہی تھیں اور چھمی کی بٹیا برابر غوں غاں کیے جا رہی تھی۔ بس ایک نجمہ پھوپھی تھیں جو آج بھی سب سے الگ تھلگ جاہلوں کی صحبت سے دور' چھت پر اکیلی پڑی تھیں۔ ہاں بڑے چچا نے بھی چھمی سے ملنے کے بعد پھر گھر میں قدم نہ رکھا تھا۔ بیٹھک میں کھانا کھایا اور باہر چبوترے پر بستر لگوا کر بستر پر لیٹے' جانے کس سے باتیں کر رہے تھے۔

کریمن بوا سارے کاموں سے فرصت پا کر اماں کے قریب زمین پر بیٹھ گئیں اور چھمی کی بٹیا کو لوریاں دینے لگیں۔ "آجا ری نندیا' تو آکے نہ جا۔۔۔"

کریمن بوا ایک اچھی سی کہانی سنا دو ۔۔۔ چھمی نے فرمائش کی۔ وہ اس وقت ذرا سی بچی لگ رہی تھی۔

"اب تو یاد بھی نہیں آتی' چھمی بٹیا۔" کریمن بوا سوچنے لگیں۔

"کوئی سی کہانی سنا ڈالو کریمن بوا' ہائے کتنے مزے کی ہوتی ہیں یہ کہانیاں بھی۔"

عالیہ بھی ضد کرنے لگی۔ کتابوں کی دنیا سے وہ تھک چکی تھی۔ اس وقت تو اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی معصوم سی کہانی سنے۔

"ارے وہی کہانی سنا دو کریمن بوا کہ ایک بادشاہ تھا' اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے اپنی ساتوں بیٹیوں کو بلا کر پوچھا کہ تم کس کی قسمت کا کھاتی ہو تو سب نے کہا آپ کی قسمت کا' مگر سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا میں اپنی قسمت کا کھاتی ہوں اور بادشاہ نے اسے جنگل میں ڈلوا دیا کہ اپنی قسمت کا کھاؤ اور پھر جب وہ لڑکی جنگل میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی تو ایک دیو آیا اور اس نے لڑکی کے لیے محل بنایا اور ۔۔۔ بس وہی سی کہانی سنا دو کریمن بوا۔ اتنی بہت سی تو میں نے یاد دلا دی۔" چھمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو پھر سنو۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ ہاں تو اس بادشاہ کی سات لڑکیاں تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے ان ساتوں کو بلا کر پوچھا۔" کریمن بوا کہانی کہے جا رہی تھیں مگر عالیہ نے ایک لفظ نہ سنا، وہ تو سوچنے لگی تھی آخر چھمی کو یہ کہانی کیوں یاد آئی۔ کیا چھمی کو اپنی قسمت سے کوئی امید تھی۔ وہ تو کتنی مدت سے اپنی بد نصیبی کے جنگل میں بھٹک رہی ہے مگر اب تک کوئی دیو نہیں آیا۔ ارے چھمی یہ جو لوگ کچھ نہ پا سکنے کی حسرت میں معصوم معصوم کہانیوں سے جی بہلاتے ہیں، ان میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

کہانی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ چھمی کو نیند کی پری لے اڑی۔ جانے کس محل میں لے گئی ہوگی۔

صبح چھمی چلی گئی، مگر اسکول جاتے ہوئے عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رنجیدہ ہے۔ آج وہ اسکول میں جی سے پڑھا نہ سکے گی، کچھ دن کے لیے چھمی رک جاتی تو کیا تھا۔

(آنگن)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے :

(ا) "تاریخ کبھی مسکرائے گی بھی کہ نہیں۔"

(ب) "جب سے یہ سامنے آئی ہے، ساری دنیا ہیچ ہو گئی ہے۔"

(ج) "گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے، لگتا ہے بہار آگئی ہے۔"

(د) "رات آسمان اس قدر صاف تھا کہ چاندنی دودھ میں نہائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔"

۲۔ جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم کے دھماکے اور جنگ کی ہولناکیوں کا سن کر عالیہ کے دل پر کیا گزری؟

۳۔ اس سبق میں بادشاہ اور اس کی سات بیٹیوں کی جو کہانی بیان ہوئی ہے، متن کے پیش نظر اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

۴۔ "خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" ہمارے پورے معاشرے کا آنگن ہے۔" اظہار خیال کیجیے۔

۵۔ "خدیجہ مستور کے ناول میں عورتوں کے کردار زیادہ جاندار اور زندگی کے قریب ہیں" اپنے الفاظ میں تبصرہ کیجیے۔

— ○○○ —

مختصر افسانہ

اردو زبان میں مختصر افسانہ مغربی ادب کے اثر سے آیا۔ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں مختصر افسانے سے پہلے ناول، تمثیلی قصے اور طویل افسانے لکھے گئے اور جب وہاں زندگی کی کشمکش بڑھی، انسان کے لیے فرصت اور فراغت کم ہوئی تو ایسی صنف ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھنے والے کو مسرت اور تسکین دے سکے۔ اس وقت تک رسالے اور اخبار بھی کثیر تعداد میں چھپنے لگے تھے اس لیے ان کے لیے بھی ایسی دلچسپ کہانیوں کی ضرورت تھی جنھیں عام لوگ پڑھنا پسند کریں اور جو مختصر اور مکمل ہوں۔ اس طرح مختصر افسانہ نگاری کا رواج ہوا۔

مختصر افسانہ ایسی افسانوی صنف ادب ہے جو زندگی، کردار یا واقعہ کے کسی ایک پہلو کو مکمل طور پر اس طرح پیش کرتی ہے کہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے۔ یعنی افسانہ وہ مختصر کہانی ہے جو آدھ گھنٹے سے لے کر ایک یا دو گھنٹے کے اندر پڑھی جا سکے اور یہ کسی شخص کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعے کو فنی شکل میں پیش کرے۔ یہ کسی ایک ایسے واقعے کا بیان ہے جس میں ابتدا ہو، درمیان ہو، عروج ہو، خاتمہ ہو، یعنی مکمل ہو اور قاری پر ایک تاثر پیدا کرے۔

ناول کی طرح افسانہ بھی ایک حقیقت پسندانہ صنف ادب ہے۔ انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے سماج اور فطرت کی طاقتوں سے انسان کی کشمکش اس کا موضوع ہے۔ ناول کی طرح اس میں بھی سماجی مسائل اور افراد کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کی ترجمانی ہے لیکن دونوں اصناف میں زندگی کی ترجمانی کا جو فرق ہے، اسی سے ان کے فن کی خصوصیت کا تعین ہوتا ہے۔

افسانے میں زندگی کے کسی ایک گوشے، کسی ایک واقعے یا کسی ایک نفسیاتی حقیقت کو موثر طریقے سے پیش کیا جاتا ہے جب کہ ناول میں پھیلاؤ کی وجہ سے تفصیلات کی زیادہ گنجائش ہے۔ افسانے میں ہر بات اختصار اور اشاروں میں کہی جاتی ہے۔ ناول میں کرداروں کی تعداد پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے جب کہ افسانے میں کرداروں کی تعداد کم سے کم ہوتی ہے۔ ناول میں قاری کی توجہ ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف ہٹتی اور گھٹتی بڑھتی رہتی ہے جب کہ افسانے میں قاری کی توجہ کا مرکز ایک ہی واقعہ ہوتا ہے۔ وحدت تاثر افسانے کی اہم خصوصیت ہے۔

افسانے میں کہانی کہنے کا اسلوب ہی اس کی تکنیک کہلاتا ہے۔ افسانہ نگار آزاد ہے کہ وہ جس انداز میں چاہے واقعہ بیان کرے۔ وہ ایک راوی یا تماشائی کی حیثیت سے بھی کہانی لکھ سکتا ہے، خود افسانے کا کردار بھی بن سکتا ہے یا کسی کردار کی زبانی بھی کہانی کو بیان کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ ڈائری، خطوط یا سفرنامے کی صورت میں بھی افسانے کو ترتیب دے سکتا ہے۔ بس اس کا خیال رہے کہ افسانے میں دلچسپی قائم رہے اور اس کے مختلف اجزا میں ہم آہنگی اور تناسب ہو تاکہ قاری کے ذہن پر اس کا ایک ہی بھرپور تاثر قائم ہو۔

اردو میں مغربی انداز کے حقیقت پسندانہ قصے تو انیسویں صدی ہی میں لکھے جانے لگے تھے اور محمد حسین آزاد نے "نیرنگ خیال" کی شکل میں تمثیلی رنگ کے افسانے بھی لکھے تھے۔ لیکن اردو میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوا جب "مخزن"، "زمانہ" اور "ادیب" جیسے نئے ادبی رسائل شائع ہونا

شروع ہوئے۔ منشی پریم چند' سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو میں افسانے کے اولین نمونے پیش کیے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری بھی افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ یہ سارے ادیب ترکی یا انگریزی افسانہ نگاری سے متاثر تھے۔ ان کے افسانوں میں زبان و بیان کی طاقت اور نفسیاتی اور فلسفیانہ بصیرت خاص اہمیت رکھتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو میں روسی' فرانسیسی اور انگریزی کے معیاری افسانوں کے ترجے کثرت سے شائع ہونے لگے۔ ان کا اثر اردو افسانوں پر پڑا۔ پریم چند نے بھی اپنی کہانیوں کو فنی اعتبار سے بہتر بنایا۔ وہ اور ان کے ہم عصر اپنے افسانوں کو انسانوں کی حقیقی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کو پیش کرنے کا بہترین ذریعہ تصور کرتے تھے' چنانچہ انھوں نے تخیل کی ایک خوبصورت آراستہ دنیا جس میں حسن پرستی کا جذبہ اور اس کی نفسیاتی نزاکتیں ہی اہمیت رکھتی تھیں' سے باہر نکل کر اپنی کہانیوں کو فطری اور حقیقی پلاٹوں سے منظم کیا اور برصغیر کی عام زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کردار نگاری پر خصوصیت سے توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار حقیقی اور جاندار کردار اردو افسانوی ادب کی زینت بنے۔ پھر نیچرل مکالموں اور خوبصورت منظر نگاری نے بھی اس دور کے افسانوں کو جلابخشی اور یوں دنیائے ادب میں اردو افسانے کو سب سے زیادہ موثر صنف کا درجہ ملا۔

۱۹۳۵ء کی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے میں نئے رجحانات پیدا ہوئے اور اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کا فروغ ہوا اور اردو افسانے میں ترقی کے نئے امکانات پیدا ہوئے۔

نئے ادیبوں نے افسانے کو تخیل اور تصور کی رنگین دنیا سے باہر نکالا اور اپنے افسانوں میں سماجی الجھنوں' معاشی تلخیوں اور سیاسی نوعیت کے مختلف پہلوؤں کی بے لاگ مصوری کے علاوہ انھوں نے اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کا ذکر آزادی اور بے باکی سے کیا۔ غلامی' افلاس' جہالت' بھوک' بیکاری' توہم پرستی' طبقاتی جنگ' متوسط طبقے کی کھوکھلی نمائش پسندی' کسانوں کی معاشی لوٹ کھسوٹ' جذباتی اور نفسیاتی الجھنیں' الغرض اس طرح کے بے شمار مسائل اردو افسانے کا موضوع بن گئے۔ یہی وہ ادیب تھے جنھوں نے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا۔ ان افسانہ نگاروں میں کرشن چندر' اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' حیات اللہ انصاری' اختر حسین رائے پوری' اوپندر ناتھ اشک' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں۔

ان میں سے ہر ادیب کے افسانے پر اس کی شخصیت کی چھاپ ہے۔ ہر ایک کا فن دوسرے سے مختلف ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں شاعرانہ انداز تحریر کے باوجود سماجی ناانصافیوں اور طبقاتی جبر پر زور ہے۔ منٹو کی کہانیوں میں نفسیاتی تجزیہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ عصمت متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی الجھنوں کا مطالعہ پیش کرتی ہیں۔ بیدی اور احمد ندیم قاسمی کا موضوع پنجاب کے دیہاتوں کی سیدھی سادی لیکن دکھ بھری جذباتی زندگی ہے۔ الغرض اس وقت کے افسانوں میں موضوع اور فن کے اعتبار سے تنوع اور رنگارنگی ہے۔ یہ ادیب آزادی کے بعد بھی لکھتے رہے اور نئے افسانہ نگار اس قافلے میں شامل ہوتے چلے گئے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کو نئے مسائل کا سامنا ہوا۔ فسادات' ہجرت' مہاجرین اور ان کی آباد کاری اور دوسرے بہت سے مسائل افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بنے۔ ابتدا میں کئی سال تک تقسیم اور

فسادات سے پیدا ہونے والے ہنگامی حالات اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیات کے بارے میں کثرت سے کہانیاں لکھی گئیں۔ پورے برصغیر اور خصوصیت کے ساتھ مشرقی پنجاب میں ہر طرف قتل و غارت گری کے سفاکانہ واقعات دیکھ کر ادیبوں کی روحیں چیخ اٹھیں چنانچہ ان کے احساس کی شدت، تلخی اور جھلاہٹ ان کے افسانوں میں بھی نمایاں ہوئی۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی نے فسادات کے موضوع پر موثر اور فنی اعتبار سے مکمل کہانیاں لکھیں۔ ان میں منٹو کی "موذیل اور ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور بیدی کی "لاجونتی" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد قرۃ العین حیدر، غلام عباس، بلونت سنگھ، شوکت صدیقی اور انتظار حسین نے بھی اپنے سنجیدہ انہماک اور فکر و شعور سے اردو افسانے کو تعمیر و ترقی کی نئی راہوں سے ہم کنار کیا۔ انھوں نے آزادی کے ساتھ اپنے لیے نئے موضوعات اور فن کے نئے اسالیب کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور مشاہدے کی قوت سے اردو افسانے میں جدت، تازگی اور شگفتگی کے نمونے پیش کیے۔ اس کے علاوہ زبان و بیان کی دلآویزی اور تکنیک کی جدت پر بھی خاص توجہ دی گئی اور اس میدان میں نت نئے تجربے کیے گئے۔

ان تمام کوششوں کے نتیجے میں اردو افسانہ آگے بڑھا اور اسے مزید ترقی سے ہم کنار کرنے والے ادیبوں میں ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غلام الثقلین نقوی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، رام لعل، کشمیری لال ذاکر، واجدہ تبسم، امرتا پریتم، اے حمید، وغیرہ کے نام نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سب کی کہانیوں میں انسان دوستی، زندگی کے شعور اور فن کے احترام کا ایک متوازن امتزاج ملتا ہے۔ اپنے تجربات اور مشاہدے پر اعتماد، ذاتی غور و فکر، وسیع مطالعہ اور فنی ریاضت نے ان کے افسانوں میں گہرائی، دلکشی اور پختگی پیدا کر دی ہے۔

ان تمام ادیبوں کی کوششوں سے افسانہ اپنے موضوعات کی وسعت، فکر و نظر کی گہرائی اور فن کے تنوع کے اعتبار سے ایک ترقی یافتہ صنف کہا جاسکتا ہے اور اردو کے بہترین افسانوں کو عالمی ادب کے فن پاروں کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ اس صدی میں جو مقبولیت اور جیسا فروغ اردو افسانے کو حاصل ہوا، نثر کی کسی دوسری صنف کو حاصل نہ ہو سکا۔

آج کی زندگی جس تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے اس سے افسانہ نگار بھی متاثر ہو رہے ہیں اور انھیں لکھنے کے لیے نئے نئے موضوعات فراہم ہو رہے ہیں۔ ان حالات کی روشنی میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ صنفِ ادب مزید ترقی کرے گی۔

——— ○○○ ———

پریم چند
(۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء)

اصل نام دھنپت رائے تھا۔ بنارس کے قریب ایک گاؤں مڑھی پانڈے پور میں پیدا ہوئے ' ابتدائی تعلیم ٹھیک طریقے سے نہ ہو سکی 'لیکن انھیں پڑھنے کا ازحد شوق تھا۔ اپنی کوشش اور لگن سے ابتدا میں گاؤں کے مولوی صاحب سے اردو اور فارسی پڑھی' پھر بنارس میں انگریزی پڑھی اور انٹرنس پاس کر کے ۱۸۹۹ء میں ایک پرائمری سکول میں استاد مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ بقیہ زندگی صحت کی خرابی اور معاش کی دقت میں گزری لیکن تمام عمر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

اردو افسانے اور ناول دونوں ہی میں پریم چند کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری میں حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کو فروغ دیا۔ ان کے افسانے اپنے دور کی سیاسی ' سماجی کشمکش اور معاشی و معاشرتی عوامل کی عکاسی کرتے ہیں لیکن ان میں اصلاحی پہلو نمایاں اور مثالیت حاوی رہتی ہے۔ پریم چند کا موضوع اپنے دور کے دیہات اور شہروں کے نچلے اور درمیانہ طبقے کے کردار اور ان کی زندگیاں ہیں جنھیں وہ اپنے مخصوص نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں۔

پریم چند کا اسلوب بیان سادہ ' پرکشش اور دلکش ہے۔ ان کی زبان یو۔ پی کی بول چال کی زبان ہے۔ پریم چند دیہات اور شہر دونوں طرح کے ماحول اور پس منظر کے بیان پر قادر ہیں لیکن دیہاتی زندگی کی تصویر کشی ان کی خاص خصوصیت ہے۔

پریم چند نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ پریم چند کو اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سے قرار دیا جاتا ہے۔ حب الوطنی اور انسانی زندگی ان کے مخصوص موضوع تھے۔ پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے شائع ہوا جس پر سرکاری عتاب نازل ہوا اور ضبط کر کے جلا دیا گیا۔ دیگر تصانیف میں افسانوں کے مجموعے پریم پچیسی ' پریم بتیسی ' پریم چالیسی ' واردات ' زاد راہ اور ناولوں میں بیوہ 'بازار حسن ' میدان عمل ' نرملا اور گئودان شامل ہیں۔

زیور کا ڈبّا

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے 'اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا' وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی 'مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گذر اوقات

کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی بھی جائداد نہ چھوڑی ' الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر لاد دیا اور عورت بھی ملی تو تعلیم یافتہ ' شوقین ' زبان طرار ' جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرجانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس روپے کی نوکری کرتے شرم تو آتی تھی ' لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ ' ہوادار ' صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا ' لڑکا تو لگ بھگ انہی کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن ' کام چور ' ابھی نویں درجے میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے۔ بلکہ اپنا لڑکا ہی سمجھتے تھے۔ گویا وہ ملازم نہیں ' گھر کا آدمی تھا ' اور گھر کے ہر ایک معاملے میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کا وقت تھا ' پرکاش نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا " ابھی نہ جاؤ بیٹا ' ذرا میرے ساتھ آؤ ' تم سے کچھ کہنا ہے۔"

پرکاش نے دل میں سوچا ' وہ کیا بات ہے ' جو ویراندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی ! پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اوما دیوی نے کہا " تمھاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کر دوں ' ایک بہت اچھے گھر سے پیغام آیا ہے۔" پرکاش نے مسکرا کر کہا " یہ تو ویرو بابو جی سے پوچھیے۔"

" نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا " میں اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ انکا بیسواں سال تو ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

" تو ابھی نہ کروں تمھاری یہی صلاح ہے۔"

" جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں ' میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

" تو کر ڈالوں؟ مجھے ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے ' پھر پچھتانا پڑے گا۔"

" کیوں؟"

" میرے رہتے ہوئے تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمھیں کرنی پڑیں گی، یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے، جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے، پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے، جنھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھ میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار مینیجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔ کہیں محلے کا بنیا اسے گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپیہ آسانی سے اڑا سکتا تھا، لیکن اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے، جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے، اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا۔ "ہم تم یہاں روٹیوں کے محتاج، اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں، جو ہزاروں لاکھوں کا زیور بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ سچ کہتا ہوں، بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔"

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی "اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنھیں ایشور نے دیا ہے، وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔"

چندر پرکاش: یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا، باپ دادا چھوڑ گئے ہیں، مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں ایشور بڑا غیر منصف ہے۔

چمپا: اپنا اپنا مقدر ہے۔ ایشور کا کیا قصور، تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روز مرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے؟ کوئی ڈھنگ کی ساڑھی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی تو جان بچتی۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی۔

"ساڑھی تمہارے لیے ضرور لاؤں گا۔ یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہو گی۔"

چمپا مسکرا کر بولی۔ "چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی۔ گذر ہوتی جائے' یہی بہت ہے۔"

پر کاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پر کاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ "اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں' مجھے اس کی امید نہ تھی۔"

چمپا نے کہا "کوئی اور بات کرو۔ زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔"

"ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔ ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار ہیں۔ یہ نہ ہوا کہ کہتے' اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے بھی لیتے جاؤ۔"

"تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اس میں بچپن کی کیا بات ہے؟ کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔"

"میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا' جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔"

"میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہلِ ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔"

رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آئی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔

یکایک پر کاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اسی عمر میں اس بیچاری

کو ہر چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس کی چھت سے ملی ہوئی تھی، بیچ میں ایک فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا کہ پہلے زینے سے اتر کر کمرے میں چلوں، اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا، کیسا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا، میری چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا، اس لیے میں اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے۔ کسی کو مجھ پر شک نہیں ہو گا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا: "صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے؟" میں صاف نلوہ[1] نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد پھر دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا۔ جس سے کوئی شک نہ گزرے۔

پھر بھی وہ جب زینے سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا "بڑا غضب ہو گیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبا اٹھا کر لے گئے۔"

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا۔ "کسی نے پکڑا چور کو؟"

"کسی کو خبر بھی نہیں۔ وہی ڈبا لے گئے، جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑا لی، اور کیسے انھیں معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبا رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہو گی، باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔"

"تم جا کر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بیچاری رو رہی ہیں ...... تمھارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارہ مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی، اور چور

---

[1] صاف۔

مونڈی کاٹے[1] نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

پرکاش جھٹ پٹ اٹھا اور گھبرایا ہوا سا جاکر ٹھکرائن سے بولا۔ "یہ تو بڑا غضب ہوا ماتاجی! مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔"

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے ''کہیں سینندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ چور آیا کدھر سے؟"

ٹھکرائن نے رو کر کہا۔ "میں تو لٹ گئی بھیا! بیاہ سر پر ہے۔ کیا ہو گا؟ بھگوان! تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی، تب کہیں جاکر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں۔ نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔"

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا "مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے"۔

ٹھکرائن نے مخالفت کی "ارے نہیں بھیا! نوکروں میں ایسا کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یوں ہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔"

ٹھاکر صاحب نے ناک سکیڑ کر کہا "تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جایا کرتا ہے۔ جس نے اب تک چوری نہیں کی، چوری نہ کرے گا، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہو گا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال جرم کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں گے تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرانا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا "تم بھی بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو؟ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زد و کوب بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ مال چلا گیا۔ اب نہ ملے گا۔"

پرکاش: "لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔"

ٹھاکر: "کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو، جو چپکے چپکے پتہ لگا

---

[1] مراد ہے بدمعاش۔

دے تو البتہ مال نکل آئے۔ لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں؟ نصیبوں کو روکر بیٹھ رہو اور کیا؟"

پرکاش : آپ بیٹھ رہیے۔ لیکن میں تو بیٹھنے والا نہیں۔ میں انہی نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔"

ٹھکرائن : "نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو بھی مجھے یہی خیال رہے گا کہ کسی باہر کے آدمی کا کیا ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو' پر چور آیا باہر سے۔ تمھارے کوٹھے سے بھی تو آسکتا ہے۔"

ٹھاکر : "ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو۔ شاید کچھ نشان ہو۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟"

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا "میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں' کوئی پہلے ہی موقع پاکر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔"

تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے۔ جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا' وہاں کا چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جاکر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ "اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔"

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا؟ مال تو جانا تھا' وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپے کی کوئی تجویز کرنی ہوگی۔"

پرکاش : "میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

ٹھاکر : "کیوں اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔"

پرکاش : "آپ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آگئی۔ میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانے میں بیٹھی ہے' ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا' کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا رستہ بند ہی ہو جانا

چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر پر ہے۔"

ٹھکرائن ڈریں۔ "تم جاؤ گے بھیا! تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا۔"

پرکاش: "کچھ بھی ہو ماتا جی! مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہوگئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔"

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا "بڑا لائق آدمی ہے۔ چور ادھر سے آیا۔ یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے، تو کچا ہی کھا جائے۔"

"مار ہی ڈالے۔"

"دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا۔"

"اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا۔ کتنا ہی سمجھاؤ۔"

"کرائے کے بیس روپے دینے پڑیں گے۔"

"ہم کیوں کرایہ دیں۔ وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں۔ ہم تو کچھ کہتے نہیں۔"

"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا۔ ایسے آدمی کے لیے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا"۔

"میں تو سمجھتی ہوں وہ کرایہ لیں گے ہی نہیں۔"

"تیس روپے میں گزر بھی تو نہ ہوگی۔"

(۵)

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا، اس گھر میں رہنے سے خدشہ تھا، لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا "ایک سیٹھ کے ہاں ۵۰ روپے ماہوار کا کام مل گیا ہے، مگر وہ روپے میں ان ہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہوگی۔ اس میں ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا"۔

خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ دیوتاؤں میں اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا، وہ چمپا کا تھا۔

چمپاہی کے پاس اس کے ٹرنک ، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا۔ اس کی چابی کہاں ہے ؟ اس کا چمپا کو پتہ نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں "کچھ نہیں پرانی کتابیں ماری ماری پھرتی تھیں ، اٹھاکر صندوق میں بند کر دی ہیں۔" چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ شبہے کا اکھوا سا نکلا ، مگر پانی نہ پا کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی ، جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر سے آتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی۔ اس دن سے پرکاش کمرے ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینا تھا گرمی کے مارے دم گھٹتا۔ چمپا نے کئی بار باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے ؟

چمپا نے کہا "چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔ چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے ؟"

پرکاش نے غصے سے کہا "کچھ نہیں ہے ، برتن تو ہیں۔ غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔"

ایک دن چمپا نے کمرے میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا "صندوق تم نے ہٹایا تھا۔"

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی ، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی "میں کیوں ہٹانے لگی۔"

"پھر کس نے ہٹایا ؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"گھر میں تم رہتی ہو ، جانے کون ؟"

ا۔ نیا پودا۔

"اچھا! اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں یوں ہی پوچھا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں نہ دیکھ لیں، پرکاش کو چین کہاں، چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی، وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں۔ پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر بہلانے کے لیے بولا :

"طشتری میں کیا لائیں ؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا پکوڑیاں ہیں؟"

آج چمپا کے دل میں شبے کا وہ اکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے، یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ چابی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خریدی اور صندوق کھول ڈالا۔ "ارے، یہ تو زیور ہیں۔" اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا۔ "یہ کہاں سے آئے؟ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔" معاً اس کے دل میں خیال گزرا، یہ زیور ٹھاکر صاحب کے تو نہیں؟" چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے یک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ "ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری زیوروں کے لیے؟ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟"

(۶)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے اسے وہ محبت نہ رہی، نہ وہ عزت کا جذبہ۔ بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ تب دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے تھے، مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ مینجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکوشنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟

پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا: "تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟"

پرکاش نے سر جھکا لیا۔ "دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں؟"

"اجی درخواست تو دو، اگر سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کا فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا۔ "آپ نقد ضمانت داخل کر دیں گے؟"

"ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی ندامت ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینے پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک منٹ بعد بولی:

"ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی۔ جگہ نہ ملتی نہ سہی، روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔"

"یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں۔"

چمپا نے کہا۔ "آدمی کی نیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔"

پرکاش سناٹے میں آگیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا۔ مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا

اداس رہنا اسے کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے؟ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی بند کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پر کاش نے چمپا سے پوچھا ''تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟'' جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا ''کچھ نہیں، میں نے دنیا کی بات کی تھی۔''

پر کاش کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

''کیا جتنے آدمی بینک میں ملازم ہیں، ان کی نیت بدلتی رہتی ہے؟''

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا ''تم تو زبان پکڑتے ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے، سو دو سو روپے کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔''

پر کاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا، مسکرا کر بولا۔ ''اچھا تمہارا اشارہ اس طرف تھا۔ لیکن میں نے کمیشن کے سوا ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔''

چمپا نے نفرت کے لہجے میں کہا ''جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے، اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی لینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ تمہاری شرافت تو جب جانتی تم کمیشن کے روپے لے جا کر انکے حوالے کر دیتے۔ ان چھ مہینوں میں انھوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے۔ کچھ یاد ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ ۲۰ روپے ماہوار دیے جاتے ہیں۔ علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے۔ تمہارے لیے ضرور بھیجتے ہیں۔ تمہارے پاس گھڑی نہ تھی۔ اپنی گھڑی تمہیں دے دی۔ تمہاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے؟ اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی دیتا نہیں، تمہاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیے۔ اسے تم چھوٹی سی بات سمجھتے ہو؟ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے' یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے' جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے' جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا' اکٹھا ہو کر نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے۔ تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے' افسوس! چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطے پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

(۷)

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب' ان کی اہلیہ' ویرا اندر اور اس کی نئی دلھن بھی آئے ہوئے ہیں۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا "آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا دادا! میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔"

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں' بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے' ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے' اور پرکاش باہر برآمدے میں۔ تین عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر صندوق میں سے زیورات کا ڈبا نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا ڈر تھا' آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا' حرارت' اضطراب اور خلش سے پُر' اب بخار کا اتار تھا' سکون' فرحت اور اُمنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا۔ آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویراندر کا کمرہ کھولا اور اندر جاکر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبا رکھ دیا۔ پھر فوراً باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ آیا۔ ہنومان جی [1] سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے، ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی، گویا کہ کسی گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبے کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش رات کو پڑھانے جایا کرتا تھا آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا، وہاں آج کیا گل کِھلتا ہے۔

ویراندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا "بابو جی! کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی، جو زیور چوری ہو گئے تھے، سب مل گئے۔"

ٹھاکر صاحب بھی آگئے اور بولے "بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری، پورے کا پورا ڈبا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی، جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔"

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے، جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبا کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا "تعجب کی بات ہے میری عقل تو کام نہیں کرتی۔"

ٹھاکر: "کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی! تمہاری ہی کیوں، ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا ہے۔"

پرکاش: "اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔"

---

[1] ہندو دیو مالا کا کردار جس کی شکل بندر کی طرح تھی۔

ٹھاکر : "آج اسی خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔"

پرکاش : "آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے۔"

ٹھاکر : "کئی پنڈتوں سے۔"

پرکاش : "تو بس اس کی برکت ہے۔"

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا "آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔"

"میں ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔"

"تم تو سیکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔"

"مجھے تو اتنی خوشی ہوئی ہے کہ لاکھوں خرچ کرنے سے بھی ارمان پورا نہ ہو گا۔"

پرکاش کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

(زادِ راہ)

سوالات

۱۔ مختصر افسانہ انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کو ہی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو اپنی حد تک مکمل ہونا چاہیے۔ زیرِ نظر افسانے کو سامنے رکھ کر اس پر بحث کریں۔

۲۔ پریم چند کے کردار حقیقت پسندی کے باوجود مثالی ہوتے ہیں۔ کیا پرکاش، چمپا اور ٹھاکر کے کردار اس کی گواہی دیتے ہیں۔ بحث کریں۔

۳۔ "زیور کا ڈبا" افسانے کا اصل موضوع کیا ہے۔ زیور کا ڈبا یا پرکاش اور چمپا کا باہمی تعلق؟

۴۔ اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

—— ○○○ ——

قدرت اللہ شہاب

(۱۹۲۰ء - ۱۹۸۶ء)

موضع چمکور صاحب ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ تھا اور وہ مہاراجہ کشمیر کی ملازمت میں تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ ریاست جموں و کشمیر کے مختلف مقامات پر تعینات رہے جس کی وجہ سے شہاب صاحب کو بھی اپنی ابتدائی زندگی ریاست جموں و کشمیر کے مختلف مقامات پر گزارنے کا موقع ملا۔ قدرت اللہ شہاب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جموں کے پرنس آف ویلز کالج سے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شرکت کی اور کامیاب ہوئے۔ ملازمت کا زمانہ مختلف مقامات پر گزارا۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ جنرل ایوب خاں کے عہد میں ان کے سیکرٹری رہے۔ جنرل یحییٰ خاں کے عہد میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ بقیہ زندگی روحانی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں بسر کی۔

قدرت اللہ شہاب کو شروع سے ہی علم و ادب سے دلچسپی تھی اور اپنے فرائض منصبی کے دوران میں بھی ادب کے فروغ اور لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے۔ ان کی تصنیفات میں "یا خدا" ' "نفسانے" ' "ماں جی" ' "سرخ فیتہ" اور شہاب نامہ' شامل ہیں۔ "یا خدا" تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا طویل مختصر افسانہ ہے جسے ناولٹ بھی کہا گیا ہے۔ "شہاب نامہ" ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔

شہاب صاحب کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ ' رنگین اور دلچسپ ہے۔ وہ ان ادیبوں میں شامل ہیں جو اپنی عبارت کو پُر اثر ' رنگین اور دل نشین بنانے کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی دقت نظر وہ موضوع کو منتخب کرنے ' اسے ترتیب دینے اور اس کو بہترین انداز میں پیش کرنے میں بھی صرف کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت میں جھول ' اور رواروی نہیں ہوتی بلکہ زبان و بیان دونوں ہی کے اعتبار سے باربط اور بامعنیٰ ہوتی ہے۔ ان کی زبان سادہ ' سلیس اور شستہ ہے۔ "شہاب نامہ" ایک ایسی خود نوشت سوانح ہے جو انھوں نے بڑی محنت اور توجہ سے لکھی ہے۔ "ماں جی" ان کی ایسی کہانی ہے جو ہمارے سامنے ایک جیتے جاگتے کردار کا مرقع پیش کرتی ہے۔

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور[۱] کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور ' جھنگ ' سرگودھا کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ فیصل آباد کا پرانا نام

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلا نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبرو شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ "بار" میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی' دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی' اس لیے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش یا دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں' جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے قریب ان کی عمر کوئی اُسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے' دس روپے یا پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا

تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب بھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے، چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور، اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتیں۔ ایک زیبِ تن، دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بُکّل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفرِ آخرت بھی انھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ پہلے کپڑے دھو کر اپنے تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں، اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں، کہ "اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے....."

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے کھا تو لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضروری پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر

دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں' سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انھوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انھیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خرد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سرِراہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا' ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹ منٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لُو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹا بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اسی طرح وہ چلتے چلتے چک ۵۰۷ میں پہنچے۔ جہاں جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے، نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں، ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارا کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت سے کچی انبیاں گری مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریے اور کُلفے کا مِلا جُلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولھے پر چڑھایا جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو اَلن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہ کر چولھے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولھے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آباد کاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سالوں میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گذارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلا کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشا دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک آشوبِ چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں میں فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انھیں مجبوراً ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گذرا۔

منیلا پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیے۔

دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لیے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی انھیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلھنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ''ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گذرتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جارہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔''

''ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھتے۔

''توبہ توبہ پت'' ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں۔ ''میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی۔''

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی۔ اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی' عربی' فلسفہ اور حساب کے لکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جاکر آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو "بلائے ناگہانی" سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا' بجھایا' ڈرایا' دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ لکا سا جواب سن کر سرسید صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انھوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں' مکوں' تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ "اب تم ایسی جگہ جاکر مرو' جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سن سکوں۔"

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت نے دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلھن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر انھیں پانچ پانچ روپے پیش کیے لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟" عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

"اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلواؤں گی۔" ماں جی نے جواب دیا۔ زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ' وسیع باغ' نوکر چاکر' دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی' انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انھوں نے فراک پہنے ہوئے تھے۔ اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا۔

"تمھاری عمر تو جیسی گذرنی تھی گذر گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا' سینا پرونا' برتن مانجھنا' کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا "مسٹر گورنر' جس خانساماں نے

یہ کھانے پکائے ہیں براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔ ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا "اگر لارڈ پھر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں" ماں جی تنک کر بولیں۔ "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈراما کیا "میں ان کی مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا، جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا۔"

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار ——— ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام سے جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا "بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی۔ "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر

لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آپڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہ تک پہنچے تو وہ دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیرِ وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" مہارانی نے کہا۔ "کبھی ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔"

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالمِ شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھری چارپائی پر حسبِ معمول گاؤ تکیہ لگائے نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنّا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنّا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے "بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت

نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلھن کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بہت سے خیال امڈ آئے "ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی سے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمھارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمھیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔"

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لیے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا' ہلایا' چمکارا' لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا کر تلقین کی "بچہ' رونا مت۔ تمھارے ابا جس آرام سے رہے تھے' اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا' ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انھیں ایک الہڑ دلھن سمجھا اور جس نے "گورنری" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں' جو قیامت تک انھیں عقیدت کے بیابان میں سرگردان رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا مُلّا پریشان ہے کہ مسجد کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے' لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا

ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے' اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

(ماں جی)

سوالات

ا۔ اس مضمون کے حوالے سے ماں جی کی سادگی طبع اور معمولات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
۲۔ ماں جی کی اپنی ذات کے لیے کون سی اکلوتی خواہش تھی؟ کیا وہ پوری ہوئی؟ اگر ہوئی تو کس طرح؟
۳۔ ماں جی کو لفظ "گورنری" سے کیا غلط فہمی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟
۴۔ اس افسانے کا خلاصہ بیان کیجیے۔
۵۔ کیا زیر نظر اقتباس "ماں جی" مختصر افسانے کے معیار پر پورا اترتا ہے؟ تجزیہ کریں۔
٦۔ بحث کریں کہ "ماں جی" تکنیک کے لحاظ سے مختصر افسانے سے کس طرح مماثل اور مختلف ہے۔

—— ○○○ ——
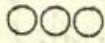
مسعود مفتی

(ولادت ۱۹۳۴)

اصل نام مفتی مسعودالرحمان ہے۔ گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی میں لاہور سے ایم۔اے کیا۔ بعد ازاں انٹرنیشنل افیرز اور جرنلزم کی تعلیم بھی حاصل کی اور پاکستان سول سروس میں شامل ہو گئے۔ مختلف مقامات اور عہدوں پر کام کرتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں بطور سیکرٹری تعلیم تعینات ہوئے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت ہوٹل انٹرکونٹیننٹل میں پناہ گزین تھے کہ گرفتار ہوئے اور دو سال بطور جنگی قیدی بھارت میں رہے۔ ۱۹۷۳ء میں واپس پاکستان لوٹے اور ۱۹۷۴ء میں اپنی اس عہد کی سرگزشت کو "چہرے" کے نام سے شائع کیا جس پر آدم جی ادبی انعام بھی ملا۔

مسعود مفتی نے لکھنے کا سلسلہ ہلکے پھلکے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے شروع کیا تھا جن کا مجموعہ "سرراہے" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک ناولٹ "کھلونے" اور افسانوں کا مجموعہ "محدب عدسے" اور "رگ سنگ" شائع ہوئے۔

مسعود مفتی کے افسانوں میں معاصر زندگی اور ان کے ماحول کی نہایت اثر انگیز جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ اپنے وسیع تجربے کے دوران میں حاصل ہونے والے واقعات کو نہایت مہارت سے کہانی کا رنگ دے کر بیان کرتے ہیں اور اس کو اپنے ماحول اور جانے پہچانے کرداروں سے سجاتے ہیں۔ انسانی کردار کے تاریک اور روشن پہلو اور حب الوطنی اور انسان دوستی ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ ان کا یہی انداز ان کے افسانے "تعبیر" میں جھلکتا ہے جو خواب اور حقیقت کے درمیان وسیع خلیج کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی زبان سادہ اور انداز بیان رواں، سلیس اور دلکش ہے۔ وہ بیانیہ انداز اختیار کرتے ہیں اور افسانے کو ایک اچانک اور چونکا دینے والا موڑ دے کر ختم کرتے ہیں۔

تعبیر

بعض شامیں اداس ہوتی ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے فضا بے کیف لگتی ہے۔ آسماں کوسوں دور نظر آتا ہے۔ ہوائیں نیند سے جاگی ہوئی بلی کی طرح بیزاری سے بوجھل ہوتی ہیں۔ عمارتیں، درخت، چرند پرند پسینے سے بھیگے ہوئے خط کی طرح دھندلائے ہوئے ہیں۔ دماغ کند ہوتا ہے۔ دل خالی سنیما ہال کی طرح ویران لگتا ہے اور زندگی بالکل بے مقصد لگتی ہے۔

قدرت نے انسان کی طبیعت کے ساتھ کئی مذاق کیے ہیں، مگر ایسی شام سب سے بھونڈا مذاق ہے۔ اچھی بھلی بھرپور زندگی کے کھلاڑی بھی خلا کی وسعت میں کھویا ہوا تنکا بن جاتے ہیں۔

ایسے میں ٹیلی فون خاموش ہو، اخبار پڑھ چکے ہوں، ملنے ملانے والے اپنے

پروگراموں میں مصروف ہوں ' ریڈیو پر پکے گانے ختم ہی نہ ہوں اور ٹیلی وژن پر بے کیف پروگرام ہو تو اور بھی ستم ہے۔

ایک ایسی ہی شام کو جب کپڑے پھاڑ کر جنگل میں بھاگ جانے کی ہمت نہ پڑی تو بیوی کو ساتھ لے کر سیر کو نکل پڑا۔

لیکن کوفت تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہی سڑکیں ' وہی کھمبے ' کم و بیش وہی چہرے یا ان ہی کی طرح دوسرے بے جان درشن۔

اچانک ایک خیال سوجھا۔ اقبال پارک میں مینار پاکستان کا ذکر کئی دنوں سے اخبارات کی عادت بنا ہوا ہے۔ لگے ہاتھوں وہی دیکھ آئیں۔ بلا سے کچھ تو نیا ہو گا۔

نئے خیال کی بیوی بھی فوراً ہامی بن جائے تو سمجھیے قسمت ساز گار ہے۔ چنانچہ گیراج سے گاڑی نکالی اور شاہی مسجد کی طرف ہو لیے۔ سوچا وہاں جا کر گاڑی ایک طرف لگا دیں گے اور نئے پارک میں گھومیں گے۔

ٹریفک کے ریلے کو مردانہ وار سہتے ہوئے جب منزل کے قریب پہنچے تو رکنا پڑا۔ کیونکہ اندر جانے کا راستہ ابھی نامکمل تھا اور اس پر اینٹ ' پتھر ' روڑے پڑے تھے۔ گاڑی سے نیچے اتر کر ہم لوگ ادھر ادھر گھوم کر کوئی راستہ تلاش کرنے لگے جہاں سے گاڑی اندر جاتی ہو۔ مگر نیچے اترتے ہی بھینسوں کے نرغے میں پھنس گئے۔

کالی بھینسیں آپس میں سمٹ سمٹ کر سڑک پار کر رہی تھیں۔ ادھر ادھر بے صبر ڈرائیور ہارن بجا رہے تھے یا ایکسی لیٹر دے دے کر انجنوں کی زبانی اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔

پیدل چلنے والوں کے پاس سے بھینسیں گزرتیں تو ان میں سے کوئی دُم کھینچ دیتا ' کوئی سینگ مروڑ دیتا اور کوئی کمر میں گھونسا مار دیتا۔

سڑک کے دونوں طرف ٹریفک رک گئی۔

ہارن زور زور سے بج رہے تھے۔ بھینسیں بے نیازی سے گزر رہی تھیں۔ گردن اٹھاتی ' جھکاتی ' ایک دوسرے کی دُم سونگھتی اور کہیں کہیں گوبر سے مُہر لگاتی ہوئی دھکم پیل کر رہی تھیں۔

اتنے میں ایک ٹرک ازدحام کو توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے پیچھے دو ایک گاڑیاں لپکیں۔ ایک آدھ نے مخالف سمت سے کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھی سڑک پر ٹریفک کا

سیلاب چل پڑا۔

زیادہ تر بھینسیں گزر گئی تھیں۔ اس کے بعد آدھی سڑک پر ٹریفک کا ریلا بہنے لگا۔ ان کی وجہ سے بڑی سفید کار رکی کھڑی تھی۔

اس کار کے پیچھے اس طرح گاڑیاں تھیں کہ وہ پیچھے ہٹ کر پرلی آدھی سڑک پر چلنے والی ٹریفک میں شامل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے کار والا کھڑکی سے سر نکال کر گوالے کو زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ جو حیران ہو کر ٹریفک کے طوفان کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ گزر جانے والی بھینسیں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ اس لیے وہ پریشان بھی تھا۔ کار والا بے نقط گالیاں دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے بہت بھونڈا میک اُپ کر رکھا تھا اور بہت بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔

ہمارا تین سالہ بچہ بو میری انگلی پکڑے خوش ہو کر بھینسوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار بھینسوں کو مارنے کے لیے جھک کر ایک کنکری اٹھاتا اور بھینسوں کو مارنے کے لیے زور سے ہاتھ چلاتا۔ مگر کنکری ہاتھ چلنے سے پہلے ہی کہیں گر جاتی، کبھی پیچھے، کبھی پہلو پر۔

ایک بھینس نے گردن گھما کر لال لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو میری ٹانگوں میں دبک گیا۔

ہم اس انتظار میں تھے کہ بھینسیں ہٹ جائیں اور ہم اطمینان سے آگے بڑھیں۔ کار والا گالیاں دے رہا تھا اور گوالا ایک بھینس کی دُم پکڑے باقیوں کو ٹٹکار رہا تھا۔ مگر اس کی کوشش کے باوجود وہ سب مل کر ایک دیوار کی شکل میں کھڑی تھیں۔

سفید کار والا بے تاب ہو گیا۔ بے صبری سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور مکوں اور گھونسوں سے گوالے کو مارنے لگا۔

"یہ سڑک تمہارے باپ کی ہے جو سب کو روک کر کھڑے ہو۔"

گوالے نے بازوؤں سے وار روکتے ہوئے حملہ آور کا جائزہ لیا' وہ ادھیڑ عمر کا مرد تھا مگر ڈیل ڈول کا اچھا تھا۔ چہرہ خشمگین تھا اور جس اعتماد اور اتھارٹی سے وہ مار رہا تھا اس سے گوالے کی آنکھیں بجھنے لگیں۔ ویسے تو گوالا بھی جسم کا بہت تگڑا تھا اور ایک ہی ہاتھ میں پٹخنی دے

سکتا تھا مگر مخالف کے جائزے سے اس کے چہرے پر واضح خوف ابھرا کہ مقابلہ کرنا حماقت ہو گی۔ کل کلاں کو مصیبت پڑے گی۔ اس لیے وہ سر نہوڑا کر کہنیوں سے اپنا چہرہ بچاتا رہا اور دونوں بازو اپنے سر کے گرد لپیٹتا رہا۔

اس آدمی نے بالآخر پاؤں کی ٹھوکر زور سے ماری اور ساتھ ہی دھکا بھی دیا اور گوالا لڑکھڑا کر زمین پر گرا جہاں بھینس نے ابھی گوبر کیا تھا۔ اور اس میں لت پت ہو گیا۔

ایک بھینس گڑبڑا کر آگے بڑھی تو ٹرک کی بریکیں چیخ کر جم گئیں۔ ساری ٹریفک رک گئی اور باقی مویشی پھر چل دیے۔

یہ دیکھ کر کار والا واپس مڑا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بلند آواز سے احتجاج کر رہا تھا۔

"نہ معلوم کتنا فضول ملک ہے ہمارا۔ قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ زندگی جہنم بنا دی ہے بلکہ جہنم بھی اس سے بہتر ہو گا۔"

کار کا سیلف چھینکا۔ انجن غرا کر سٹارٹ ہوا۔ اس نے زور سے ایکسی لیٹر دبایا اور گاڑی دھچکے سے شور کرتی اچھل کر آگے بڑھی۔

میں یہ سارا واقعہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اب راستہ کھلا پا کر آگے چلنے لگا تو چونکا۔ بو میرے پاس نہ تھا۔

گھبرا کر نظر دوڑائی تو وہ چند قدم دور ایک بوڑھے آدمی کے پیچھے کھڑا اس کا کرتہ کھینچ رہا تھا۔ مگر بوڑھا اس سے بالکل بے خبر سفید کار کو گھور رہا تھا جو اب بھیڑ میں مدغم ہو رہی تھی ----- جب ذرا دور گئی تو بوڑھا ایڑیاں اٹھا کر دیکھتا رہا۔

بو پیچھے کھڑا اس کا کرتہ کھینچ رہا تھا اور چلّا رہا تھا۔ "چنے دو، چنے دو-----"

میری بیوی آگے بڑھی اور بو کو ایک دم اٹھا لیا۔

بوڑھا اس ساری چیز سے بے خبر محویت کے عالم میں کار کو دیکھ رہا تھا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہونے لگی تو چند قدم دوڑ کر بجلی کے کھمبے کے چبوترے پر چڑھ کر کار کو دیکھنے لگا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کی پشت پر ایک ٹین لٹکا ہوا تھا جس کے ایک طرف شیشہ ہونے کی وجہ سے بُھنے ہوئے کھٹّے چنے دکھائی دے رہے تھے۔

بو اب چنوں کی طرف ہاتھ کر کے رو رہا تھا اور اس کا چہرہ الٹے سیدھے نقوش بنا رہا تھا۔

اتنے میں مجھے ایک محفوظ جگہ نظر آئی جہاں سے کار ذرا اندر کو جا سکتی تھی۔ میں بچے کو اٹھا کر کار کی طرف گیا۔ بہلانے کے لیے سٹیرنگ اس کے ہاتھ میں دیا اور پھر گاڑی اندر کی طرف لے گیا۔

مینارِ پاکستان کی بلند لاٹ پُرشکوہ انداز میں نیلے افق کے مقابل کھڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف سبزہ زار تھا۔ ہم روشوں پر ٹہلنے لگے۔ بچہ کبھی بھاگ کر آگے نکل جاتا اور ہمیں آواز دے کر اسے روکنا پڑتا۔ کبھی پیچھے رہ جاتا تو ہم رک کر انتظار کرتے۔ وہ کبھی کسی کیڑے کے پیچھے بھاگتا۔ کبھی گول پتھر تلاش کرنے لگتا اور کبھی پھولوں کی شامت لے آتا۔

چیخ چیخ۔ بو نہ کرو سارے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ ماں اسے بار بار تنبیہہ کرتی مگر ....

وہ ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری کی طرف مائل ہو جاتا۔

گھومتے گھماتے ہم مینار تک پہنچ گئے۔

"امی چنے لینے ہیں۔" بو ماں سے چمٹ کر ٹھنکنے لگا۔

"بیٹا وہ تو پیچھے رہ گیا۔" میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں وہ تو ادھر بیٹھا ہے۔" بو مجھے انگلی سے گھسیٹتے ہوئے بولا۔

اور وہ واقعی ایک پودے کی آڑ میں بیٹھا تھا۔

میری بیوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کیا کہ چنے نہ لینے دوں۔

بو کو کھانسی آ رہی ہے۔ اس نے گلے پر ہاتھ لگا کر سرگوشی کی۔

مگر بو مچل گیا۔ میں چنے لوں گا۔

میرا ہاتھ تھپڑ مارنے کو اٹھا مگر اسی وقت میری نظر چنوں والے بوڑھے پر پڑی۔ وہ بڑی ہی پُر امید نظروں سے بچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ بِکری ضرور ہو گی۔

میرا ہاتھ وہیں رک گیا پھر خود ہی اس تک پہنچ گیا۔

بو اچھلتا کودتا مجھ سے آن چمٹا۔ میری بیوی بھی منہ میں احتجاج کرتی ہوئی مجھ تک پہنچ گئی اور احتجاج ہی احتجاج میں ہم نے ڈھیر سارے چنے لے لیے، کچھ بو کے لیے کچھ اپنے لیے۔

پہلا ہاتھ منہ میں ڈالتے ہی شام کی ساری بیزاری غائب ہو گئی۔ ہمیں کوئی چیز تو نئی مل گئی تھی۔

چنے کھاتے ہوئے ہم ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور دنیا نسبتاً سہانی لگ رہی تھی۔

"چنے بڑے مزے دار ہیں۔" میری بیوی چٹخارے لیتے ہوئے بولی۔

"دل چاہتا ہے روز آ کر کھائیں۔"

بوڑھا اِکّادُکّا دانت دکھاتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"بی بی روز کھایا کرو۔ میں تو ہر روز یہاں بیٹھتا ہوں۔ پورے دو سال سے کوئی شام ناغہ نہیں کی۔"

"کیوں تمھیں اور کوئی بارونق جگہ نہیں ملی؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے انارکلی میں بیچتا تھا۔ جب سے مینار پر کام شروع ہوا ہے، سب کچھ اٹھا کر ادھر آ بیٹھا ہوں۔ اب تو ادھر سے ہی گور میں جائیں تو اچھا ہے۔"

میری بیوی نے شرارت سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی:

"ایسی کون سی دل لگانے والی بات ہے یہاں؟"

دو تین بچے بھاگتے ہوئے آئے۔

"بابا دو آنے کے چنے دو۔"

"میرے ہاتھ میں دینا۔"

"نہیں امی نے پیسے میرے ہاتھ میں دیے تھے۔ مجھے دینا۔"

"تم دونوں گندے ہو، میں خود لوں گا۔"

جب تک بوڑھا چنے نکالتا رہا۔ وہ آپس میں لڑتے رہے۔ بو دو انگلیاں منہ میں ڈالے دلچسپی سے ان کو دیکھتا رہا۔ کبھی آدھا قدم آگے کرتا پھر جھجک کر واپس کر لیتا اور شرما کر میری طرف

دیکھتا۔

بوڑھے نے مسکراتے مسکراتے دو تین پڑیاں بنا ڈالیں۔ پھر سب سے چھوٹے بچے کے گال پر ہاتھ سے پیار کر کے ایک پڑیا دے دی۔ "یہ تمہارا حصہ ہے، بیٹے ——— اور پھر دوسرے کو پڑیا دیتے ہوئے بولا ——— "یہ تمہارا ——— اور ——— یہ تمہارا۔"

تینوں خوشی خوشی اچھلتے کودتے اپنی اپنی پڑیا والا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بھاگ گئے۔ بوڑھا مسکرا کر ان کو دیکھتا رہا۔

"یہاں سب کچھ ہے بی بی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ میاں" وہ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "میں نے اپنے بچے کھوئے ہیں اور اس مقام پر تمنا پائی ہے۔"

بوڑھے کی طبیعت میں شگفتگی اور پیار تھا، بات چیت میں شائستگی تھی اور آواز میں دکھ رچا تھا۔ اس سے میری دلچسپی اور بڑھی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کہوں کہ میری بیوی کہنے لگی :

"تمنا کون سی بابا۔ تمہاری روزی یہاں مل جاتی ہے۔"

"بی بی جس چیز کے لیے اپنے معصوم بچے کٹائے وہ سامنے نظر آئے تو تمنا ہی ہے۔"

"اوہو۔ تمہارے بچوں کو کوئی نقصان پہنچا تھا۔ بابا؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"صاحب چھوڑیے ان باتوں کو" اس نے دکھ سے کہا اور بات ٹالنے کو ترازو سے کھیلنے لگا۔ لیکن پھر جیسے ضبط نہ کر سکنے کے باعث ابل پڑا :

"میرے بھی دو اتنے ہی بچے تھے صاب، جیسے ابھی اچھلتے کودتے چنے لینے آئے تھے۔ پاکستان سے پہلے جب اردگرد جلسے جلوسوں کو دیکھتے تو اپنی توتلی زبانوں سے "لے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگایا کرتے تھے، لیکن جب پاکستان بنا تو --------- تو ----- وہ میری آنکھوں کے سامنے ذبح ہوئے ---- اور میری جوان بیوی دیکھتے ہی دیکھتے کنویں میں چھلانگ لگا گئی تا کہ اپنی عزت بچا سکے ----"

"یہ کہاں کا واقعہ ہے بابا؟"

"کہاں کا نہیں ہے بی بی۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ یہ سنانے والا۔ آپ تو ان دنوں چھوٹی ہوں گی لیکن ادھر سے آنے والا ہر آدمی یہی کچھ سناتا۔ ہم تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ سب کچھ دے کر بھی پاکستان مل گیا۔"

"پھر بھی تم کس شہر کے تھے بابا؟"

"گورداسپور کا بی بی"

میری بیوی چونکی۔ کیونکہ اس کے والد بھی وہیں رہتے تھے۔ جب پاکستان بننے پر وہ ادھر آئے تو یہ بمشکل پانچ برس کی تھی۔

"تو کیا تمھاری ٹرین پر حملہ ہوا تھا؟"

"نہ بی بی۔ میرے پیچھے ہندو ایک عرصہ سے پڑے تھے۔ میں مسلم لیگ میں بڑے زور شور سے حصہ لیتا تھا۔ اس لیے میرے مکان پر انھوں نے باقاعدہ دھاوا بولا' وہ بھی اس وقت جب میں گھر میں نہ تھا۔ میں ہوتا تو سب کچھ بچا کر لے آتا یا خود بھی ختم ہو جاتا۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ سب کچھ تمھارے سامنے ہوا؟"

"میں اپنے مکان سے تھوڑی دور ایک اور مکان کی چھت سے دیکھ رہا تھا' بیٹی۔ وہاں ہم سارے مسلم لیگی کارکن پروگرام بنا رہے تھے کہ بچوں کو کس طرح نکال کر لاہور لے جائیں کہ اچانک شور کی آواز آئی۔ ہم نے چھت سے دیکھا تو میرے مکان پر بھرپور حملہ تھا۔ بلوائیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور اندر باہر گھوم رہے تھے۔ وہ پکار پکار کر مجھے للکار رہے تھے۔ میں نہ ملا تو اندر سے میرے دونوں بچوں کو پکڑ لائے اور سڑک پر ڈال کر ذبح کر دیے اور پھر میں نے دیکھا کہ چند لوگ میری بیوی کا تعاقب کر رہے تھے جو مکان کی پچھلی طرف سے بھاگ کر آئی تھی۔ وہ سیدھی کنویں کی طرف گئی اور اس میں کود گئی۔"

"مگر تم مدد کو کیوں نہ گئے بابا؟"

"میں تو مچلتا رہا مگر ساتھیوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ جانے ہی نہ دیتے تھے۔ پھر قریشی صاحب نیچے سے بندوقیں لے آئے اور انھوں نے بلوائیوں پر تابڑ توڑ فائر کیے مگر اس وقت تک میرا گھر برباد ہو چکا تھا۔

"کاش میں تھوڑی دیر پہلے احمد بخش قریشی کے گھر میٹنگ میں نہ گیا ہوتا۔" بوڑھے کی

آنکھیں چھلکنے لگیں۔

ہم دونوں جیسے بجلی کے تار کا جھٹکا لگنے سے چونک اٹھے ـــــ احمد بخش قریشی میری بیوی کے والد تھے۔

"بابا تم کس مکان میں رہتے تھے۔" میری بیوی تقریباً چیخی۔

"گورنمنٹ کالج کے ساتھ والے مکان میں۔ کالج کی اور ہماری ایک ہی دیوار تھی"۔

"مگر وہاں تو ـــــ وہاں تو بابا ـــــ نواب سعادت خان رہتے تھے۔"

بوڑھے نے آنکھیں پونچھیں ـــــ بڑے درد سے مسکرایا ـــــ اور نظریں چراتے ہوئے کہنے لگا:

"نواب زادہ سعادت خان میں ہی ہوں، بیٹی"

ہم لوگ سکتے میں آگئے۔

پچھلے چند سالوں میں، میں اپنے سسر سے ان دنوں کے اکثر قصے سن چکا تھا جب ریڈ کلف ایوارڈ کے بعد گورداسپور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان قصوں میں اکثر نواب زادہ سعادت خان کا نام آتا تھا جو بڑے پُرجوش مسلم لیگی رکن تھے اور اپنے علاقہ میں تحریکِ پاکستان کی روح رواں تھے۔ جو کہانی اس نے سنائی تھی، مِن و عَن وہی کہانی اپنے خسر سے سن چکا تھا اس لیے فوراً ہی یقین آگیا۔

"بابا یہ احمد بخش قریشی کی لڑکی ہیں" میں نے بیوی کی طرف اشارہ کیا ـــــ میرا خیال تھا یہ سن کر وہ کھل جائے گا، اس کے سر پر پیار دے گا، پچھلی باتیں کرے گا۔ مگر اس کا ردِ عمل بالکل رُوکھا تھا۔ اس نے صرف ایک دفعہ غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولا:

"ہاں نقش تو ملتے ہیں۔"

اور پھر خاموش ہو گیا۔

میری بیوی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بابا آیئے آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ میں آپ کو ابا سے ملواؤں گی۔ وہ تو اکثر آپ کا ذکر

کرتے ہیں۔"

وہ کھو کھلی ہنسی ہنسا۔ "بھولے ہوئے کو بھولا ہی رہنا چاہیے 'بیٹی!'

ہم نے بہت اصرار کیا مگر بوڑھا ایک قدم نہ ہلا۔ ہم نے کچھ روپے دینے چاہے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ الٹا ببو کو دو تین مٹھیاں چنوں کی اور دے دیں۔

ہم چلنے لگے تو بولا۔ "دیکھو بیٹی اپنے ابا کو نہ بتانا۔"

"کیوں بابا ہم تو ضرور بتائیں گے۔"

"نہ بیٹی میرا ایک ہی ٹھکانا رہ گیا ہے ——— اسے نہ توڑو۔ تم انھیں یہاں لے آئیں تو مجھے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑے گی' جیسے انار کلی سے بھاگ آیا ہوں۔ میری تو اب یہی جگہ ہے ——— سب کچھ یہی ہے۔"

"آخر اس جگہ میں کیا ہے بابا۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔"

"بیٹی ——— گھر گیا ——— جائداد گئی ——— اولاد گئی ——— عزیز و اقارب گئے ——— اب یہی جگہ ہے جو رہ گئی ہے۔ تم نے تو شاید کتابوں میں پڑھا ہو کہ یہاں وہ جلسہ ہوا تھا جس میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا ——— لیکن میں تو اس جلسے میں شریک تھا ——— وہاں سٹیج بنا تھا۔ جس کے ساتھ ہی میں بیٹھا تھا۔ اس جلسے کی کارروائی کا ایک ایک واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ وہ جلسہ بھی دیکھا! اور اس کے بعد اپنی جدوجہد کے سات سال بھی دیکھے۔ پھر اپنے گھر کی بربادی بھی دیکھی۔ اب، اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یہ ملک بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اب اس واقعے کی یادگار بھی دیکھتے ہیں۔ میری تو یہی خواہش ہے بیٹی اسے دیکھتے ہوئے دم نکلے اور یہیں قبر بنے۔"

ہم دونوں تأسف کے عالم میں کھڑے تھے۔ دل میں کئی سوال آتے مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ ذہن میں نئی خیال آئے مگر پوچھنے میں جھجک تھی۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا گھر جا کر آرام سے سوچیں گے۔ اگر یہ دو سال سے یہیں ہے تو پھر کل بھی یہیں ہو گا۔

"چلو ببو" میں نے بچے کو چمکارا۔

لیکن میری بیوی پوچھ بیٹھی "مگر بابا آپ کی تو اتنی جائداد تھی وہاں' اس کے بدلے کچھ نہیں ملا آپ کو؟"

"تھی بیٹی۔ مگر جن حالات میں میرے گھر پر حملہ ہوا تھا میں کوئی کاغذ ساتھ نہ لا سکتا تھا۔ البتہ میرا ایک نوکر وہ کاغذات لے بھاگا اور یہاں آکر خوب جائداد الاٹ کروائی۔"

"لیکن یہ دھوکا ہے۔ آپ نے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"کئی مرتبہ کی، مگر وہ اپنے غنڈوں سے مجھے پٹوا ڈالتا ہے اور اپنی دولت سے فیصلہ کرنے والوں کا منہ بند کر دیتا ہے۔ آخری دھمکی قتل کی تھی —— کیا ہو سکتا ہے —— قدرت کو یہی منظور تھا۔"

"مگر وہ کون ہے؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"یہاں تو آج کل وہ بھی نواب کہلاتا ہے۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا

چند لمحے سوچتا رہا کہ بتائے یا نہ —— پھر بولا۔

"دیکھا نہیں آپ نے؟ —— وہ ابھی سفید کار سے اتر کر گوالے کو مار رہا تھا ——"

(رگِ سنگ)

سوالات

۱۔ مصنف نے اس کہانی میں مینار پاکستان تک پہنچنے میں ٹریفک کی جس دھکم پیل کا ذکر کیا اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۲۔ چنے بیچنے والا شخص کون تھا؟ اور وہیں بیٹھے رہنے پر کیوں مُصر تھا؟

۳۔ اس افسانے کے لکھنے سے آپ کی نظر میں مصنف کا کیا مقصد ہے؟

۴۔ افسانہ "تعبیر" میں مسعود مفتی نے کہانی کو کس طرح دلچسپ اور انوکھا بنایا اور کہانی کا نقطہ عروج ہے؟

—— ○○○ ——

ڈراما

لفظ "ڈراما" یونانی لفظ "ڈراؤ" (DRAU) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ ڈراما ایک ایسی افسانوی صنف ادب ہے جس میں ایک مکمل کہانی کرداروں کے عمل اور حرکت سے سٹیج پر مکالموں کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ اسی لیے ارسطو نے اسے کسی ایسے عمل کی نقالی سے تعبیر کیا ہے جو مکمل ہو۔ لہٰذا ڈرامے کے اجزا میں کہانی، پلاٹ، کردار اور مکالمے ہی اہمیت نہیں رکھتے جو ڈرامے کا ادبی پہلو ہیں بلکہ سٹیج، پس منظر اور سیزی، موسیقی اور کرداروں کا عمل بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے اور جن کا تعلق ڈرامے کی پیش کش سے ہے۔

کہانی، ڈرامے کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کہانی کے واقعات جب ایک خاص نظم کے پابند ہوتے ہیں اور ان میں ایک باطنی اور بامعنی ربط و آہنگ اور تسلسل پیدا ہو جاتا ہے تو اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ اکہرا بھی ہوتا ہے اور تہ دار بھی لیکن ڈرامے کی پیش کش کے نقطہ نظر سے اکہرا اور سادہ پلاٹ زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ پلاٹ کے واقعات کی ترتیب ڈراما نگار کے فن کی بنیاد ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف سامعین کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے بلکہ اپنے تصورِ حیات کا ابلاغ بھی کرتا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ ایک آغاز رکھتا ہے، نقطۂ عروج تک پہنچتا ہے اور ایک اختتام رکھتا ہے۔

ڈرامے کی دلچسپی کی بنیاد کرداروں کے تصادم اور کشمکش میں مضمر ہے۔ ڈرامے کا سب سے اہم حصہ اس کا نقطۂ عروج ہے۔ اس مقام پر پلاٹ کی اثر انگیزی تماشائیوں کی توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ تصادم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور تذبذب کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم انجام کو جاننے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہ الجھن، انکشاف کے عمل سے حل ہوتی ہے اور ڈراما انجام پذیر ہو جاتا ہے۔

ڈرامے کا دوسرا اہم عنصر "کردار" ہیں۔ کردار جس قدر زندہ اور حقیقت سے قریب ہوتے ہیں ڈراما اسی قدر بامعنی اور بااثر ہوتا ہے، ضروری ہے کہ کرداروں کی گفتگو، عمل اور کیفیات میں حقیقت کا رنگ ہو۔ ڈرامے کی کہانی انھیں کرداروں کے عمل اور گفتگو سے تشکیل پاتی ہے اور کرداروں کا باہمی تصادم اور ٹکراؤ ہی ڈرامے کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ اچھی اور اعلیٰ کردار نگاری ہی ڈراما نگاری کا کمال سمجھی جاتی ہے۔

کردار اپنی شخصیت، اپنے خیالات و تصورات اور اپنے ارادوں کا اظہار اپنے مکالمات کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس طرح اچھا مکالمہ ڈرامے کی روح ہوتا ہے۔ ڈراما نگار پلاٹ کی تشکیل، کردار نگاری اور اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے کے لیے مکالموں سے کام لیتا ہے۔ لہٰذا زبان و بیان پر قدرت اور کرداروں کی سیرت اور فطرت کی واضح تصویر کشی کے لیے قوتِ اظہار ڈراما نگاری کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ دور جدید سے قبل ڈراموں کے مکالمے منظوم اور شاعرانہ آہنگ و انداز کے حامل ہوتے تھے لیکن دور جدید میں ڈراموں کی ہیئت میں وسعت اور تکنیکی سہولتوں کے باعث ان میں سادگی اور نثر کا استعمال بڑھتا گیا اور اب ڈراموں میں حقیقی زندگی کی گفتگو اور روز مرہ کی زبان کے حامل مکالموں کا استعمال زیادہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

ڈرامے کو اس کے انداز، انجام اور تأثر کے لحاظ سے "المیہ" اور "طربیہ" دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "المیہ" ایسے ڈراموں کو کہا جاتا ہے جن میں تصادم اور کشمکش نہایت اعلیٰ اور شاندار انسانی عمل سے

تشکیل پذیر ہوتی ہے اور جن کا انجام اس کے اہم کردار یا کرداروں کی شکست اور موت کی صورت میں ہوتا ہے۔ جب کہ "طربیہ" ڈرامے زندگی کی ناہمواریوں اور کرداروں کی کوتاہیوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور ان کا انجام عموماً خوشی اور مسرت پر ہوتا ہے۔ المیہ ڈراموں کو عموماً بلند تر درجہ دیا گیا ہے۔ اعلیٰ فنی صلاحیتوں، متانت فکر اور زندگی اور کرداروں کی عمیق تفہیم کے بغیر کامیاب المیہ ڈرامے کی تشکیل ممکن نہیں۔ المیہ انسان کو فطرت اور کائنات کی وسعت میں مصروف جدوجہد پیش کرتا ہے جب کہ "طربیہ" اس کو اپنے معاشرے، ماحول اور رسم و رواج میں گھرا اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی مضحکہ خیز اور مسرت انگیز صورت سامنے آتی ہے۔

فرصت و فراغت کے لمحات کم ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی ایک صنف وجود میں آئی جو "ایکانکی" یا ایک ایکٹ کا ڈراما ہے۔ اس میں فن کے تمام لوازمات کے ساتھ ایک ہی واقعہ کو ایک ہی ایکٹ میں بھرپور اور واحد تاثر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس میں کردار کم، مناظر محدود اور زندگی کے کسی ایک ہی نقطے پر نظر مرتکز رکھی جاتی ہے۔ ریڈیو کے لیے جو ڈرامے لکھے جاتے ہیں، انھیں نشری یا ریڈیائی ڈرامے کہا جاتا ہے۔ ان میں مسائل و مقاصد عام ڈراموں کی طرح ہیں لیکن ان کی تکنیک میں فرق اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان ڈراموں میں تمام تر اثر سماعت ہی کے ذریعے پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹی۔وی کے لیے لکھے گئے ڈراموں کی تکنیک میں ٹی۔وی کے واسطے اور ذریعے کی وجہ سے نئی تبدیلیاں وجود پذیر ہو رہی ہیں۔

مغرب میں ڈرامے کا آغاز پانچ سو سال قبل مسیح میں یونان میں ہوا۔ یونان کے اثر سے اہل یورپ نے دوسرے فنون کے ساتھ اسے بھی اپنایا۔ اردو ڈرامے کی ابتدا واجد علی شاہ کے عہد سے ہوئی۔ ان کے عہد میں سید آغا حسین امانت دہلوی نے ایک ڈراما "اندر سبھا" لکھا۔ اس ڈرامے کو اس لحاظ سے اردو کا پہلا ڈراما کہا جاتا ہے کہ اسے پہلی دفعہ عوام کے سامنے اسٹیج پر پیش کیا گیا اور وہ بہت مقبول ہوا۔ اندر سبھا میں نثر کم ہے اور جتنی ہے وہ پُر تکلف، پُر تصنع اور مقفیٰ عبارات پر مشتمل ہے۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کی زبان کی صفائی، شیرینی اور شاعرانہ حسن ہے۔ دوسری طرف مصنف نے رقص و موسیقی کی پسندیدہ طرز سے فائدہ اٹھایا اور رقص و موسیقی کو ڈرامے میں اس طرح سمو دیا کہ عوام نے اسے بہت پسند کیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں پارسی اردو تھیٹر کا آغاز ہوا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد طالب بنارسی، احسن لکھنوی اور بے تاب بریلوی ان کمپنیوں سے وابستہ ہوئے اور اردو ڈراما کو ایک نئی تحریک ملی۔ طالب نے نظم کے ساتھ نثر میں بھی مکالمے لکھے اور اردو گیتوں کو ان میں شامل کیا۔ احسن لکھنوی نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے آزاد ترجمے "خونِ ناحق" "شہیدِ وفا" اور "گلنار فیروز" پیش کیے۔ بے تاب نے ہندی دیومالا اور مذہبی قصوں کو ڈرامائی رنگ میں پیش کیا "کرشن سداما" "رامائن" "مہابھارت" اور "فریبِ محبت" ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں آغا حشر نے اردو ڈرامے میں ایک نیا انداز اور وقار پیدا کیا۔ آغا حشر نے پہلی بار اردو ڈراما کو فنی خصوصیات کا حامل بنایا۔ انھوں نے ملک کے معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ زبان و اظہار میں ادبی خصوصیات پیدا کیں اور عوام کے معیار اور مذاق کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ شروع میں انھوں نے بھی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے لیکن بعد میں اپنی کمپنی کھول لی۔ "اسیرِ حرص"، "شہیدِ ناز"،

"یہودی کی لڑکی"، "خوابِ ہستی" اور "رستم و سہراب" ان کے ڈراموں میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔

آغا حشر کے بعد اردو کے ممتاز اور نمائندہ ادیبوں نے بھی ڈراما نگاری کی طرف توجہ دی۔ انؐ میں امتیاز علی تاج خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے ادبی سطح پر اردو ڈراما اور اسٹیج کو ترقی دینے کی کوشش کی اور طویل اور مختصر دونوں طرح کے ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈرامے "انارکلی" نے اردو ڈراما نگاری میں خصوصی شہرت حاصل کی۔ ان کے مختصر ڈراموں میں "قرطبہ کا قاضی" اور "صید و صیاد" خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے ڈراموں کے مجموعہ "چچا چھکن" نے بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ ڈراما نگاری کا یہ دور رومانوی عینیت پسندی کے ساتھ ساتھ معاشرتی و سماجی اصلاح کا دور بھی تھا۔ اس دور کے دیگر ڈراما نگاروں میں یہ رجحان نمایاں ہے۔ ان میں حکیم احمد شجاع کا ڈراما "باپ کا گناہ" اور چوہدری افضل حق کا ڈراما "شعور" قابلِ ذکر ہیں۔

برصغیر میں ریڈیو کے اجرا کے ساتھ ہی اردو میں ریڈیائی ڈراموں کا رواج بھی شروع ہوا۔ امتیاز علی تاج کے علاوہ جن ادیبوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے ان میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ ادیب ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ان کے علاوہ جن ادیبوں نے ڈرامے کو اپنا خاص موضوع بنایا ان میں اوپندر ناتھ اشک اور میرزا ادیب خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ میرزا ادیب نے ڈراما نگاری میں خاص شہرت حاصل کی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈرامے میں قومی اور فنی رجحانات غالب آنے لگے۔ لیکن یہ حقیقت عیاں ہے کہ مسلم معاشرہ کے مخصوص ماحول کے سبب اردو ڈراما نگاری کو چنداں ترقی نہیں ملی۔ جدید دَور میں ٹی۔ وی کی ترویج کے ساتھ ہی ڈراما نگاری کو ایک نیا میدان اور ذریعہ ہاتھ آیا ہے جس کے اثرات کچھ عرصہ بعد ظاہر ہونا شروع ہوں گے۔

سید امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء - ۱۹۷۰ء)

لاہور میں ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی ممتاز علی تھا جو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم تھے اور برصغیر میں جدید صحافت کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی والدہ کا نام محمدی بیگم تھا جو کئی کتابوں کی مصنف اور خواتین کی تعلیم اور ترقی کی داعی تھیں۔ اس طرح امتیاز علی تاج کو علم و ادب کا شوق ورثے میں ملا۔ انھوں نے سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے خاندانی پیشے یعنی صحافت اور اشاعتِ کتب ہی کو اپنایا۔ ان کی ادارت میں مختلف رسائل جن میں "کہکشاں"، بچوں کا رسالہ "پھول" اور خواتین کا رسالہ "تہذیبِ نسواں" شامل ہیں، شائع ہوتے رہے۔

تاج صاحب نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ ان کا محبوب موضوع "ڈراما" تھا۔ کالج کے زمانے ہی سے ان کو ڈرامے سے گہری دلچسپی رہی اور تمام عمر انھوں نے اس صنفِ ادب کے مطالعے، خدمت اور اس کے فروغ میں بسر کی۔ طویل ڈراموں میں ان کا ڈراما "انارکلی" اردو ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "یک بابی" اور ریڈیائی ڈراموں کے لکھنے اور ان کی تکنیک کے سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے۔ "چچا چھکن" ان کے ایسے ہی ریڈیائی ڈراموں کا سلسلہ ہے جو کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔ "قرطبہ کا قاضی" جو اس انتخاب میں شامل ہے، ان کا ایک ایکٹ کا المیہ ہے جو اپنے تاثر، تکنیک اور فنی کمال کی وجہ سے نہایت بلند مقام کا حامل ہے۔

امتیاز علی تاج کو ڈرامے کے فن کا خاص شعور حاصل تھا۔ ان کے ڈرامے، مزاحیہ اور المیہ دونوں ہی ان کی تکنیکی مہارت اور زبان و بیان پر قدرت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ امتیاز علی تاج کشاکشِ حیات کے ٹکراؤ، معاشرے کے تضادات اور فطرت و روایت میں تصادم کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے مکالمے برجستہ، رواں اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ ان کے کردار زندگی کے جیتے جاگتے کردار معلوم ہوتے ہیں اور ان کی منظر نگاری ان کے ڈراموں کو حقیقت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ "قرطبہ کا قاضی" ان کا ایک ایسا ہی ڈراما ہے۔

قرطبہ کا قاضی

افراد

قاضی یحییٰ بن منصور

زبیر ـــــ قاضی کا فرزند

حلاوہ ـــــ زبیر کی دایہ

عبداللہ ـــــ ایک خانہ زاد

ناظر عدالت کے چار افسر

ہجوم کی آواز

منظر

قرطبہ میں قاضی یحییٰ بن منصور کے مکان کا ایک ایوان۔ جس کے دریچوں میں سے شہر کے چوک پر نظر پڑ سکتی ہے۔ دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک بڑا سا دریچہ۔ سامنے کی دیوار میں ایک چوڑا مگر نیچا دروازہ۔ جس کے پیچھے ایک تنگ اور اندھیری گلی ہے۔ گلی کے دوسری طرف ایک چھوٹا دروازہ۔ جس میں سلاخیں لگی ہیں۔ بائیں ہاتھ پتھروں کا بنا ہوا زینہ اوپر کے کمرے کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ اوپر کے کمرے کی ایک کھڑکی ایوان میں کھلتی ہے۔

ایوان میں ایک بڑی میز ہے۔ جس پر ایک شمع دان رکھا ہے۔ میز کے قریب ایک بنچ اور چند کرسیاں پڑی ہیں۔ دیواروں پر اسلحہ اور جانوروں کے سر لگے ہوئے ہیں۔

صبح کے دھندلکے میں حلاوہ بنچ پر بیٹھی ہے سر گھٹنوں سے لگا رکھا ہے۔ عبداللہ دروازے میں سے اندر آتا ہے۔

عبداللہ : (بھاری آواز میں) شمعیں گل کر دوں؟

حلاوہ : (آہ سرد کے ساتھ) کر دے۔ شمعیں صبح کو آنے سے روک نہیں سکتیں۔

(عبداللہ پھونکیں مار کر شمعدان کی تین شمعیں گل کرتا ہے)

حلاوہ : کیسی کالی صبح! میرے رب کیسی کالی صبح!

عبداللہ : کالی اندھوں کے لیے! ان بدفالوں کے لیے جو گھٹنوں پر سر رکھے نحس کلمے منہ سے نکالتے ہیں۔ پر رب العالمین کے فضل و کرم سے ابھی آنکھوں والے بھی موجود ہیں۔ تیری طرح سب اندھے نہیں ہو گئے۔

حلاوہ : (اس کی پروا نہیں کرتی) یہ صبح دیکھنے کو میں زندہ کیوں رہ گئی! جس کے دودھ کی دھاروں نے اسے جان بخشی تھی۔ الٰہی تین دن کا تھا۔ جب بیگم نے آنکھیں بند کیں۔ صرف تین دن کا۔ تب میں نے ـــــ میرے سوا دودھ کس کے تھا' اسے دودھ دیا اور زندگی دی۔ اور میرے رب آج کا دن تمام ہونے پر میرا لال کیا ہو گا۔

عبداللہ : زندہ ہو گا۔ اور کیا ہو گا؟ عمر پائے گا۔ اور رب العالمین کے فضل و کرم سے تجھے اور مجھے ہم دونوں کو قبر کے شگاف میں اتارے گا۔

(تکان کی ایک آہ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے)

حلاوہ : میرے سینے پر اس کے ہونٹوں اور جبڑوں کی لذت ابھی تازہ ہے۔ وہ شیر کے بچے کی طرح اس سے دودھ کھینچتا تھا۔ اپنے بارہ بچوں کو دودھ پلایا۔ لیکن سب سے زیادہ حریص وہی تھا۔ اور پھر کیسا بے باک نوجوان بن گیا۔ دیکھتی تو جی چاہتا قربان ہو جاؤں۔ اس کے جسم میں خون جو میرا اپنا تھا۔ اور پروردگار! آج سولی پر اس کی لاش لٹکتی رہ جائے گی!

عبداللہ : (بے قابو ہو کر) نشتر زبان! یہ ہرگز نہ ہو گا۔

حلاوہ : (گھٹنے سے سر اٹھا کر آہ بھرتی ہے) اب چارہ کیا رہ گیا!

عبداللہ : سارے قرطبہ میں ایک شخص نہیں جو کسی کے حکم سے بھی اسے سولی پر چڑھائے۔ خواہ اس کے باپ کا فتویٰ ہو۔

حلاوہ : باپ قاضی ہے۔

عبداللہ : کہا جو کہ اس کے فتویٰ پر عمل نہ ہو گا۔

حلاوہ : باہر سے لوگ بلا لیے جائیں گے۔ جو اسے ویسے نہیں جانتے جس طرح ہم سب جانتے ہیں۔ انھیں قانون جو کہے گا' وہ کر ڈالیں گے۔

عبداللہ : (چڑ کر) میں بک جو رہا ہوں نہیں کریں گے' آج کے دن شہر میں صرف وہی شخص داخل ہونے پائے گا جو کلام پاک کی قسم کھائے گا کہ اسے نوجوان زبیر کی سزا سے کچھ سروکار نہ ہو گا۔ سمجھی کوڑھ مغز؟ ہمارے آدمی تمام راستوں پر پھیل چکے۔ ایک ایک ناکے کو روک چکے۔ جس شخص نے قسم نہ کھائی کہ زبیر کا خون اس کے دوش پر نہ ہو گا وہ اندر نہ آنے پائے گا۔ اور یہی جواب قاضی کے حکم پر خود اس کو دیا جائے گا۔ وہ قانون کا غلام ہو گا یا سلطان کا۔ آج کے دن اس کے فتویٰ کی تعمیل نہ ہونے پائے گی۔

حلاوہ : لیکن احمق! ہونی کو کون روک سکتا ہے؟ میرے یہی آنکھیں نہیں جنھیں آنسوؤں نے بے نور کر دیا ہے۔ میرے اور بھی آنکھیں ہیں جو دیکھ سکتی ہیں اور جو دیکھ چکی ہیں۔

سولی اور اس سے لٹکتی ہوئی لاش ! میرا ننھا ! میری جان ننھا ! میرا سجیلا نوجوان ! جس کا جسم میرے دودھ نے بنایا۔ جس کے خون اور ہڈیوں میں میرا دودھ ہے' میں اسے مردہ دیکھ چکی ! کہتی جو ہوں کہ یونہی ہو گا۔ سچ نہ ہوتا تو یہ بات میری زبان سے نکلتی؟

عبداللہ : لیکن اسے سولی کی سزا ملے کیوں؟ اس کا جرم کیا ہے؟

حلاوہ : میرے بتانے کی ضرورت ہے کہ اس نے خون کیا ہے؟

عبداللہ : ہاں۔ مگر محبت کی خاطر۔ اپنی غیرت کی خاطر۔ اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کون کہتا ہے یہ خون ناجائز تھا۔

حلاوہ : نہیں نہیں اس نے جلن کے مارے خون کیا۔

عبداللہ : محبت جلن نہیں تو پھر ہے کیا؟

حلاوہ : مقتول نے اسے کوئی آزار نہ پہنچایا تھا۔

عبداللہ : مقتول کو اس کی محبوبہ سے محبت جو تھی۔

حلاوہ : خوبصورت عورت سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔

عبداللہ : لیکن محبوبہ نے مقتول کو محبت بھرا خط بھی تو لکھا تھا۔

حلاوہ : محبوبہ کو اس کا حق تھا۔ وہ زبیر کی منگیتر نہ تھی۔ جسے چاہتی پسند کرنے کا حق رکھتی تھی۔

عبداللہ : صرف اپنوں میں سے۔ اپنے ہم نسبوں میں سے۔ مقتول پرایا تھا۔ اور دوسرے ملک کا باشندہ تھا۔

حلاوہ : زبیر کے باپ قاضی کا مہمان تھا۔

عبداللہ : اور شرافت کا یہ کون سا طور تھا کہ گھر کا مہمان گھر کے نوجوان کی محبت میں کود پڑے؟ اگر وہ نہ آتا۔ اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ورغلا نہ لیتا تو زبیر اپنی محبت میں کامیاب نہ ہوتا؟

حلاوہ : شاید۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ پر لڑکی نے اس وقت تک ہاں نہ کی تھی۔

عبداللہ : اسی بات کا تو زبیر کو خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس کے رقیب کے پیغام پر ہاں نہ کر دے۔

حلاوہ : اور اسی خدشے نے زبیر کو دیوانہ بنا دیا۔

عبداللہ : اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ زبیر نے اپنے رقیب کا کام برابر کی لڑائی میں تمام نہیں کیا؟

حلاوہ : زبیر نے یہ کہا نہیں۔ ایک بار بھی نہیں کہا۔ وہ یہ کہتا تو اس کا باپ باور کر لیتا۔ پر ان باتوں سے کیا؟ ارے جتی۔ اب ان باتوں سے کیا؟ اس نے خون کیا ہے اور خون کی سزا میں اسے دار پر لٹکایا جائے گا۔

عبداللہ : (چڑ کر) اور اسے دار پر لٹکانے تُو جائے گی؟

حلاوہ : (ششدر ہو کر) میں؟

عبداللہ : تو نہ ہو تو اس بھرے شہر میں اور کوئی نہیں جو اپنے ہاتھ اس کے خون سے آلودہ کرے۔ (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتا ہے) باہر دیکھ ! اس ہجوم کو دیکھ جس نے چوک میں سولی کو گھیر رکھا ہے۔ (حلاوہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے) یہ سب کس بات کے منتظر ہیں؟

حلاوہ : (جیسے سب کچھ جانتی ہے) بتا تو۔ کس بات کے؟

عبداللہ : سمجھتی ہے۔ یہ سولی کا تماشا دیکھنے کو کھڑے ہیں؟ یہ اس لیے کھڑے ہیں کہ یہ ناپاک کام نہ خود کریں گے اور نہ ہونے دیں گے۔ (ایک سیڑھی چڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیتا ہے) لوگو، سنو ! تم میں سے کون ہے جو قاضی یحییٰ کے لیے اس کے بیٹے کو سولی پر لٹکا دے؟

(ہجوم میں سے ناراضی کی مخلوط آوازیں سنائی دیتی ہیں)

کوئی ہے تو سامنے آئے اور کہے۔

(خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ عبداللہ کھڑکی کے پٹ بند کر دیتا ہے)

کیوں؟ بولا کوئی شخص ! کہا کسی نے کہ وہ زبیر کو سولی پر لٹکا سکتا ہے؟ کہا جو کہ سارے قرطبہ میں ایک شخص کا ہاتھ نہیں جو اسے آزار پہنچانے کے لیے اٹھ سکے۔

(قاضی یحییٰ بن منصور اوپر کی منزل کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتا ہوا رکتا ہے۔ ذرا دیر یوں بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے گویا کچھ نہیں دیکھ سکتا)

چپ کیوں ہو گئی؟ بول۔ اب بول نا! کون زندہ شخص ہے جو ان جان نثاروں کی آنکھوں

کے سامنے قانون یا سلطان کے حکم کی تعمیل کی جرأت کر سکے ؟

(قاضی کھڑکی سے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے اور دروازہ کھولتا ہے)

حلاوہ : چپ! دیکھ قاضی! قاضی! وہ سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ وہ پھر بھی آ رہا ہے۔

عبداللہ : (آہستہ سے) آنے دے۔

حلاوہ : (سرگوشی میں) لاش کی طرح پیلا!

عبداللہ : چپ!

حلاوہ : آنکھوں میں سے زندگی بجھی ہوئی!

عبداللہ : چپ!

حلاوہ : جیسے تنہائی میں موت سے کھیلتا رہا ہے۔

عبداللہ : بک مت!

حلاوہ : جیسے روح لاش کو چھوڑ کر آ رہی ہے۔

عبداللہ : عورت گونگی ہو جا۔

(قاضی سیڑھیاں اتر کر کمرے میں آ جاتا ہے۔ اور کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے)

قاضی : (بھاری آواز میں) موت کا ڈھنڈورا کیوں نہیں پٹ رہا؟

(حلاوہ کے منہ سے سسکی نکل جاتی ہے۔ عبداللہ چپ ہے)

میں نے کیا کہا جواب دو۔

عبداللہ : حضور ڈھنڈورا پیٹنے والا موجود نہیں۔ آج کے دن کوئی ڈھنڈورا پیٹنے والا نہیں۔

قاضی : کہاں گئے ؟

عبداللہ : حضور مجھے علم نہیں۔ یہاں نہیں ہیں۔

قاضی : وہ کہاں ہے ؟ وہ شخص جسے مجرم کو پھانسی دینا ہے۔

عبداللہ : حضور کہیں گیا ہوا ہے۔

قاضی : کہیں! تو نے کیا کہا۔ کہیں؟

عبداللہ : جی حضور۔

قاضی : معنیٰ کیا؟ "کہیں!"

عبداللہ : چلا گیا تھا۔ اندھیرے منہ ہی۔ کہ کر نہیں گیا۔ کہاں جا رہا ہے۔ یہاں نہیں ہے۔

قاضی : ادھر باہر کون ہے ..... اور کون ہے؟

عبداللہ : حضور ایسا کوئی بھی نہیں جو آپ کے فتویٰ کی تعمیل کر سکے۔ ویسے میرے سوا قرطبہ کے سارے مرد گھر سے باہر کھڑے ہیں۔

قاضی : (جلدی سے جیسے یقین نہیں آتا) قرطبہ کے سارے مرد تیرے سوا؟ یہ معنی کہ تعمیل کے لیے تُو آمادہ ہے؟

عبداللہ : نہیں، حضور میں تعمیل نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی اور شخص جسے میں جانتا ہوں کر سکتا ہے۔ اگر حضور کو اس فتویٰ کی تعمیل کرانی ہے تو ابلیس ہی اس کی تعمیل کر سکتا ہے۔ یا آپ خود۔

(قاضی نے پوری بات نہیں سنی۔ لیکن حلاوہ نے سن لی ہے۔
اس کے منہ سے خوف کی دبی ہوئی آواز نکل جاتی ہے)

قاضی : کیا؟ ..... کیا کہا تھا تو نے؟

عبداللہ : (مرعوب ہو جاتا ہے) معاف کیجیے گا حضور۔ میں صرف اپنے متعلق کہ رہا تھا۔ رب العالمین میرا مددگار ہو۔ میں جو بات حق سمجھتا ہوں کہ رہا تھا۔

(خاموشی۔ نہ کوئی حرکت کرتا ہے۔ نہ بولتا ہے۔ باہر کے
ہجوم میں سے ہلکے ہلکے بولنے کی مدہم آواز آ رہی ہے)

قاضی : ناظر عدالت کے آدمی کہاں ہیں؟

عبداللہ : نچلی منزل میں حضور۔

قاضی : انھیں یہاں بلا لاؤ۔

(عبداللہ جاتا ہے۔ قاضی اضطراراً دو قدم چل کر رک جاتا ہے۔

حلاوہ سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ بے حد ہمت سے کام لے کر بولتی ہے)

حلاوہ : میں حضور سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟

قاضی : کیا ہے عورت؟

حلاوہ : میری بوڑھی زبان سے اللہ تعالیٰ کا عفو و رحم کئی بار بولا۔ لیکن ہر بار اس نے سننے والے کانوں کو بہرا پایا۔ پر اب کی بار میری التجا سن لیجیے یا مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کر ڈالیے ..... میرے حضور یہ وہ بدنصیب بول رہی ہے جس نے مجرم کی ماں کے اٹھ جانے کے بعد اپنی اولاد کی طرح اسے کلیجے سے لگایا۔ میرے حضور خود آپ نے اس کو مجھے دے ڈالا تھا۔ میں تھی جس نے اسے زندگی دی اور توانائی بخشی کہ وہ بڑھ کر مرد بن جائے۔ میرے حضور کیا آپ ہی مجھ سے وہ زندگی چھین لیں گے؟ اسے جسے تب میں نے زندگی بخشی تھی اب کہ وہ جوان ہے۔ آپ کا اپنا گوشت اور خون ہے۔ اسے زندہ نہیں رہنا تھا تو یہ سب میں نے کیا کیوں تھا؟ فریاد سننے والا باپ ہے تو پروردگار! اولاد کے لیے التجائیں میں کیوں کر رہی ہوں؟ وہ آپ کا ہے میرا نہیں۔ آپ نے اسے پیدا کیا اور میں نے نہیں۔ ایک اور عورت اسے جننے میں اس جہاں سے گزر گئی تھی۔

قاضی : بس اور کچھ نہیں۔ تجھے جو کچھ کہنا تھا تو کہہ چکی۔ میں بہرا نہیں۔

(حلاوہ پھر بولنا چاہتی ہے)

یہاں سے چلی جا عورت! مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ چلی جا!

حلاوہ : بہت اچھا حضور۔ بہت اچھا۔

(سسکیاں روکتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ عبداللہ داخل ہوتا ہے۔)

عبداللہ : حضور ناظر عدالت کے آدمی آ گئے۔

قاضی : کیا؟ ـــــــ ہاں آ گئے۔ یہاں بلا لاؤ۔

(ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ناظر عدالت کے

چار آدمی داخل ہوتے ہیں۔ پل بھر خاموشی۔)

تم لوگ سلطان کے نمک خوار ہو اور اطاعتِ سلطان کا حلف اٹھا چکے ہو۔ یہی صورت میری ہے۔ آج ایک شخص کو سولی دی جاتی ہے ..... سولی دینے والا موجود نہیں ..... تم میں سے کون ..... سنتے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں' اس کی جگہ تم میں سے کون لے سکتا ہے ؟

(کوئی جواب نہیں ملتا)

کوئی شخص آمادہ نہ ہوا تو مجھے خود کسی ایک کو حکم دینا پڑے گا ..... ہوں ! کوئی نہیں ! ..... دیکھو۔ فرض ہم سب کو پکار رہا ہے۔ قانون کی اطاعت لازمی ہے ..... میں سمجھا تم میں سے کوئی ہامی نہ بھرے گا۔ بہت اچھا۔ قرعہ اندازی سے کام لیا جائے گا۔

افسر: نہیں حضور والا۔ معاف کیجیے گا۔ ان میں سے کوئی قرعہ اندازی نہیں چاہتا۔ ایک بھی نہیں۔ میں سب کی طرف سے بول رہا ہوں۔

قاضی: تو میں تم کو حکم دیتا ہوں۔

افسر: حضور' اللہ تعالیٰ مجھے توفیق بخشے کہ آپ کے فرزند کو سولی پر چڑھانے سے پہلے میں خود سولی پر چڑھ جاؤں۔

قاضی: تمھیں اس بات کا خیال نہیں کرنا کہ مجرم میرا فرزند ہے۔ یہ سمجھنا ہے کہ ایک شخص نے خون کیا ہے اور اس کی سزا میں اسے سولی ملنی لازمی ہے۔

افسر: حضور جس شخص نے اسے مجرم قرار دیا ہے اور اس کے قتل کا فتویٰ لکھا' یہ کام وہ خود کر سکتا ہے تو کر لے' ہم زبیر کو قصور وار نہیں سمجھتے۔

(قاضی کرسی ہٹا کر اٹھتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ دریچے کے قریب جاتا ہے
اور اس کے پٹ کھول دیتا ہے۔ پٹ کھلنے پر ہجوم کی آوازوں کی بھنبھناہٹ
سنائی دیتی ہے۔ جو قاضی کا چہرہ دیکھتے ہی بند ہو جاتی ہے۔)

قاضی: (بلند آواز سے) لوگو ! ایک مجرم منتظر ہے کہ اسے سولی دی جائے اور سولی دینے والا کوئی نہیں۔ تم میں سے کوئی ہے جو یہ خدمت سرانجام دے سکے ؟

(خاموشی۔ پھر استہزا کی ایسی زیرِ لب آوازیں جن سے ظاہر
ہے کہ ہجوم کے لوگ قانون کی شکست سے مسرور ہیں)

عبداللہ : کوئی نہیں۔ ایک بھی نہیں۔ ایک بھی نہیں۔

قاضی : (کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ اور ذرا دیر چپ رہتا ہے۔ پھر بے اختیاری کی کیفیت میں اس کی آہ نکل جاتی ہے۔) ناظر جاؤ۔ قیدی کو باہر لے جاؤ۔ کنجیاں یہ رہیں۔ (کنجیاں نکال کر میز پر پھینک دیتا ہے)

افسر: (کنجیاں اٹھاکر) باہر کہاں حضور؟

قاضی : سولی کے چبوترے پر۔ اور کہاں؟ جلد! وقت ضائع نہ ہو۔

(سپاہی جاتے ہیں)

(آہستہ سے) عبداللہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اور اس کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ بخشے۔

عبداللہ : (ہیبت زدہ ہو کر منہ ہی منہ میں) رب العالمین! رب العظیم! اسے سولی دینے والا کوئی مل گیا! اسے سولی دینے کو کوئی مل گیا!!

(عبداللہ باہر جاتا ہے۔ افسر سلاخوں والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ باقی ساتھی باہر ٹھہرے رہتے ہیں۔ گلی اندھیری ہے۔ سلاخوں والے دروازے کے اندر اور زیادہ اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں صرف اتنا معلوم ہونے پاتا ہے کہ قیدی باہر آیا۔ افسر اس کے پیچھے گلی میں آتا ہے۔ قاضی اس طرف پیٹھ کیے ساکت کھڑا ہے۔ قیدی سر پھیر کر اسے دیکھتا ہے۔ ناظر عدالت کے آدمی اس کے آگے اور پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گلی کے راستے باہر لے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے قدموں کی آواز غائب ہو جاتی ہے۔)

قاضی اب تک بُت بنا کھڑا ہے۔ کوس رحلت بجنا شروع ہوتا ہے۔ اس کی آواز سن کر قاضی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ مڑتا ہے اور آہستہ آہستہ باہر چلا جاتا ہے۔

باہر قیدی کو دیکھ کر ہجوم سے تاسف کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر قاضی کے نمودار ہونے پر خوف و دہشت کی چیخیں سی سنائی دیتی ہیں۔ پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوسِ رحلت بجتا رہتا ہے۔

(ادھر ایوان میں حلاوہ گھبرائی ہوئی آتی اور دریچے میں سے باہر جھانکتی ہے)

حلاوہ : لے گئے! لے گئے!

(کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگتی ہے۔ باہر کے ہجوم کا شور و غل سنائی دیتا ہے۔)

وہ آیا! وہ اسے لے آئے! میرا بچہ! میری آنکھ کا تارا! ارے دیکھو تو کیسے تن کر چل رہا ہے۔ اس کا باہر نکلا ہوا سینہ دیکھو۔ سانس کس بے خوفی سے آ جا رہا ہے۔ شاباش میرے لاڈلے شاباش! سر اٹھائے رکھ۔ تجھ پر ہم سب کو ناز ہے۔ تجھ پر دلارے تجھ پر۔ جسے مرجانا ہے ..... دیکھ لو۔ اسے دیکھ لو۔ جس کے بدن میں گرم خون لہریں مارتا تھا۔ پر جس کے دل میں قاتل کے لہو کی ایک بوند بھی نہیں ..... ہائے! پر قاتل موجود ہے آستینیں چڑھائے کھڑا ہے۔ الٰہی آج کا آفتاب یہ کیا دیکھ رہا ہے! آج کی روشنی میں یہ کیا ہو رہا ہے! رب العالمین تو خود اپنی آنکھیں بند کر لے۔ مت دیکھ! بیٹے کو باپ کے ہاتھ سولی دینے کو ہیں۔ تیری دنیا میں کبھی یوں بھی ہوا تھا..... ؟ ارے دیکھو تو۔ ارے دیکھو تو۔ میرا بچہ ہاتھ چوم رہا ہے میرا بچہ ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا رہا ہے۔ اس شخص کے جو اسے سولی پر چڑھانے کو ہے۔ جلدی ارے جلدی۔ میرے رب! اس کی روح کو جھٹ اپنے دامنِ رحمت میں لے لینا۔ اسے تڑپانا مت! اسے جلدی لے لے۔ اسے جلدی سے لے ..... ہا! ..... میرے بچے اپنا دم دے دے۔ اس کے لیے اور نہ تڑپ۔ مرجا۔ میری جان۔ مرجا۔ مرجا!

(کوسِ رحلت تھم جاتا ہے۔ ہجوم میں سے گریہ و بکا کا ایک دلدوز شور اٹھتا اور بتدریج گھٹ جاتا ہے)

(حلاوہ گھٹنوں کے بل گر پڑی ہے۔ چہرہ اونچا اور آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں دعائیں مانگ رہی ہے۔ عبداللہ آتا اور اسے دیکھتا۔ اور یوں بولتا ہے گویا اس سے

غرض نہیں کہ وہ سنے گی بھی یا نہیں۔)

عبداللہ : اب بھی دعا مانگ سکتی ہے ! رب العالمین اگر میں دعا مانگ سکتا اور میری دعا قبول ہو سکتی تو ایک موت اور ہوتی۔

(اس کے آخری الفاظ حلاوہ سن پاتی ہے دعا بند کر کے آنکھیں کھولتی اور اس کی طرف مڑتی ہے۔ اسی وقت گلی میں قاضی کے بھاری اور آہستہ قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ حلاوہ کھڑی ہو جاتی ہے اور بے حس و حرکت مگر متوقع انداز میں کھڑی رہتی ہے۔ عبداللہ کو بھی قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مڑ کر دیکھتا ہے اور ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔)

عبداللہ : وہ آرہا ہے۔ عورت دیکھ قاتل آرہا ہے اور اس کی روح پر کالی رات چھائی ہوئی ہے۔

(قاضی داخل ہوتا ہے۔ لڑکھڑا رہا ہے۔ مگر انتہائی قوتِ ارادی سے کام لے کر سنبھلنا چاہتا ہے۔ گلی میں سلاخوں والے دروازے کو دیکھ کر رک جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا ہے اور ضعف کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ایوان میں آتا ہے۔ مڑتا ہے اور سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔ اوپر کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ اندر داخل ہوتا ہے۔ اندر سے زنجیر کھلنے اور تالے میں کنجی گھومنے کی آواز آتی ہے۔ ذرا سی دیر میں اوپر کی منزل کی کھڑکی میں سے اس کا ہاتھ نکلتا ہے۔ اور کھڑکی کو بند کر کے اندر سے مقفّل کر لیتا ہے۔)

حلاوہ : اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو بند کر لیا۔ یہ دروازہ اب کبھی نہ کھلے گا۔ ہم اب اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ کبھی زندہ نہ دیکھ سکیں گے۔

(قرطبہ کا قاضی)

سوالات

۱۔ امتیاز علی تاج کی ڈراما نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۲۔ جب زبیر کو سولی دینے کے لیے باہر لایا جاتا ہے اس موقع پر حلاوہ کی گفتگو اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۳۔ ڈراما "قرطبہ کا قاضی" کے مطالعے کے حوالے سے اس اصول پر بحث کیجیے کہ المیہ بنیادی طور پر تقدیر کے سامنے انسانی بے بسی سے عبارت ہے۔

۴۔ اس ڈرامے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵۔ مندرجہ ذیل کرداروں پر روشنی ڈالیے۔

قاضی، حلاوہ اور عبداللہ

—— ○○○ ——
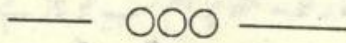
میرزا ادیب

(ولادت ۱۹۱۴ء)

اصل نام دلاور علی ہے لیکن ادبی دنیا میں میرزا ادیب کے نام سے شہرت پائی' لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پائی اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی ۔ اے کیا۔ معروف رسالے "ادب لطیف" کے ایڈیٹر رہے۔ ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ تمام زندگی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بسر کی اور ابھی تک اس تخلیقی میدان میں سرگرم سفر ہیں۔

میرزا ادیب نے اردو کی رومانوی تحریک کے عروج کے دور میں آنکھ کھولی اور ابتدا میں رومانوی نثر نگاروں کا انداز اپنایا۔ ان کے ابتدائی مجموعے "صحرا نورد کے خطوط" اور "صحرا نورد کے رومان" اپنے دلکش اور رنگین اندازِ بیان' پُر کیف زبان اور تخیلاتی' طلسماتی فضا کے سبب بہت مقبول ہوئے۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے بدلتے ہوئے رجحانات کے سبب حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کو اپنایا اور سماجی و معاشرتی مسائل اور زندگی کی کشمکش کی طرف بھی توجہ دینا شروع کی۔ یہ رجحان ان کے ڈراموں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

میرزا ادیب یک بابی اور ریڈیائی ڈراما نگاری میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "آنسو اور ستارے"' "لہو اور قالین"' "شیشے کی دیوار"' "ستون"' "فصیلِ شب" "پسِ پردہ" اور "خاک نشین" شامل ہیں۔ "مٹی کا دیا" ان کی خود نوشت ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کی روداد بیان کی ہے۔

میرزا ادیب اپنے ڈراموں کے موضوعات عام زندگی اور روزمرہ واقعات سے اخذ کرتے ہیں۔ انھیں عوام کی زندگی' ان کی نفسیات اور ان کی سماجی و معاشرتی کشمکش سے بخوبی آگاہی ہے۔ وہ اپنے ڈراموں میں عام انسانی زندگی کے تضادات اور تصادم کو پیش کرتے ہیں۔ انسانوں کی دبی ہوئی خواہشات' تمنائیں اور امنگیں' ان کی مایوسیاں اور توقعات ان کے خاص موضوعات ہیں۔ میرزا ادیب کی زبان شگفتہ اور رواں ہے اور مکالمہ نگاری میں انھیں خاص مہارت حاصل ہے۔

نئی ہمسائی

افرادِ تمثیل

زینت	رشیدہ
جمیلہ	نکہت
رقیہ	اور ایک لڑکی

منظر

رشیدہ کے مکان کا صحن

(صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ دس گیارہ کا عالم ہو گا۔ ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہے جس کی پائنتی کی طرف رشیدہ بیٹھی سلائیوں سے سوئٹر بن رہی ہے' عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے پاس زینت بیٹھی ہے' زینت کی عمر پچیس برس کے قریب ہو گی۔ اس وقت وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف نظر آتی ہے۔

چند لمحے دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول رہتی ہیں۔ زینت کتاب سے نظریں ہٹا کر رشیدہ کو ایک خاص انداز میں دیکھنے لگتی ہے

زینت : تو آپا!

رشیدہ : ہوں۔

زینت : میں کہتی ہوں یہ بھید کیا ہے آخر؟ رشیدہ آپا! کچھ معلوم بھی تو ہو۔ تم سب کچھ جانتی ہو مگر بتاتیں نہیں۔

رشیدہ : (مسکراتی ہے) جانتی تو ہوں۔

زینت : تو (رازدارانہ انداز میں) بتاؤ نا۔

رشیدہ : ذرا یہ تو معلوم ہو' آخر تمھیں اس سے اتنی دل چسپی کیوں ہے؟

زینت : دل چسپی؟ کیسی دل چسپی؟

رشیدہ : عام عورتوں کی طرح وہ بھی ایک عورت ہے۔ ہماری طرح رہتی ہے۔ ہماری طرح کھاتی ہے۔ بس!

زینت : مجھے بنا رہی ہو آپا!

رشیدہ : اونھوں۔

زینت : کیا بات ہوئی یہ۔ عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے۔ اگر وہ ایسی ہی ہوتی تو میں پوچھتی کیوں بھلا۔ معاملہ تو یہ ہے کہ وہ بڑی عجیب و غریب نظر آتی ہے' چھے ماہ ہوئے۔ اس مکان میں آئے ہوئے۔ مگر کیا مجال' جو کسی سے ایک لفظ بھی کہا ہو اس نے۔

رشیدہ : پھر کیا ہوا!

زینت : گویا کچھ ہوا ہی نہیں؟ ہو نہ!

رشیدہ : بات صرف اتنی ہے کہ وہ کچھ ڈرتی ہے میل ملاپ سے۔

زینت : کیوں؟

رشیدہ : کیوں؟ (مسکراتی ہے) یہی تو اصل قصہ ہے۔ ڈرتی ہے اس طرح شاید بھید کھل جائے۔

زینت : (اور قریب آکر) یہی تو میں بھی پوچھتی ہوں۔ یہ بھید کیا ہے؟ جانتی ہو آپا سب کچھ پر بتاتی نہیں ہو!

رشیدہ : میں نے کب کہا یہ بھید مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہے اور خوب معلوم ہے پر سن کر کرو گی کیا؟ یہی سمجھ لو بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمسایوں سے کم بولتی ہیں اور بعض تو بولتیں ہی نہیں۔ یہ تمھاری ہمسائی انھیں عورتوں میں سے ایک ہے۔

زینت : (روٹھ جانے کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوے) نہ بتاؤ آپا!

رشیدہ : اچھا بابا سن لو (سرگوشی کے انداز میں) یہ محبت کا کرشمہ ہے۔

زینت : محبت کا کرشمہ!

رشیدہ : بچپن میں اسے کسی سے محبت تھی۔ بڑی گہری محبت۔ دونوں ایک ہی جگہ کھیلتے تھے۔ ایک ہی جگہ پڑھتے تھے۔ رشتے دار تھے نا۔ خیال تھا ہمیشہ ساتھ رہیں گے اور دنیا کو اپنے لیے جنت بنالیں گے (آہ بھر کر) محبت کے خواب دیکھنے والے یہی بات سوچا کرتے ہیں مگر دنیا والے سخت سنگدل ہیں، کسی کی محبت کو پروان چڑھتے دیکھ نہیں سکتے۔

زینت : آپا تم نے تو افسانہ سنانا شروع کر دیا۔ سمجھ لیا ان میں محبت تھی آگے کہو کچھ۔

رشیدہ : (آہ بھر کر) محبت تھی ان بے چاروں میں!

زینت : مانتی ہوں ہو گی اور ضرور ہو گی۔

رشیدہ : یہ بے صبری مجھے پسند نہیں۔

زینت : ہائے اللہ ! تم تو ناراض ہی ہوگئیں۔ (منانے کے انداز میں) میری اچھی آپا!

رشیدہ : تمھیں کیا خبر محبت کیا ہوتی ہے ؟ وہی جانتا ہے جس کے دل میں یہ آگ بھڑک چکی ہو۔ خیر ان دونوں کو آپس میں بڑی گہری محبت تھی مگر اس عورت کی شادی کہیں اور ہو گئی۔

زینت : اس ہمسائی کی شادی ؟

رشیدہ : اور کس کی بات کر رہی ہوں ؟ (آہ بھر کر) محبت کا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ بے چاری اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی کہ ایک دن ایک خط آیا۔ یہ اس کے محبوب کا خط تھا۔ بدقسمتی سے یہ خط اس کے شوہر نے دیکھ لیا۔ تعلقات میں تلخی پیدا ہو گئی۔ شوہر سے الگ ہوگئی ـــ بس الگ ہوگئی اور ـــ

زینت : اور اب یہاں رہتی ہے۔

رشیدہ : اور کیا؟ یہ راز اپنے تک ہی رکھنا سن لیا! کسی کا بھید دوسروں کو کیوں بتایا جائے بے چاری دکھی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے۔

زینت : اچھا آپا!

(جمیلہ آتی ہے زینت کی ہم عمر ہوگی۔ ہاتھ میں اون اور سلائیاں ہیں۔
زینت کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے)

آؤ جمیلہ ! اتنی جلدی آگئی ہو۔ بھائی جان آگئے کیا؟

جمیلہ : صبح ناشتہ کر کے چلے گئے تھے۔ عموماً ایک بجے کھانا کھانے آتے ہیں مگر آج نہیں آئیں گے۔ میں نے کہا چلو رشیدہ آپا کے پاس جائیں دھوپ میں بیٹھیں۔

رشیدہ : میں ذرا نیچے دیکھ آؤں۔ شاید وہ آگئے ہیں۔

(رشیدہ اٹھ کر چلی جاتی ہے)

زینت : (رازدارانہ لہجے میں) آج بھید معلوم ہوا نئی ہمسائی کا۔

جمیلہ : اچھا۔ بتاؤ تو۔

زینت : بتاؤ گی تو نہیں کسی کو۔ آپا رشیدہ سے پکا وعدہ کیا ہے کہ میں کسی کو بتاؤں گی نہیں۔

جمیلہ : میں کیوں بتانے لگی کسی کو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا! میری عادت جانتی ہو۔ سینہ سمندر ہے میرا۔ جو کچھ ڈالوں غرق۔

زینت : جو کچھ ڈالوں غرق (مسکرا کر جمیلہ کی طرف دیکھتی ہے) خوب!

جمیلہ : مذاق نہ سمجھو زینت! سچ کہتی ہوں۔ مجھے تو لگائی بجھائی کرنے والوں سے سخت نفرت ہے۔ اپنا تو کام یہ ہے کہ سب کی سنو اور بھول جاؤ۔

زینت : بات یہ ہے کہ ہماری یہ نئی ہمسائی جو ایک معمابنی ہوئی ہے' محبت کی زخم رسیدہ ہے۔ بچپن میں کسی سے محبت ہو گئی تھی مگر وہاں شادی نہ ہو سکی۔

جمیلہ : (مسکرا کر) پھر؟

زینت : مسکرا کیوں رہی ہو؟

جمیلہ : تم بتاتی جاؤ ... واقعہ شاید یہ ہو گا کہ ایک دن اس کے محبوب کا خط آیا ہو گا اور اس کے شوہر نے ...

زینت : رشیدہ آپا تو کہتی تھیں کہ یہ بھید کسی کو معلوم ہی نہیں!

جمیلہ : دیکھ لو ... ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے سب کچھ۔

زینت : تم نے کسی سے یہ حادثہ سن لیا ہو گا۔

جمیلہ : اگر یہ حادثہ نئی ہمسائی کے متعلق ہے تو غلط ہے۔

زینت : نئی ہمسائی کے متعلق نہیں تو اور کس کے متعلق ہو گا؟

جمیلہ : کسی سے کہو گی تو نہیں؟

زینت : واہ میں کیوں کہوں گی!

جمیلہ : (بڑی رازداری سے) یہ اس کا اپنا قصہ ہے۔

زینت : رشیدہ آپا کا اپنا؟

جمیلہ : ہاں۔

زینت : ہائے ... میں خود حیران تھی کہ یہ محترمہ بار بار آہیں کیوں بھر رہی ہیں؟

جمیلہ : اب سنو!

زینت : کیا؟

جمیلہ : مجھے بھید معلوم ہے ... نئی ہمسائی کا۔

زینت : کیا؟

جمیلہ : معمولی سی بات ہے۔

زینت : ہوں (بڑے اشتیاق سے) بتاؤ نا جمیلہ!

جمیلہ : اسے بچپن سے ایکٹرس بننے کا شوق تھا۔ بڑی ہوئی تو یہی شوق لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ دن بھر فلم کمپنیوں میں ماری ماری پھرتی ہے اور رات کو آکر سو جاتی ہے۔ کسی کو اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ایکٹرس ہے۔ کسی کو بھید معلوم نہ ہو جائے۔ اس لیے سب سے الگ تھلگ رہتی ہے۔

زینت : تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوا؟

جمیلہ : ایسی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

زینت : عجیب معاملہ ہے۔ ایکٹرس بننے کا شوق مجھے بھی کسی زمانے میں تھا۔ یہ بچپن کا قصہ ہے۔

جمیلہ : شوق تو مجھے بھی بڑا تھا اور جوانی تک رہا۔ گھر والوں سے چھپ چھپ کر فلمی رسالے پڑھا کرتی تھی۔ کیا کہوں تم سے تنہائی میں کیا کچھ سوچا کرتی تھی ... (آہ بھر کر) سوچا کرتی تھی کہ اگر مجھے سکرین پر آنے کا موقع مل جائے تو کمال کر دکھاؤں گی۔

زینت : (مسکرا کر) "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

(نکہت آتی ہے۔ نکہت بائیس تیئس برس کی خوش وضع عورت ہے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

نکہت : ارے میں نے کہا زینت!

زینت : کیا ہے؟

نکہت : کیا باتیں ہو رہی ہیں جمیلہ سے۔ آپا کہاں ہیں؟

زینت : آپا ذرا نیچے گئی ہیں اور جمیلہ سے اس وقت بڑی خاص باتیں ہو رہی تھیں۔

نکہت : ہو رہی تھیں۔ ہو نہیں رہیں ؟

زینت : جمیلہ کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی ہے۔

نکہت : نئی ہمسائی والا قصہ تو نہیں چل رہا تھا۔ سچ کہو !

جمیلہ : اس میں کیا شک ہے ؟

نکہت : پتہ نہیں تو نے کیا بتایا ہے زینت کو۔ مگر جو بات میں نے معلوم کی ہے وہ غلط ثابت ہو ہی نہیں سکتی اور غلط ہو بھی کیوں ؟

زینت : کیا ہے ؟

نکہت : گویا بتا ہی دوں ؟

زینت : بتاؤ گی کیوں نہیں ؟

نکہت : اصل بھید معلوم ہو گیا ہے۔

جمیلہ : واقعی بتاؤ نا !

نکہت : روز سوچتی تھی کسی طرح یہ بھید معلوم کر لوں۔ کوئی بات سوجھتی ہی نہیں تھی۔ کل اس کی ماما بازار سے مچھلی خرید کر لا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر بلا لیا اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر بھید معلوم کرنے کی کوشش کی ... اس نے صاف صاف تو نہیں بتایا ... پر ... میں نے جو نتیجہ نکالا۔ وہ غلط نہیں ہے۔

زینت : کیا ہے نتیجہ ؟

نکہت : سچی بات یہ ہے کہ بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کسی کی عزت کا سوال ہے۔

(رشیدہ واپس آکر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

جمیلہ : رشیدہ آپا ! سنو نکہت نئی ہمسائی کا بھید معلوم کر کے آئی ہے۔

رشیدہ : ابھی تو بھئی عزت کا سوال درپیش ہے۔

(سب ہنستی ہیں)

زینت : بتاؤ نا؟

نکہت : یہاں غیر کون ہے۔

رشیدہ : ہاں کوئی حرج نہیں۔ اپنی اپنی سمجھ کا معاملہ ہے ...

(ایک لڑکی آتی ہے)

لڑکی : (نکہت سے) باجی، آگئے ہیں بھائی جان۔ کہتے ہیں جلدی آؤ۔

نکہت : آتی ہوں۔ تم جاؤ!

لڑکی : جلدی آجائیے باجی! کہتے ہیں میرا نیا سوٹ نکالو آکر۔

نکہت : سن لیا ہے۔ ایک منٹ میں آتی ہوں۔ چلو تم۔

(لڑکی چلی جاتی ہے)

زینت : لو نکہت! اب تو تمھاری بہن چلی گئی ہے۔

نکہت : (سرگوشی کے انداز میں) کسی کے ساتھ چلی گئی تھی مگر وہ جانے اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے۔ اب بے چاری تنہا زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

زینت : گزارہ کیوں کر ہوتا ہے۔

نکہت : زیور بیچ کر گزارہ کر رہی ہے اور کیا کر سکتی ہے؟ جب سب کچھ ختم ہو جائے گا تو ایکٹرس بن جائے گی۔ یا شاید واپس چلی جائے۔ ہمیں کیا پتہ کیا کرے گی۔ لو بھئی (اٹھ بیٹھتی ہے) میں تو چلی۔ شاید آؤں ان کے چلے جانے کے بعد۔

(نکہت چلی جاتی ہے)

رشیدہ : (مسکرا کر) توبہ۔

زینت : توبہ کیسی آپا!

رشیدہ : سمجھتی ہے، جیسے کسی کو معلوم ہی نہیں، لیکن ایسی باتیں کبھی چھپی نہیں رہ سکتیں۔ کسی کو پتہ ہو نہ ہو۔ ہمیں تو خبر ہے۔

جمیلہ : الٰہی خیر! کس بات کا پتہ آپا!

رشیدہ : بچاری نئی ہمسائی پر الزام لگا رہی ہے۔ سچ ہے آئینے میں اپنی شکل ہی دکھائی دیتی ہے۔

جمیلہ : ذرا کھل کر کہو آپا! بھلا ہم جاہل کیا جانیں۔

رشیدہ : ہم کیوں دوسروں کا بھید کھولیں۔ چپ رہنا ہی بہتر ہے مگر چالاکی کی داد دیتی ہوں۔ کس صفائی سے اپنا اقدام نئی ہمسائی پر لگا دیا ہے۔

زینت : یہ پہیلی نہیں بوجھی جاتی ہم سے آپا۔

رشیدہ : اسے اپنے تک رکھنا۔ کہیں سر پھٹول نہ ہو جائے۔ مجھے اس کی ایک پرانی سہیلی نے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں گھر سے چلی گئی تھیں محترمہ۔

زینت اور جمیلہ : (ایک ساتھ) اچھا!

رشیدہ : لیکن حالات بگڑے نہیں۔ باپ نے جلدی شادی کر دی۔ دیکھو تو بظاہر کتنی مسکین نظر آتی ہے۔ ہے نا!

زینت : (مایوسی سے) وہ معما تو حل نہیں ہوا۔

جمیلہ : (زینت کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) حل ہو چکا ہے اور چاہتی کیا ہو؟

زینت : منہ نہ کھلواؤ رشیدہ آپا۔

رشیدہ : کیا مطلب؟

(نکہت آتی ہے)

جمیلہ : چلے گئے بھائی جان، نکہت!

نکہت : چلے جائیں گے ابھی۔

(رقیہ آتی ہے)

زینت : آؤ رقیہ! بس تمھاری کسر تھی۔

جمیلہ : معلوم ہوتا ہے کوئی بڑی عجیب و غریب بات ـــــ سنانے آئی ہے اور سنانے کے لیے بے تاب ہے۔

رقیہ : (مسکرا کر) آج ان محترمہ کے حالات معلوم ہو گئے ہیں۔

زینت : (بے چینی سے) نئی ہمسائی کے حالات ؟

رقیہ : اور کیا؟

زینت : کہو تو!

رقیہ : معاملہ اصل میں یہ تھا کہ اس کا شوہر کسی مقدمے میں گرفتار ہو کر جیل جا چکا ہے۔ اس نے اپنے والدین اور سسرال پر بار بننا گوارا نہ کیا۔ کسی دفتر میں ملازمت کرنے لگی۔ عزیزوں نے سخت مخالفت کی تو اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آگئی۔ اب ملازمت کرتی ہے۔ بس یہ بات ہے۔ سنا ہے تعلقات پھر خوشگوار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آج۔

زینت : کیا خوب (بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

رقیہ : اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟

زینت : (زیادہ ہنس کر) اور کیا کیا جائے ؟

(رقیہ' زینت کو گھور کر دیکھتی ہے۔ باقی عورتیں دل چسپی سے یہ منظر دیکھ رہی ہیں)

رقیہ : عجب بھونڈا مذاق ہے!

زینت : رقیہ بہن ! کہیں تم پر تو یہ افتاد نہیں پڑی۔ ہمارے بھائی صاحب خیریت سے ہیں نا۔ میرا مطلب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جیل ---

رقیہ : میں کہتی ہوں دماغ تو نہیں چل گیا تمھارا۔ چپ رہو ہمارے منہ میں بھی زبان ہے۔

نکہت : تو رقیہ بہن ! کسی دفتر میں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے۔ مالی حالت کمزور ہے۔

رقیہ : رشیدہ آپا! یہ تو پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہے۔

نکہت : رقیہ' ہاں یاد آیا۔ اس کیس کا کیا بنا۔ تمھارے شوہر پر رشوت کا الزام لگایا گیا تھا۔

رقیہ : سب بکواس' جھوٹ' بہتان۔

زینت : ویسے ہماری رقیہ بہن تعلیم یافتہ ہیں۔ دفتر میں ملازمت کر سکتی ہیں۔

رقیہ : تم پاگل ہو گئی ہو زینت' بالکل پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔

زینت : میں پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہوں۔ یہ بھی خوب رہی۔ اور تم کون ہو۔ تم سب کی

سب اپنی نئی ہمسائی کی شکل میں اپنا ماضی دیکھ رہی ہو۔ اپنے اندیشوں کی پرچھائیں محسوس کر رہی ہو۔ تمھارا ماضی ابھی تک تمھارے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ تمھارے اندیشے دھواں بن کر تمھارے دماغوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس عورت کو تم نے ایک معما بنا دیا ہے۔ جب تک میں خود جاکر اس کی باتیں سن نہیں لوں گی چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ تم نے میرا اضطراب بڑھا دیا ہے۔ میری بے چینی دگنی کر دی ہے۔ میں خود اس کے پاس جاتی ہوں اور اس کی زبانی اس کے حالات سنتی ہوں۔

(زینت اٹھ کر جانے لگتی ہے)

نکہت اور جمیلہ : (ایک ساتھ) زینت!

زینت : میں ضرور جاؤں گی!

نکہت : تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو۔

رقیہ : جانے دو اسے۔ جائے گی کہاں!

زینت : کیوں۔ میں جا رہی ہوں۔ ابھی ‘اسی وقت ‘اسی لمحے جا رہی ہوں۔

رقیہ : وہ خیر سے چلی گئی ہے گھر چھوڑ کر۔ جاؤ۔ شوق سے جاؤ۔

(زینت کے قدم رک جاتے ہیں اور پردہ تیزی سے گرتا ہے)

(پس پردہ)

سوالات

۱۔ میرزا ادیب اپنے ڈراموں میں عام زندگی کے کرداروں کی باہمی کشمکش اور تصادم کو موضوع بناتے ہیں۔ ڈراما "نئی ہمسائی" کے پیش نظر بحث کیجیے۔

۲۔ ڈراما نئی ہمسائی میں عورتوں کی نفسیات اور دبی ہوئی خواہشات کو موضوع بنایا گیا ہے؟ کیا یہ صحیح ہے۔

۳۔ زیر نظر ڈرامے کا نقطہ عروج کیا ہے؟ اور وہ ڈراما نگار نے کس طرح پیش کیا؟

۴۔ نئی ہمسائی کے کردار و اطوار سے متعلق اس کی ہمسائیوں نے کیا کیا باتیں بنائیں؟

—— ○○○ ——

مضمون ' انشائیہ

اہم خارجی خصوصیات کے اشتراک کی وجہ سے جن میں موضوع کی وسعت ' ہیئت کی لچک ' زبان و بیان کی ندرت اور اختصار شامل ہیں۔ مضمون اور انشائیہ کو اکثر ایک ہی صنف ادب کی دو صورتیں شمار کیا جاتا رہا ہے یعنی اردو میں انگریزی ایسے "Essay" کی صورت۔ لیکن ان کے داخلی اور موضوعی اختلافات کی وجہ سے جو دراصل گہرے اور بنیادی ہیں ' اب ان میں واضح امتیاز کیا جانے لگا ہے۔ مضمون نگاری کسی بھی موضوع پر مدلل ' سنجیدہ اور منطقی ایسی معروضی تحریر ہے جس کا مقصد کسی حقیقت ' خیال یا نقطہ نظر کو قاری تک پہنچانا ہے۔ زبان و بیان کی دلکشی اور اسلوب کی ندرت بھی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جب کہ "انشائیہ" ایک داخلی ' ذاتی اور شخصی ایسی موضوعی تحریر ہے جس کا اسلوب اور بیان کسی خارجی مقصد کا تابع نہیں بلکہ لکھنے والے کی شخصیت ' اس کے زندگی کے مجموعی تصور اور انفرادی احساس کا اظہار ہے۔ مضمون اور انشائیہ دونوں کے موضوعات لامحدود ہیں لیکن جہاں مضمون زیر بحث موضوع کو مکمل طور پر معروضی اور منطقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے وہاں انشائیہ کی خصوصیت ' داخلی انداز ' رمز و ایمائیت اور شخصی نقطہ نظر ہے۔

مضمون اور انشائیہ دونوں کے ابتدائی نمونے سرسید احمد خاں کے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً امید کی خوشی ' خوشامد ' بحث و تکرار وغیرہ۔ لیکن ان کی تحریریں انشائیہ سے زیادہ مضامین ہیں۔ سرسید کے بعد لکھنے والوں میں حالی ' شبلی ' شرر ' سجاد حیدر یلدرم ' شیخ عبدالقادر ' فرحت اللہ بیگ ' رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان ادیبوں نے بھی مضمون اور انشائیے میں کوئی واضح فرق کیے بغیر لکھا۔ جدید دَور میں البتہ انشائیہ کو مضمون نگاری سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے اور انشائیہ لکھنے والوں میں مشکور حسین یاد ' وزیر آغا وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

—— ○○○ ——

سرسیّد احمد خان

(۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء)

سید احمد خاں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد متقی تھا جو مغلیہ دربار سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ابتدا میں دربار مغلیہ سے متعلق ہوئے لیکن بعد ازاں انگریزی عمل داری میں ملازمت کر لی اور جلد ہی ترقی کر کے منصف کے عہدے پر پہنچ گئے۔

سرسید احمد خاں کی زندگی کا اہم مشن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا جب انھوں نے مسلمان قوم کے زوال کا احساس کیا اور ان کی بہتری کی تدبیریں شروع کیں۔ انھوں نے جنگ آزادی کی ناکامی اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کا احیا اور ان کی ترقی جدید تعلیم کے حصول میں مضمر ہے اور جب تک مسلمان قوم جدید سائنس اور علم و فن میں مہارت حاصل نہ کرے اسے ترقی حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا وہ پوری توجہ اور انہماک سے اس مقصد کے حصول میں مشغول ہو گئے اور تمام عمر اس مشن میں مصروف رہے۔ مسلمانوں میں سائنس کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کی مشہور اور مستند کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں انگریزی طرز کے اسکول کی بنیاد رکھی جسے ۱۸۷۸ء میں کالج کا درجہ دیا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علوم و فنون کے احیا کا مرکز قرار پایا۔ ان کے اہم کارناموں میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجرا اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ہے جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

سرسید کا ادبی کارنامہ ان کے اسی مشن کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے خیالات مسلمانوں کے وسیع ترین طبقات تک پہنچانا چاہتے تھے جس کے لیے انھوں نے صاف ' سادہ ' عام فہم اور بیانیہ نثری اسلوب اختیار کیا۔ سرسید کے زیادہ تر خیالات اپنے وقت کے لحاظ سے جدید ' نئے اور اجتماعی حوالے رکھتے تھے جن کو انھوں نے براہ راست اور بے تکلفی سے بیان کرنے کی روایت کی بنیاد رکھی۔ لیکن کہیں کہیں طویل جملے اور قواعد کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس دور میں سلیس و سادہ انداز بیان نے فروغ پایا۔ سرسید نے انگریزی (Essay) کی طرز پر اردو میں کچھ ہلکے پھلکے لیکن کارآمد ' بامقصد اور معاشرتی حوالے رکھنے والے مضامین بھی لکھے جن کو اردو انشائیہ کے اولین نمونے خیال کیا جاتا ہے۔ ان کا مضمون "دنیا بامید قائم ہے" ایک ایسی ہی تحریر ہے جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئی تھی۔

سرسید احمد خاں کی اہم کتابوں میں "آثار الصنادید" ' "رسالہ اسباب بغاوت ہند" ' "قرآن مجید کی تفسیر" "خطباتِ احمدیہ" ' "تصحیح آئینِ اکبری" ' "تاریخ سرکشیِ بجنور" "سفرنامہ انگلستان" اور "مضامین تہذیب الاخلاق" شامل ہیں۔ سرسید احمد خاں کی تحریروں اور ان کی تحریک کے اثر سے اردو

ادب جدید دور میں داخل ہوا اور اس میں قومی و ملکی مسائل اور اجتماعی و معاشرتی معاملات کے متعلق خیالات و تصورات کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

دُنیا بامُید قائم ہے

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بری ہو، انسان کے دل کے مشغلہ کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج و خوشی، محبت و دوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں۔ اس لیے اس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پتلے کو بنایا، اس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لیے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی اور ہمیشہ اور ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔ ان ہی قوتوں کے ذریعہ گزری ہوئی باتیں پھر دل میں آتی ہیں اور آئندہ کی باتوں کا ان کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم 'یاد' کہتے ہیں، ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے۔ جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لیے نہیں ملتی تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلالاتی ہے اور اسی کے ذکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل کے مشغلہ کو بلالاتی ہے اسی طرح ایک اور قوت ہے جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے اور جس کا نام امید و بیم یا خوف و رجا ہے۔ ان ہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانہ تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باتیں کہ دور زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں اور ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں اور بڑے گہرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں۔ ان کے ہونے سے پہلے ان کی خوشی یا رنج اٹھانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کا بھی جب نہ کوئی زمین ہوگی نہ آسمان۔ اور ہر چہار طرف سے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْم[1] کی آواز آتی ہوگی کا بھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف موجودہ وقت پر محدود ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ میں اس تحریر میں صرف اسی کا کچھ بیان کروں جس کو "امید" کہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں اس قدر کم و چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی جس سے انسان ان عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا ان کے ہونے سے پہلے مزہ اٹھاتا ہے جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہے تو

۱۔ آج کے دن بادشاہی کس کی ہے۔

ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہے کہ "ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی امید رکھنی چاہیے کیوں کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہو سکے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو خدا ہم کو دے نہ سکے۔"

فارسی زبان میں مشہور مقولہ ہے "تمنا را عیبے نیست"[1] ایک ظریف نے کہا کہ دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں ہے کیوں کہ امید مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہے۔ دوستوں نے پوچھا کہ کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں ہے اس نے کہا کہ کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں کیوں کہ خدا اس پر بھی قادر ہے کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت نہ ہو اور مجھ کو امید ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔ یہ قول تو ایک ظرافت کا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی امید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بد تر حالت کسی کی نہ ہوتی۔ زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی۔ امید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ امید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی اور بردباری اور خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے۔ گویا امید انسان کی روح کی جان ہے۔ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے، محنت پر رغبت دلاتی ہے اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔ امید سے ایک اور بھی فائدہ ہے جو کچھ کم نہیں ہے کہ ہم موجودہ خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے اور اسی میں محو نہیں ہو جاتے۔ سیزر[2] نے جب اپنا تمام مال اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اپنے لیے کیا رکھا۔ اس نے کہا کہ امید۔ اس کی عالی طبیعت ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی جو اس کے پاس تھیں بلکہ ہمیشہ اس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

اگلے زمانے میں لوگ بغیر امید کے زندگی کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے۔ نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھجوایا۔ جب اس کو کھولا تو اس میں سے ہر ایک قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اور بیماریاں جو انسان کو ہوتی ہیں سب نکل پڑیں۔ امید بھی اسی صندوقچہ میں تھی وہ نہ نکلی بلکہ ڈھکنے میں چمٹ رہی اور صندوقچہ ہی میں بند ہو گئی تاکہ مصیبت کے وقت انسان کو تسلی دے۔ پس جس زندگی میں امید ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں ہے خصوصاً جب کہ امید ایک عمدہ چیز کی اور اچھی بنا پر اور ایسی چیز کی ہو جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر

۱۔ خواہش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲۔ رومن بادشاہ

سکتی ہو۔ اس بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوش حال آدمی کے لیے بھی زمانہ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت سی امیدیں ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا خوش کر سکتی ہیں۔ دینی چیزوں کی امیدیں دنیوی چیزوں کی امیدوں سے بہت زیادہ قوی اور مضبوط ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتقاد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہے۔ اس قسم کی امیدوں کا خیال ہی ہم کو پورا پورا خوش رکھتا ہے۔ بلاشبہ امید کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت شیریں ہو جاتی ہے۔ اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اس پر صبر تو ضرور آجاتا ہے مگر مذہبی امیدیں اس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہیں۔ تکلیف کی حالت میں دل کو سنبھال لیتی ہیں بلکہ اس کو اس خیال سے خوش رکھتی ہیں کہ شاید یہی تکلیف اس امید کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو۔ مذہبی امید گویا مردہ کو زندہ کر دیتی ہے اور اس کے دل کو غایت درجہ کی خوشی بخشتی ہے۔ انسان اپنی تکلیفوں میں خوش رہتا ہے اور روح اس بڑی چیز کے لپک لینے کو اچھلتی ہے جو ہمیشہ اس کی نظر میں رہتی ہے، اور آخر کار اس امید کی خوشی میں اس فانی جسم کو چھوڑ دیتی ہے کہ قیامت کے دن اس سے مل جاوے گی۔

(مضامینِ سرسید)

سوالات

۱۔ سرسید احمد خاں کے کچھ مضامین میں اردو انشائیہ کے اولین آثار پائے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں انشائیہ کی جو خصوصیات موجود ہیں، ان کی نشان دہی کریں۔

۲۔ سرسید احمد خاں کی تحریریں قومی اور معاشرتی حوالے رکھتی ہیں۔ مندرجہ بالا مضمون میں ایسے حوالوں کو نمایاں کریں۔

۳۔ اوپر دیے گئے مضمون کے نثری اسلوب سے سرسید احمد خاں کے طرزِ تحریر کی کیا خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں؟

۴۔ "امید" کے موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون لکھیے۔

— ○○○ —

مولانا محمد حُسین آزاد

(۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزاد اردو ادب کے عظیم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا جن کا یہ امتیاز ہے کہ وہ شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانیوں میں سے ہیں۔ آزاد نے دلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ شعرو ادب کا شوق بچپن سے تھا۔ استاد ابراہیم ذوق ان کے والد کے دوستوں میں سے تھے لہٰذا آزاد نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں ان کے والد شہید کر دیے گئے۔ آزاد چھپ چھپا کر دلی سے نکلے اور آخر کار لاہور پہنچ گئے۔ یہاں مختلف ملازمتیں کیں اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے۔ آخری عمر میں خلل دماغی میں مبتلا ہوئے اور زندگی کے آخری بیس سال اسی حالت میں بسر کیے لیکن اس حالت میں بھی تصنیف کا کام جاری رکھا۔ لاہور میں آزاد کا ورود و قیام اردو ادب کے مطلع پر دبستانِ لاہور کا آغاز ثابت ہوا۔

آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب، مورخ، نقاد، ماہرِ لسانیات و فرہنگ، تمثیل نگار، مرقع نگار، تذکرہ نگار، شاعر اور استاد تھے۔ ان کی نثر اسلوبِ بیان کا ایک رنگین اور دل فریب شاہکار ہے جس نے ان کے بعد آنے والے ادیبوں کے ایک وسیع گروہ کو متاثر کیا۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ اردو میں جدید طرزِ شاعری کا آغاز ہے جس کی ابتدا انجمن پنجاب لاہور کے شاعروں سے ہوئی جس کے وہ سیکرٹری تھے۔ اسی انجمن کے جلسہ منعقدہ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں انھوں نے اپنا ایک مضمون "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" پڑھا۔ یہ اردو ادب اور تنقید میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا جس میں شاعری کی ماہیت، نوعیت، شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے درمیان تعلق اور فرق، شاعر کے کردار اور شاعری کی مقصود و غایت پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں جو بنیادی مباحث اٹھائے گئے تھے وہ آج بھی ادبی تنقید کا اہم موضوع ہیں۔ یہی مضمون جو ان کے اسلوبِ بیان کا بھی اہم نمونہ ہے نیچے پیش کیا گیا ہے۔

آزاد نے ساری عمر لکھنے پڑھنے میں بسر کی ان کی اہم کتابوں میں "آبِ حیات" "سخن دانِ فارس" "دربارِ اکبری" "نیرنگِ خیال" "قصص الہند" اور "نظمِ آزاد" مشہور ہیں۔

نظم و کلام موزوں کے باب میں خیالات

فلاسفہ یونان کا قول ہے کہ دنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں۔ اول نبضِ انسانی کہ بے گویائی حالِ باطن کا بیان کرتی ہے۔ دوم شعر کہ انھیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیت اور اس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام

موزوں و مقفیٰ لکھے ہیں۔ لیکن در حقیقت چاہیے کہ وہ کلام موثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزہ نہیں۔ کھٹا نہ میٹھا۔ جیسا کہ یہ شعر کسی استاد کا ہے :

دندانِ تُو جملہ در دہانند
چشمانِ تُو زیرِ ابرو آنند [1]

جب انسان کے دل میں قوتِ گویائی اور جوشِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور اس قوت کا جوش و خروش زیادہ ہو گا اسی قدر کلام پُرتاثیر ہو گا۔ روئے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدمؑ کے دل پر طاری ہوا۔ اسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیے کہ باوجودیکہ اس وقت تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا۔ مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اس وقت ان کی زبان سے نکلا موزوں تھا۔ چنانچہ وہ سریانی میں اب تک موجود ہے۔ جبکہ اصل کلام موزوں کی حضرت آدمؑ سے ہوئی۔ تو فرزند رشید وہی موزوں طبع ہے کہ جو باپ کی میراث سے بہرہ ور ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس قوتِ انسانی بھی اسی میں کامل سمجھنی چاہیے جس میں قوتِ گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ تر زورِ طبیعت سے نکلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے مؤثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون، کوئی مطلب، کوئی خیال جو انسان کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہے تو تکلم سے نقشِ مدعا کو رنگِ تقریر میں لاتا ہے تاکہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصور ہے۔ لیکن نہ وہ مصور کہ خَر و اُشتر، درخت و پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا مصور ہے کہ معنیٰ کی تصویر صفحۂ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینیِ فصاحت سے عکسِ نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا جن کی تصویر مصور سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے مگر صد ہا سال سے آج تک ان کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کبھی تصویرِ غم صفحۂ دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی مضامینِ فرحت و عیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہائے مرتبہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے۔ اہلِ عرب معرکہ ہائے قتل میں رُجز خوانی کرتے تھے۔ سلاطینِ ہند کے ہاں صفِ جنگ

---

[1] اے محبوب تیرے سارے دانت تیرے منہ کے اندر ہیں اور تیری آنکھیں تیرے ابروؤں کے نیچے ہیں۔

میں سور، ویر[1]، راوت[2]، بھاٹ[3]، وہ کڑکے۔ کوت[4] کہتے تھے کہ لوگ اپنی جانیں موت کے منہ میں جھونک دیتے تھے۔ اور اب تک یہ عالم ہے کہ جب سنے جاتے ہیں بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سکندرِ اعظم کتابِ ہومر[5] کو دیکھتا تھا۔ اور سوتے میں بھی جدا نہ کرتا تھا۔ شاعر اگر چاہے تو اموراتِ عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے۔ درختان یا دُرِ گل کو رواں کر دکھائے ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیے کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں میں ہیں۔ ترازو اس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے۔ جدھر چاہے جھکا دے۔

نظم درحقیقت ایک شاخ گل ریز، فصاحت کی ہے۔ جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغِ جسمانی تروتازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح ترو تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبویاں محسوسِ دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے کسی کی بو مُست ہے۔ کسی کی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن، اسی طرح مضامینِ اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھول کو کبھی چمن میں، کبھی ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر، کبھی عرق میں جا کر، کبھی دور سے، کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔

عالمِ جسمانی میں انسان کے لیے غذا مادۂ حیات ہے۔ اس طرح عالمِ معنی میں روح کے لیے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار و مضامینِ لطیف سے روح قوتِ کمال اور طاقت، بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اس کی غذا ہے۔ روح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے کہ وہ خاص روح القدس کے آفتابِ قدرت کا پرتوہ ہے۔ اسی سے شعر کے جوہرِ لطافت کو خیال کرنا چاہیے کہ نفاست میں کس مرتبہ عالی پر ہو گا۔ شاعر کو ایک نسبت خاص عالمِ بالا سے ہے۔ کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے ادھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتوہ روح القدس کا اور

۱۔ بہادر، دلیر، شجاع۔
۲۔ راجا، بہادر۔
۳۔ بھٹ، ہندوؤں کی ایک قوم جو اعلیٰ ذات کے راجپوتوں کے نسب نامے یاد رکھتی تھی اور گیت اور گن گاتی تھی۔
۴۔ رجز، جوش بڑھانے والے گیت۔
۵۔ مشہور کلاسیکی یونانی شاعر ہے جن کے رزمیے 'ایلیڈ اور اوڈیسی یہاں مراد ہیں۔

فیضان رحمتِ الٰہی کا ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہرا اپنے کلبۂ احزان میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح پر حکومت کرتا ہے جیسے کوئی صاحبِ خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے۔ اور بہ تصرف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اس کی جسے ایسے ملک معنی کی سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتوہ ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر۔ تاثیرِ معنوی کا ست ہے۔ روح کے لیے آبِ حیات ہے گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو بہلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی' اور ذہن کو قوتِ پرواز دیتا ہے۔ گردِ افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنیٰ ہیں۔ اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردّد میں غرق رہتا ہے لیکن ایک شعر کہُ کر جیسی اس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے۔ کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لطف طاقتِ تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔ اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے۔ صاحبِ درد ہی اسے خوب جانتا ہے کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ فضیلت اختیاری نہیں۔ یعنی موزونیِ طبع جو ہر خداداد ہے۔ اور اس نعمت کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

جنون بھی ایک طرح لازمہ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنوں کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنوں کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے۔

اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جسمانی محنت سے مرکھپ کر انھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطفِ شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں۔ ایک مصرع پُر درد ان کی زبان سے نہ نکلے۔ ان کا ذکر بھی انشاء اللہ اس سلسلے میں آئے گا۔

بعضے ایسے ہیں کہ ان سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انھیں موزوں و

ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضبِ الٰہی ہے خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کرسکیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان ان کی صاف ہے مگر مضامین عالی نہیں۔ چنانچہ ہر ایک کی جگہ پر بجائے خود اشارہ کیا جائے گا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جوشِ مضامین اور شگفتگیِ طبع کے لیے بعض بعض موسم خاص ہیں۔ چنانچہ فصلِ بہار اور موسمِ برسات میں طبائع موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں بلکہ ناموزوں اور مردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکت مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اول خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے۔ خواہ گھر میں گوشہ عافیت ہو، خواہ باغ صحرا، خواہ کنارِ دریا اور دل ہمہ تن اسی میں مصروف ہو۔

اکثر وقتِ شب جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے۔ تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سنسان ہو جاتا ہے، تب اس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے، خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے اور مضمون بہتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریبِ صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف اور ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظ پُر معانی زبان سے متراوش ہوتے ہیں۔

اس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت یا غم، رزم یا بزم کا باندھتا ہے، جتنی اس کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے، اتنا ہی اثر سننے والوں کے دل پر ہوتا ہے۔ دنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ شعر سنتے ہیں تو دل بے قرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے دل مثلِ آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کے سامنے اگر طلسماتِ معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو تو بھی انھیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورتِ دل ہے۔ کہ نورِ معنی اس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشن دلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروبِ آفتاب اور انقلابِ صبح و شام ہزاروں باغِ نو بہار قدرتِ الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہِ عالم ایک خراس یا گرداب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے۔

علمِ موسیقی کا لطف اور گلزارِ بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بے چارے ان کے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائیِ دل سے محروم ہیں وہ کیفیتِ شعر و فصاحتِ کلام

سے محروم ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آ جائیں تو بے شک شعر بالکل کارِ بے فائدہ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبعِ موزوں رکھتے ہیں اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صُرف کریں تو فائدہ و کسبِ دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ سرِ معنیٰ اور اصلِ سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صنّاع خبثِ طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آ سکتا۔ شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار کی، پس اس کے لیے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔ مسائلِ فلسفہ و حکمت جن سے اہلِ ہدایت ثبوتِ ذاتِ باری اور تصدیقِ وحدتِ الٰہی کرتے ہیں، اسی سے اہلِ ضلالت دہر و الحاد پر استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے ان کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آ سکتا اسی طرح شاعروں کی بدزبانی و بد خیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروشِ خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالاتِ پاک جوں جوں بلند ہوتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے۔ البتہ فصاحت و بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکامِ عصر کی قباحت ہے۔ انھوں نے جن جن چیزوں کی قدر دانی کی لوگ اس میں ترقی کرتے گئے۔ ورنہ اسی نظمِ شعر میں شعرائے اہلِ کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن کی بنا فقط پند و اندرز پر ہے اور ان سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و حکیم سنائی و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ امید ہے کہ جہل اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہو گی، فنِ شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔ آزاد۔

تمھاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

(مقدمۂ نظمِ آزاد)

سوالات

۱۔ شاعری کی ماہیت کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ "شعر ایک پرتوہ روح القدس کا اور فیضان رحمتِ الٰہی کا ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے" اس سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

۲۔ "اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس قوت انسانی بھی اس میں کامل سمجھنی چاہیے جس میں قوت گویائی کامل ہو۔" آزاد کے اس نظریے پر شاعر اور شاعری کے حوالے سے بحث کریں۔

۳۔ شاعری اور دوسرے فنون میں آزاد نے کچھ مشترک اور کچھ اختلافی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کی وضاحت کریں۔

۴۔ شاعری کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ شاعری کی خصوصیت فطری اور ودیعتی ہے، یہ انسان کو روحانی اور قلبی مسرت دیتی ہے اور اس کی اصل "خیر" اور "نیکی" ہے؟ بحث سے واضح کریں۔

۵۔ شاعری کے مقصود و غایت کے بارے میں آزاد کا کیا خیال ہے؟

۶۔ "شاعری محض کلام موزوں کا نام نہیں" بحث کریں۔

— ○○○ —
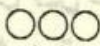
عبدالحلیم شرر

(۱۸۶۰ء - ۱۹۲۶ء)

عبدالحلیم شرر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تفضل حسین آخری تاجدار اودھ، واجد علی شاہ کے طبیب خاص تھے۔ واجد علی شاہ کے کلکتے نظربند ہونے پر وہ بھی "مٹیا برج" گئے۔ شرر بھی ہمراہ تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی۔ مٹیا برج میں قیام کے دوران میں انھوں نے عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی و فرانسیسی بھی سیکھی۔ ۱۹ سال کی عمر میں واپس لکھنؤ آگئے اور "اودھ" اخبار سے وابستہ ہو گئے۔ یہ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز تھا جس کی طرف وہ ساری عمر پلٹتے رہے۔ ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا جس میں فطرت پرستی کا رومانوی رنگ غالب تھا۔ بہت جلد مقبول ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں پہلا ناول "دلچسپ" لکھا۔ کچھ عرصے بعد اپنا رسالہ "محشر" اور پھر "دلگداز" نکالا۔ "دلگداز" میں قسط وار ناول لکھتے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیتے۔ ان کے ناولوں، خاص کر تاریخی ناولوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد گئے۔ انگلستان کا سفر بھی کیا لیکن پھر لکھنؤ آگئے اور آخر عمر تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

شرر کی تصانیف کی تعداد نوے کے قریب ہے۔ ناولوں میں "فردوسِ بریں"، "منصور موہنا"، "ملک العزیز ورجنا"، "ایامِ عرب" مشہور ہیں۔ ان کے مضامین آٹھ جلدوں میں "مضامینِ شرر" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

شرر کا اسلوب بیان سادہ، رواں اور دلکش ہے۔ عبارت میں فارسی و عربی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن عام فہم۔ صحافت سے وابستگی اور مضمون نویسی کے باعث وسیع تر عوامی ذوق اور پسند کا خیال رکھ کر لکھتے تھے لیکن جدید خیالات و تصورات کے بھی شیدا تھے۔ ان کے مضامین اردو میں نئے خیالات اور تصورات و افکار کے فروغ کا باعث بنے۔ تاریخ و صحافت دونوں سے دلچسپی کے باعث ان کے ہاں اکثر قدیم حقائق کے ساتھ ساتھ نئی فکر اور جدید رجحانات کا امتزاج ملتا ہے۔

شادی و غم

دنیا میں کوئی چیز اور کوئی جذبہ انسانی نہیں ہے جس میں اسی قسم کی دو مخالف و متضاد کیفیتیں نہ ہوں۔ وہی نسبت جو دوزخ و جنت، اعلیٰ و ادنیٰ، لطیف و کثیف، مزے دار اور بے مزہ، پر لطف و بے لطف اور اچھے اور برے میں ہے وہی ان دونوں لفظوں میں بھی ہے۔ دنیا میں کوئی کیفیت اور کوئی حالت نہ ہو گی جو اسی قسم کی دو متقابل جہتوں اور ضدوں کی تابع نہ ہو۔ اور شاید اسی فلسفہ پر نظر کر کے زرتشتی مذہب کے عقلمندوں نے نور و ظلمت کا اصول قائم کر کے

ایسی تمام کیفیتوں کو اسی کے تابع کر دیا۔ اگرچہ اس میں زیادہ منہمک ہونے سے وہ اس عظیم الشان غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ خدا اور شیطان کو بھی ایسی ہی دو متبائن و متضاد قوتیں تسلیم کر لینے سے دو خداؤں کے قائل ہو گئے۔ اور ان لوگوں کی اصطلاح میں جو سچی توحید اور قوتِ یزدانی کے سب سے بالاتر ہونے کے معتقد و معترف ہیں ثنوی یعنی دو خداؤں کے ماننے اور مشرک ہونے کے ملزم ٹھہرے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر کیفیت اور ہر چیز میں یہ متضاد صورتیں محض اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ بغیر اس کے ایک دوسرے کا حسن و قبح معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ دن اس لیے دن ہے کہ رات کے بعد آتا ہے۔ اور رات اس لیے رات ہے کہ دن کے بعد آتی ہے۔ پھر ان دونوں کا باہمی مقابلہ ہر شخص کو اپنے خیال و مذاق کے مطابق اس امر کا فیصلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے اور کون برا۔ اور یہی حالت اور نسبت اسی طرح کی تمام کیفیتوں میں خیال کر لیجیے۔

فلسفیوں میں ایک نازک بحث پیدا ہوئی ہے کہ دنیا میں خوشی زیادہ ہے یا غم۔ اگر غور اور انصاف سے دیکھیے تو یہ بحث ہی ایسی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ دنیا میں دن زیادہ ہے یا رات زیادہ ہے۔ اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دونوں کے سرچشمے خدا نے یکساں درجے پر سیر اور کبھی نہ خشک ہونے والے پیدا کیے ہیں۔ مگر ہاں یہ ہماری استعداد اور قابلیت کا نتیجہ ہے کہ ان میں سے کس کو کس مقدار میں حاصل کرتے ہیں۔

جو لوگ صوفیہ کے خیالات کے زیادہ متبع ہیں اور خاصتہ "وہ جو دنیا کی ہر چیز کے چھوڑ دینے کو حقیقت و مذہب تصور کرتے ہیں۔ ان کا اکثر یہ دعویٰ ہوتا آتا ہے کہ انسان کو خوشی بہت کم ملی ہے اور غم زیادہ۔ وہ انسانی افکار و ترددات' زندگی کی مشکلوں اور دشواریوں' اس عالم ہستی کی ناکامیوں اور مایوسیوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ دنیا دارُ المحن ہے۔ اور اس میں بمقابلہ رنج و الم خوشی بہت ہی کم ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال قریب قریب ان لوگوں کا سا ہے جو اپنے تمام افعال و اعمال کو قسمت کے محول کر کے ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہنے کے موید ہیں۔

مگر وہ گروہ جو دنیا کے "مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ" ہونے کا قائل ہے ایسی پست ہمتی اور ایسے معطل محض بن جانے کے خیال کی تائید نہیں کر سکتا۔ واقعی جب خدا نے خوشی اور غم کے خزانوں کو یکساں طور پر مملو و معمور بنا کے ہمیں ان پر متصرف کیا ہے تو پھر یہ کہنا کہ ہمیں غم زیادہ دیا گیا ہے بظاہر ایک ناشکری کا سا خیال ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہمیں خوشی یا غم ان دونوں میں سے جو چیز نصیب ہوتی ہے وہ خود اپنے ہی ہاتھوں نصیب ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے حالات پر غور کرو۔ اپنی ضرورتوں کو نکتہ چینی کی نظر سے دیکھو۔ اور اس بات کا خیال کرو کہ جن چیزوں کی احتیاج و ضرورت کے ہم دعویٰ دار ہیں ان میں سے حقیقتاً" کتنی ضروری ہیں اور کتنی غیر ضروری۔ دنیاوی تکلفات میں پڑ کے ' تعلقات کو بڑھا کے اور اپنے حوصلوں اور اپنی آرزوؤں کو فضول وسعت دے کے ہم نے اپنی یہ حالت بنالی ہے کہ ہوسوں کا دامن کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اور زندگی کی کوئی گھڑی ایسی نہیں ہوتی جس وقت ہم کسی ضرورت کو نہ محسوس کر رہے ہوں۔

مسرت کیا چیز ہے ؟ نہ روپیہ ہے نہ پیسہ ہے ' نہ عالیشان قصرو ایوان ہیں ' نہ خدم و حشم ہیں ' نہ حکومت و سطوت ہے۔ اس لیے کہ اگر ان چیزوں سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی تو ہم کسی بادشاہ و امیر کو کبھی ملول و افسردہ نہ پاتے۔ ان کے دل میں اور ان کی امیرانہ بلکہ شاہانہ دھوم دھام میں سچ پوچھیے تو ہمارے غموں سے بڑے غم اور ہماری حسرتوں سے بڑی حسرتیں موجود ہیں۔ جس طرح ایک کوہستانی سلسلہ دور سے تمھیں نہایت مسطح ' پُر فضا اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور نزدیک سے جا کے دیکھو تو انتہا سے زیادہ غیر مسطح ' بہت ہی پُر خطر اور وحشت ناک نظر آتا ہے ' اسی طرح اے غریبی کی زندگی بسر کرنے والو ' امیروں اور بادشاہوں کی سطوت و حشمت اور ان کے عالیشان قصرو ایوان تمھیں دور ہی سے عشرت و مسرت کے مامن نظر آتے ہیں مگر ان کے قریب جا کے خود ان کی جگہ پر کھڑے ہو کے اور ان کی اصلی حالت کا اندازہ کر کے غور کرو تو صاف دیکھ لو گے کہ خوشی اور مسرت ان کے اس وسیع اور بڑے خزانے میں تم سے بھی کم اور بہت ہی کم ہے۔

اصلی خوشی ایک دلچسپ خیال سے عبارت ہے جو اکثر اس دل میں زیادہ ہوتا ہے جس میں خواہشیں کم ہیں۔ جس قدر تم اپنی ضرورتوں کا دائرہ تنگ کرتے جاؤ گے اسی قدر تمھاری مسرت بڑھتی جائے گی۔ ہم نے بڑے بڑے اور نہایت ہی عالی مرتبہ اور صاحبِ حکومت امیروں کو ادنیٰ طبقے کے مزدوروں اور مزدورنیوں پر حَسَد کرتے دیکھا ہے۔ یہ معمولی درجے کے لوگ جنھیں تم اپنے فضول اور بے ہودہ غرور سے ادنیٰ و کمتر اور حقیر و ذلیل خیال کرتے ہو ان کی حالت کا جب اندازہ کرو گے تو عام طور پر انھیں اپنے سے زیادہ خوش پاؤ گے۔ سعدیؒ کے کلام میں اس بادشاہ بن جانے والے فقیر کا یہ جملہ کہ " آں دم غمِ نانے بود و اکنوں غمِ جہانے[1] " آبِ زر سے لکھنے

۱۔ اس وقت صرف روٹی کی فکر تھی اور اب ایک جہان کا غم ہے۔

کے قابل ہے۔ ان غریبوں کو فقط اتنی فکر ہے کہ قوت لایموت کے لیے دن بھر میں کچھ پیسے فراہم کر لیں۔ ان کے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ہر قسم کی محنت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اس محنت کے بعد جب شام کو اپنی بی بچوں میں آکے بیٹھتے ہیں تو ان سے زیادہ مسرور اور خوش حال کوئی نہیں ہوتا۔ ان کی محنت ان میں رات کے آرام کی قدر پیدا کرتی ہے۔ اور اس محنت کا حاصل کیا ہوا مختصر سرمایہ ان کی فکریں دور کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں ایسی برکتیں ہیں جن کی بدولت شام کو انھیں وہ اطمینان و فارغ البالی اور وہ خوشی و خرمی حاصل ہو جاتی ہے جو ان سے زیادہ استطاعت رکھنے والوں کو کبھی زندگی بھر نصیب نہیں ہوئی۔

ان لوگوں کی حالت دیکھ کے تمھیں بخوبی سبق مل سکتا ہے کہ اگر تم بھی اپنی فکریں محدود' اپنی ضرورتیں کم اور اپنی خواہشیں دل سے نکال دو گے تو تمھیں بھی اصلی خوشی حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اگر تمھیں حقیقت میں خوشی و مسرت کی تلاش ہے تو اسے عمارت کے محل' سلطنت کے دربار اور ظاہری عیش و عشرت کی صحبتوں میں نہ ڈھونڈو بلکہ اسے غریب کے جھونپڑے میں جا کے تلاش کرو۔ وہ وہیں ملے گی اور اکثر وہیں رہتی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ خدا کے خزانے میں خوشی کی کمی نہیں۔ وہ وہاں کثرت سے موجود ہے۔ اور ہمیں کثرت سے مل سکتی ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اپنی ناسمجھی اور غلط خیالی سے اسے ٹھیک جگہ جا کے نہیں ڈھونڈتے۔ اکثروں کے خیال میں بسی ہوئی ہے کہ خوشی صرف ناز و نعمت کے قصروں ' دولتمندی و تمکنت کے محلوں اور حکومت و سطوت کے ایوانوں میں رہتی ہے۔ اور وہیں اس کے ڈھونڈنے کو وہ جاتے بھی ہیں۔ جس کی بدولت طرح طرح کی ذلتیں اٹھاتے ہیں۔ مغلوب و مقہور ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنے اور خوشامد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور ان سب خرابیوں اور تباہیوں کے برداشت کرنے کے بعد غور کرتے ہیں تو اپنے دل میں خوشی کا نام و نشان بھی نہیں پاتے۔ اس غلط راستے کو چھوڑ کے اگر غربت کے جھونپڑوں اور بے فکری کے چھپروں کے نیچے دیکھیں تو وہ لعلِ بے بہا ضرور ہاتھ آ جائے گا جس کے لیے انھوں نے دنیا کے بڑے بڑے عالیشان محل اور زبردست قلعے چھان مارے تھے۔

انسان جس وقت اور جتنی دفعہ اپنے دل میں کہتا ہے کہ "یہ چیز ملنی چاہیے" اسی وقت اور اتنی ہی دفعہ ایک فکر اور اس کے ساتھ ہی ایک غم اپنے لیے پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ نہ کہے اور اس جملے کے خیال سے اپنے دل کو بچالے تو بہت ہی جلد غم سامنے سے بھاگ جائے گا۔ اور وہ خوشی مل جائے گی جسے تباہی و پریشانی کے ساتھ ذلتیں اٹھا اٹھا کے ہر طرف ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں اور عام طور پر مشہور ہے کہ "پیٹ کے لیے انسان ذلیل ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے کبھی اطمینان نہیں نصیب ہوتا" مگر غور سے دیکھو تو جس قدر سہل الحصول قوت لایموت ہے کوئی چیز نہیں۔ خدا نے چونکہ یہ ایک لازمی خواہش انسان میں پیدا کی ہے' اسی وجہ سے اس کے دور ہونے اور بھوک کی ضرورتیں رفع ہونے کا جتنا سامان خدا نے پیدا کر دیا ہے اور کسی چیز کا نہیں۔ یہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خواہش پوری کرنے کے لیے ساری دنیا الوانِ نعمت کا ایک پُر تکلف خوان بنی ہوئی ہے۔ اگر چاہو تو قدم قدم پر پیٹ بھر سکتے ہو۔ بہت تھوڑی محنت اور بالکل معمولی درجے کی زحمت اس کے لیے بخوبی کافی ہو سکتی ہے۔ غریب و امیر اور بادشاہ و وزیر کے روزانہ مصارف پر نظر ڈالو تو حیرت سے دیکھو گے کہ سب سے کم خرچ اسی چیز میں ہوا جو صرف پیٹ بھرنے اور بھوک کی آگ بجھانے کے لیے تھی۔

تمھیں ذلیل کرنے والی اور زیادہ پریشان و سرگرداں بنانے والی عموماً وہی خواہشیں ہیں جن کو اس فطری تقاضے یعنی بھوک سے علاقہ نہیں۔ بلکہ وہ وہی خواہشیں ہیں جن کو تم نے اپنی ہوس پرستیوں کے لیے خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔ ان سے پیچھا چھڑاؤ۔ ان کو دل سے بھلاؤ۔ اور دیکھو کہ سچی مسرت اور بے غل و غش خوشی تمھارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔

(مضامینِ شرر)

سوالات

۱۔ "شادی و غم" کیا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں؟ شرر کے مضمون کے حوالے سے بحث کریں۔

۲۔ خوشی اور غم کی تعریف کریں اور بتائیں کہ انسانی زندگی میں ان کی کیا اہمیت ہے؟

۳۔ شرر کے اسلوب بیان کی کیا خصوصیات ہیں؟ زیرِ نظر تحریر کو آپ انشائیہ کی صنف میں شمار کریں گے یا مضمون کی اور کیوں؟ دلائل دیں۔

—— ○○○ ——

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

اردو شاعری کی طرح اردو نثر میں بھی حالی ایک ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سرسید کے رفقائے کار میں وہ اس لحاظ سے نمایاں ہیں کہ انھوں نے قومی اور اصلاحی کاموں میں شرکت کی اور شاعری اور نثر دونوں میں اصلاح اور تبدیلی کا عمل سرانجام دیا۔

نثر میں حالی کئی لحاظ سے اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے جدید سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی اور "حیاتِ جاوید"، "حیاتِ سعدی" اور "یادگارِ غالب" جیسی منفرد کتابیں تحریر کیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو نثر میں جدید تنقیدی نقطہ نظر سے شعرو شاعری کی ماہیت پر لکھا۔ مقدمۂ شعرو شاعری دراصل حالی کے دیوان کا مقدمہ ہے لیکن اب اس کی حیثیت مستقل اور جداگانہ ہے۔ یہ اصولِ تنقید کی اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ اس میں اخلاقی نقطہ نظر سے مروجہ اصنافِ سخن اور کلاسیکی اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حالی کا اسلوبِ تحریر سادہ، ٹھوس اور مدلّل ہے۔ انھوں نے اردو نثر کو سوانحی اور تنقیدی دونوں انداز سے برتنے کی طرح ڈالی۔ ان کے ہاں منطقی نظریہ حاوی رہتا ہے۔ وہ ہربات کو سنجیدگی اور عقلیت کے ترازو میں تولتے ہیں اور تخیل اور جذبات سے دور رہتے ہوئے اپنے خیالات اور حقائق کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی تحریروں میں شوخی اور اندازِ بیان کی رنگینی کی کمی ہے لیکن تنقیدی اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے ان کا اندازِ تحریر موزوں ہے۔ زیرِ نظر اقتباس میں ان کی تحریر کی اسی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اقتباس ان کی کتاب "مقدمۂ شعرو شاعری" سے لیا گیا ہے جس میں وہ شعر کی ماہیت سے بحث کرتے ہیں۔

شعر کی ماہیئت

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو اس کے تمام افراد کو جامع ہو اور مانع ہو دخولِ غیر سے، البتہ لارڈ "میکالے" نے جو کچھ شعر کی نسبت سے لکھا ہے گو اس کو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن جو کچھ شعر سے آج کل مراد لی جاتی ہے اس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصور، بت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعر کی کل کس چیز

ا۔ سوانحی خاکے کے لیے حصہ نظم صفحہ نمبر ۳۴۳ ملاحظہ فرمائیں۔

سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر "ہومر" اور "ڈانٹے" جیسے صناع بھی ان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیّلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اتار سکتے جیسا مو قلم اور چھینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اترتا ہے لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اس کے لیے الفاظ مہیا کر دیے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے اس کو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے نہ بت تراشی کی، اور نہ ناٹک کی، مصوری اور ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں جس قدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے ان کیفیات کے ہوتے ہیں جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں۔ مگر نفسِ انسانی کی باریک، گہری اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں، شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔ عالمِ محسوسات، دولت کے انقلابات، سیرتِ انسانی، معاشرت نوعِ انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے، سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو۔"

شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں

امید ہے کہ ان مثالوں سے شاعر اور غیر شاعر کے کلام میں اور نیز شعر اور مصوری میں جو فرق ہے وہ بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا۔ اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کون سی شرطیں ضروری ہیں اور شاعر میں وہ کون سی خاصیت ہے جو اس کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے۔

تخیُّل

سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے۔ قوتِ متخیّلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں امیجنیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہو گی

اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہو گی۔ اور جس قدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہو گی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہو گی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمالِ شاعری کے لیے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو وہ اس کمی کا تدارک اس ملکہ سے کر سکتا ہے، لیکن اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ اور ماضی و مستقبل اس کے لیے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدمؑ اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری، عنقا اور آبِ حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کر سکتا ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو نتیجے وہ نکالتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب دل اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔

تخیُّل کی تعریف

تخیل یا امیجینیشن کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے جیسی کہ شعر کی تعریف، مگر من وجہ اس کی ماہیت کا خیال ان لفظوں سے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیل کا عمل اور تصرف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقہ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصورات اور خیالات میں تصرف کرتی ہے اور کبھی الفاظ و عبارات میں۔ اگرچہ اس قوت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم ہوتا ہے اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں۔

دوسری شرط کائنات کا مطالعہ

اگرچہ قوتِ متخیّلہ اس حالت میں بھی جب کہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخہ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخہ فطرتِ انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمّق کی نگاہ سے دیکھنا جو امور مشاہدہ میں آئیں ان کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی' کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانہ میں محفوظ رکھے۔

مختلف چیزوں سے متحد خاصیت اخذ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مرزا غالب کہتے ہیں:

بُوئے گُل ' نالۂ دل ' دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور متحد اشیا سے مختلف خاصیتیں استنباط کرنے کی مثال میر ممنون کا یہ شعر ہے:

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنون
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

غرض کہ یہ تمام باتیں جو اوپر ذکر کی گئیں ایسی ضروری ہیں کہ کوئی شاعر ان سے استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے بغیر قوتِ متخیّلہ کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشو و نما پاتی ہے نہیں پہنچتی۔ بلکہ اس کی طاقت آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

قوتِ متخیّلہ کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی بلکہ جو مصالح اس کو خارج سے ملتا ہے اس میں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے جتنے بڑے بڑے نامور شاعر دنیا میں گزرے ہیں وہ کائنات یا فطرتِ انسانی کے مطالعہ میں ضرور مستغرق رہے ہیں جب رفتہ رفتہ اس مطالعہ کی عادت ہو جاتی ہے تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہو جاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں خود بخود جمع ہونے لگتے ہیں۔

تیسری شرط تفحّصِ الفاظ

کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ یا تفحّص ان الفاظ کا ہے جن کے ذریعہ سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے رو برو پیش کرنے ہیں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا۔ شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنیِ مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے۔ اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کر لے۔ اس مرحلہ کو طے کرنا جس قدر دشوار ہے، اسی قدر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ اگرچہ شاعر کے متخیّلہ کو الفاظ کی ترتیب میں ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں۔ لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیبِ شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبّع اور تفحّص نہیں کرتا تو محض قوتِ متخیّلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔

جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعہ سے اپنے ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کر سکتے ہیں ان کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے سے کیا کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے۔ نظمِ الفاظ میں اگر بال برابر بھی کمی رہ جاتی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کون سی بات کی کسر ہے۔ جس طرح ناقص سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز فوراً چغلی کھاتی ہے، اسی طرح ان کے شعر میں اگر تاؤ بھاؤ کا بھی فرق رہ جاتا ہے، معاً ان کی نظر میں کھٹک جاتا ہے۔ اگرچہ وزن اور قافیہ کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے، مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اسی لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ شاعر کو جب تک الفاظ پر کامل حکومت اور ان کی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہ ہو ممکن نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بالاستقلال حکومت کر سکے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ "شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا، بلکہ خیال کی ابتدائی ناہمواری سے لے کر انتہا کی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاید محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں۔"

اس بحث کے متعلق چند امور ہیں، جن کو فکرِ شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا۔ پھر ان کو جانچنا اور تولنا اور ادائے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورۃ" اگرچہ نثر سے متمیز ہو مگر معنے اسی قدر ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے۔ شاعر بشرطیکہ شاعر ہو اول تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اس کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے اس کو ضرور کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

آمد اور آورد میں فرق

اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ جو شعر شاعر کی زبان یا قلم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اس شعر سے زیادہ لطیف اور بامزہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ پہلی صورت کا نام انھوں نے "آمد" رکھا ہے اور دوسری کا "آورد"۔ بعضے اس موقع پر یہ مثال دیتے ہیں کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے وہ اس شیرہ سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے۔ مگر ہم اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اول تو یہ مثال جو اس موقع پر دی جاتی ہے اسی سے اس رائے کے خلاف ثابت ہوتا ہے جو شیرہ انگور سے خود بخود اس کے پک جانے کے بعد ٹپکتا ہے وہ یقیناً اس شیرہ کی نسبت بہت دیر میں تیار ہوتا ہے جو کچے یا ادھ کچرے انگور سے نچوڑ کر نکالا جاتا ہے۔ مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول، زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر کسی موقع پر پاکیزہ خیالات کو جو اس کے حافظہ میں پہلے سے ترتیب وار محفوظ ہوں، مناسب الفاظ میں جو حسنِ اتفاق سے فی الفور اس کے ذہن میں آجائیں ادا کر دے۔ لیکن اول تو ایسے اتفاقات شاذ و نادر ظہور میں آتے ہیں۔ وَالنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ۔ دوسرے ان خیالات کو جو مدت سے انگور کے شیرہ کی طرح اس کے ذہن میں پک رہے تھے کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ جھٹ پٹ بغیر غور و فکر کے سرانجام ہو گئے ہیں۔ شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک خیال دوسرے الفاظ۔ خیال تو ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پا جائے مگر اس کے لیے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مستری مکان کا نہایت عمدہ اور نرالا نقشہ ذہن میں فوراً تجویز کر لے مگر یہ ممکن نہیں کہ اس نقشہ پر مکان بھی ایک چشم زدن میں تیار ہو

جائے۔ وزن اور قافیہ کی اوگھٹ گھاٹی سے صحیح سلامت نکل جانا اور مناسب الفاظ کے تفحص سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ایک دن کا کام ایک گھنٹے میں کیا جائے تو یہ کام نہ ہو گا بلکہ بیگار ہو گی۔

(مقدمہ شعر و شاعری)

سوالات

۱۔ حالی نے شعر اور شاعری کی جو تعریف کی ہے کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ دلائل سے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کریں۔

۲۔ حالی نے شاعری کے لیے کیا شرائط درج کی ہیں؟ کیا یہ شرائط شاعری کی ہیں یا شاعر کی اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

۳۔ آمد اور آورد کی بحث سے حالی نے کیا نتیجہ نکالا ہے؟ کیا زیادہ غور و فکر سے اچھی شاعری کی جا سکتی ہے؟

۴۔ شعر اور شاعری کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے خیالات کا موازنہ کریں۔ دونوں کے خیالات میں کیا مماثلت اور کیا فرق ہے؟

—— OOO ——
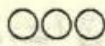
خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۵ء)

اصل نام "علی حسن" تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی ہمشیرہ کی اولاد سے تھے اور ساری زندگی خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ کے زیر سایہ گذاری۔ درگاہ کے متولی تھے۔ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ شروع ہی سے کتب بینی کا شوق تھا' اپنی ہمت اور شوق سے پڑھا۔ شروع میں کتابیں بیچتے تھے پھر کتابیں لکھیں' رسالوں کے "مدیر" ہوئے اور ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گذاری۔ انھوں نے بے شمار مضامین' پمفلٹ اور کتابیں لکھیں۔ موضوعات کا تنوع ان کا خاصہ تھا۔ روحانیات اور مذہبیات سے لے کر عملی زندگی اور تراکیب و نسخوں تک انھوں نے ہر موضوع پر لکھا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مغلیہ خاندان کی بربادی ان کے خاص موضوعات تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں "سی پارہ دل" "بیگمات کے آنسو" "غدر دہلی کے افسانے" اور "مضامین حسن نظامی" مشہور ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے منفرد اور صاحب طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیات اس کی سادگی' روانی اور تاثیر ہے۔ وہ اپنے دور کی دہلی کی رواں' شستہ اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں جس میں بے تکلفی لیکن چستی اور موزونیت سے کام لے کر سوز و گداز کا عنصر پیدا کر دیتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کو مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری میں خاص ملکہ اور مقام حاصل ہے۔ انھوں نے نہایت ہی منفرد' انوکھے اور دلچسپ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ حقیر سے حقیر چیز کو موضوع بنا لیتے ہیں اور اپنے اسلوب تحریر اور منفرد و متنوع زاویہ نگاہ سے اس میں نئی دلچسپیاں اور انوکھے زاویے پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا انداز 'ایک کھلا ذہن' کھلا دل اور وسیع المشرب نقطہ نظر رکھنے والے صوفی کا انداز ہے۔ زیر نظر مضمون "دیا سلائی" اسی انداز تحریر کا نمونہ ہے۔

دیا سلائی

آپ کون؟ ناچیز تنکا۔ اسم شریف؟ لوگ "دیا سلائی" کہتے ہیں۔ دولت خانہ؟ جناب دولت نہ خانہ' اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا۔ اور سچ پوچھیے تو یہ لکڑی کا ننھا سا "کاغذی ہوٹل" جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے وہ میرا موجودہ ٹھکانا ہے۔

آہا۔ تو آپ ہمارے ملک کی دیا سلائی ہیں۔ تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہو مگر ہماری نگاہ میں سب دیا سلائیوں کی "رانی" ہو۔!

ذرا مہربانی کر کے مجھ کو "رانی" نہ فرمایئے "بیگم" کہیے! میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے۔

بہت اچھا میاں تنکے ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے۔ کہ "رانی" اور "بیگم" میں تمیز کرتے ہو۔ "کے آدمی کے پیر شُدی"[1] وہ وقت بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر مشین کے آرے کے نیچے رکھے جاتے تھے۔ اور آرا آن کی آن میں تمھارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی وہ خود خیال کر کے گریبان میں مونھ ڈال سکتے ہو۔ تمھارے تراشیدہ کندوں کا ظلماتی گرم چشمہ میں ڈالا جانا اور اس کھولتے ہوئے پانی میں تمھارا تلملانا۔ کبھی سطح آب پر آنا۔ کبھی پھرتہ میں جا پڑنا۔ یہاں تک کہ اسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمھاری کھال تک اتر جاتی تھی اس وقت کچھ دیر کے لیے تم کو باہر نکال کے دم دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا اور مشین چھیل چھیل کے تمھارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی۔ اور وہ پرت پھر دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حرکت میں تم جیسی ہزاروں ہستیاں عالمِ وجود میں آجاتی تھیں۔ زرد گندھک اور سرخ مصالح کا لباس بھی کچھ عزت سے نہیں پہنایا جاتا تھا۔ بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالح میں تمھاری ناک ڈبو دی جاتی۔ اس پر یہ مزاج! کہ بیگم کہلانے کی آرزو۔ کچی کی ڈبیا میں رہتے رہتے یہ دماغ ہو گیا! ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے منڈیا رگڑ کر پھینک دے گا۔ پھر جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا۔

حضرت! آپ کو تو غصہ آگیا۔ خفگی کی کیا بات ہے جو چیز جہاں ہو اسی سے منسوب ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر "رانی" کے مقابلہ میں "بیگم" کے لفظ کو پسند کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے 'کام دیکھنا چاہیے۔ سو جیسا مسلمانوں کا کام کرتی ہوں بے کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجا لاتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرے مشرب میں دیسی بدیسی، گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں بھی میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں اور ایک غریب کے جھونپڑے میں بھی میرے سبب اجالا ہوتا ہے۔ رہی بات کہ بے حقیقت ہوں اور بے بسی کے عالم میں انسانی کلوں سے عرصہ تک بے کل رہی ہوں تو یہ کچھ مجھ ہی پر منحصر نہیں۔ آپ پر بھی یہ بپتا پڑ چکی ہے۔ بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ درگت ہوئی ہے اور نو مہینے شکم مادر کے چشمہ میں آپ بھی جوش کھاتے ہیں اور پھر برسوں پرت در پرت کے چکر میں گردش رہی میرے "رانی" اور "بیگم" کے لفظ سے اتنے چونکے۔ ذرا

---

[1] تو کب آیا اور کب سبز رگ ہو گیا۔

اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھئے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کرتا ہے وہ گورا نہیں چاہتا۔ جو مسلمان کو پسند ہے اس سے ہندو کو نفرت ہے۔ اور غریب و کمزور ہونا تو گویا دائرہ آدمیت سے خارج ہو جانا ہے۔ اس کو دنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔

بس بس خاموش رہو بی فتنی۔ ہو تو اتنی ذرا سی مگر زبان بارہ ہاتھ کی ہے۔ لگیں حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد کی کیا عالی شان ہے؟ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سنا ہو گا کہ خدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اُسرار کا علم اس کو بخشا ہے۔ بس یہ جو کچھ کرتا ہے عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے۔

اوہو! آپ کو یہ غرہ بھی ہے۔ بے شک آپ خلیفہ خدا ہیں۔ مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ "آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے ہیں" یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی ہے اگر اصلیت و حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ؟ "بجلی کیا چیز ہے؟" وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے اور اس کی تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیوں کر ظاہر ہو جاتی ہے؟

خیر بجلی تو بڑی چیز ہے تنکا کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی رگڑ میں یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے۔ محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضی الٰہی کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے پانی اور روشنی عام ہے۔ جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذات شریف ان سب چیزوں کو اپنے لیے مخصوص کر لینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی، پانی، ہوا سب میرے قبضہ میں ہوں، جس کو چاہوں دوں اور جس کو چاہوں محروم کر دوں۔

ایک آدمی کروڑوں روپے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں نام اور شان کے شوق میں، لاکھوں ہم جنسوں کو فنا کر ڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا ان ہی اعمال سے دعویٰ کیا جاتا ہے اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں۔ حضرت آپ ہزاروں لاکھوں سجدے کرتے ہیں مگر آپ کا سرکش وجود ویسا کا ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے۔ مجھ کو دیکھیے کہ "ایک ہی سجدے میں مقبول ہو جاتی ہوں اور تجلی اس چھوٹی سی شکل کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔"

خدا تمھاری طرار زبان کو چلاتا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں۔ اچھا تو لاؤ اندھیرا زیادہ ہو گیا۔ میرے کلبۂ تاریک کو تجلیِ راز سے روشن کر دو۔

(مضامینِ خواجہ حسن نظامی)

سوالات

۱۔ زیرِ نظر انشائیہ کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں اور یہ کس لحاظ سے دوسرے مضامین سے مختلف ہے۔

۲۔ خواجہ حسن نظامی کے اسلوبِ بیان کی خصوصیات لکھیے۔

۳۔ انشائیہ کو ایک فلسفی کی بے تکلف گفتگو بھی کہا گیا ہے۔ زیر نظر انشائیہ اس معیار پر کہاں تک پورا اترتا ہے۔

۴۔ خواجہ حسن نظامی اور دیا سلائی کے مابین کیا کیا گفتگو ہوئی ؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

—— ○○○ ——
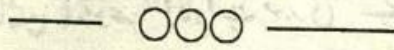
مہدی افادی
(۱۸۷۷ - ۱۹۲۱ء)

آپ کا اصل نام مہدی حسن تھا۔ دنیائے ادب میں مہدی افادی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق گورکھپور کے ایک شریف اور معزز خاندان سے تھا۔ ان کے والد شیخ حاجی علی حسن کورٹ انسپکٹر تھے۔ مہدی افادی بچپن ہی سے نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے مکتب کی تعلیم کے بعد گھر پر ہی عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی تعلیم کے لیے سکول میں داخل کیے گئے۔ تعلیم کے سلسلے میں کچھ مدت علی گڑھ میں بھی رہے۔ ملازمت کا آغاز معمولی عہدے سے کیا بعد میں نائب تحصیل دار اور پھر تحصیل دار رہے۔ مہدی افادی ادب دوست اور ادیب دوست شخص تھے۔ اپنے عہد کے تمام ادیبوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے اور علامہ شبلی سے انھیں گہری عقیدت تھی۔

مہدی افادی اردو ادب کے ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے دلکش اسلوبِ بیان اور جمالیاتی نقطہ نظر کے باعث شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ وہ اردو میں رومانوی تحریک کے اہم محرکین میں سے تھے ان کے مضامین نے اس مخصوص طرزِ تحریر کو فروغ دیا جس کا آغاز سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں سے ہوا تھا اور جسے "ادبِ لطیف" کا نام دیا گیا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "افاداتِ مہدی" کے نام سے ان کی موت کے بعد ان کی بیگم نے مرتب کر کے شائع کیا۔ مہدی افادی کے خطوط بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

سُقراط

سقراط، یونان کے مشہور اور نامور حکما سے تھا، ایتھنس ا میں پیدا ہوا، یہ شہر کسی وقت میں یونان کا دارالسلطنت تھا، اس میں یونیورسٹی بھی تھی، سقراط کا باپ ایک بت تراش تھا، آبائی پیشہ کی رعایت سے اس وحیدِ عصر نے بھی سنگ تراشی میں مشق بہم پہنچائی مگر آخر اسے فلسفہ کی تحصیل کا شوق ہوا، چونکہ طبیعت میں قدرتی طور پر اعلیٰ درجہ کی صلاحیت موجود تھی، اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فلسفہ کا اثر قبول کیا۔

اوائلِ عمر میں باقتضائے آئینِ ملکی اسے فوج میں داخل ہونا پڑا، کئی لڑائیوں میں اس نے بڑے بڑے کارنمایاں کیے، زنوفن اور ایلسی بایڈیز سے لائق شخصوں کی جان اسی نے بچائی، اسی وجہ سے ان دونوں کو بھی اس کے ساتھ بہت محبت تھی، زنوفن فوج کا ایک سردار ہونے کے سوا صاحبِ تصنیف بھی تھا، اس کی تصنیفات خاص پایہ کی ہیں، ایلسی بایڈیز ایک امیر کا بیٹا تھا، ہر قسم کے

ا۔ Athense

اوصاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، حسنِ صورت کے ساتھ اعلیٰ حسنِ سیرت سونے پر سہاگے کا رتبہ رکھتا تھا۔

لڑائی سے فراغت کے بعد سقراط نے اپنی پہلی وضع تبدیل کر دی، کھانے کپڑے میں سادگی برتی، فلسفیانہ تحریریں شائع کیں[1]، ہم وطنوں کو پابندیِ مذہب کی تاکید کی، رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا، مختلف باغوں اور دریا کے کنارے پر یہ اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا، یہ طبیعت کا بہت آزاد تھا، اور انتہا درجہ کا خوش تقریر بھی، اس کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں آخر میں اس کے ہم وطنوں کے لیے رشک و حسد کا باعث ہوئیں، ایک شاعر نے اس کی ہجو لکھی، جس کا منشا یہ تھا کہ سقراط نوجوانانِ ایتھنس کے اخلاق کو خراب کرتا ہے اور لڑکوں کو سکھلاتا ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت سے انحراف کریں، عدالت نے اسی بنا پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا، تحقیقات کی گئی، نتیجہ اس کو صرف گردن زدنی ثابت کرتا تھا، یہ حراست میں لے لیا گیا، اس کے احباب نے رہائی کی بہتیری صورتیں نکالیں، خود داروغہ جیل اس کے بھاگ جانے پر راضی ہوا، مگر سقراط کو جس وقت اس ارادے کی خبر دی گئی، اس نے اختلاف کیا، اور نہایت استقلال سے یہ بات کی کہ "میں موت سے بھاگنا نہیں چاہتا۔" جیل میں اسے زہر کا پیالہ دیا گیا، اس نے بے تکلف اپنے ہونٹوں سے لگالیا، اور اپنی جان دی!

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنس کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی اور اس کے دشمنوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنی نالائقی کے خمیازے کھینچنے پڑے، سقراط کی سوانح عمری زنوفن اور افلاطون نامی اس کے شاگردوں نے لکھی ہے، ان دونوں نے اس کے اقوال کی علیحدہ علیحدہ ترتیب دی ہے، جو واقعی دیکھنے کے لائق ہے۔

سقراط نے شادی بھی کی تھی، اس کی بیوی بہت ہی بدمزاج تھی، سقراط کے ساتھ اس کے برتاؤ سخت تھے، لیکن وہ ہمیشہ اس سے نرمی کے ساتھ پیش آتا تھا، اس نے اپنی بیوی کی بدمزاجی سے فائدہ اٹھایا، اس کی کچی پکی سہ لینے سے یہ انتہا درجہ کی برداشت کا خوگر ہوگیا، ۴۶۸ برس پیشتر حضرت عیسیٰ کے پیدا ہوا اور ۳۹۹ برس قبل وفات پائی۔

سقراط کی رائے میں موجودہ وقت کو کسی آنے والے دن کی امید پر رائگاں کر دینا بڑی

---

[1] سقراط کی کوئی تحریر یا تصنیف موجود نہیں۔ وہ افلاطون کے مکالموں میں ہی زندہ اور موجود ہے۔

غلطی ہے' وہ کسی چیز کا پس انداز کرنا اسی لیے ایک سرے سے فضول سمجھتا ہے' اکتسابِ علم کے لیے اس کے خیال میں کسی وقتِ خاص کی قید نہیں' عمر کا ہر حصہ انسان کی معلومات کو ترقی دے سکتا ہے' اس کی رائے میں کتب بینی ہی ایک عیش ہے' جو ہر شخص کا اختیاری امر ہے' وہ ایک جاہل کو واجب الرحم سمجھتا ہے' مگر اس سے بھی زیادہ اس شخص کی ہمدردی کرتا ہے' جس کا مربی کوئی بدتہذیب اور تاریک خیال کا آدمی ہو' وہ کہتا ہے عالی ظرف کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معزز برتاؤ ہو' زیادہ سے زیادہ کوششیں اس کی یہیں تک محدود ہوں کہ دشمن کو تکلیف دینے سے محفوظ رہ سکے' غیبت کرنے والوں یا ایسے لوگوں کو جن کو دوسروں کی برائی میں دل چسپی ہوتی ہے' وہ شریف نہیں سمجھتا' ان کے ساتھ انتہائی رعایت یہ ہے کہ ان کو کمینہ کہا جائے' آخر میں وہ ہر شخص کو اپنی کانشنس[1] کی پیروی کی تاکید کرتا ہے' اس نے زور دے کر یہ بات بتائی ہے کہ صرف اصلیت پر نظر ہونی چاہیے' اس سے غرض نہیں دوسرے کیا سمجھتے ہیں' وہ عام مقبولیت کی خواہش کو ایک طرح سے جنون سمجھتا ہے۔

ایک مقام پر اس نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات لکھی ہے' کہتا ہے کہ "میں نہیں سمجھتا کیونکر لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں' کسی بات کی صحت پر ان کو یقین کامل ہوتا ہے' تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے' شاید کوئی خارجی اثر وجہ مزاحمت ہو' مگر میں سمجھتا ہوں' ان کے ارادہ ہی کا یہ نقص ہے' مجھے آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جس کی سچائی کا یقین ہو' اور نہ کر گزرا ہوں' لوگ کچھ ہی سمجھا کریں' مجھے ان کی مخالفت کی قطعی پروا نہیں' اس لیے میں ان کو داخل جمادات سمجھتا ہوں۔"

(افاداتِ مہدی)

سوالات

۱۔ سقراط کی زندگی اور موت کی معنویت اور اہمیت پر روشنی ڈالیں۔
۲۔ مہدی افادی کا اسلوب تحریر سرسید اور حالی کے اسلوب سے کس لحاظ سے مختلف ہے؟
۳۔ مہدی افادی کے مضمون سے کس نقطہ نظر کا اظہار ہوتا ہے؟
۴۔ سقراط کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

— ooo —

۱۔ Conscience' ضمیر۔
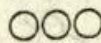
ڈاکٹر سیّد عبداللہ

(۱۹۰۶ء - ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ ضلع ہزارہ (ایبٹ آباد) کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ عملی زندگی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی فہرست سازی سے کیا۔ بعد ازاں یونیورسٹی میں ہی فارسی کے ریسرچ سکالر ہو گئے۔ جس کے بعد یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ عربی و فارسی و اردو کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ جس پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی جگہ اورینٹل کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور بعد میں ریڈر، پروفیسر اور پھر پرنسپل بھی رہے، جہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" کے صدر نشین کی حیثیت سے آخر عمر تک مصروف کار رہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ادبی تحقیق و تنقید کے اسی سلسلے کی کڑی ہیں جس کا آغاز محمد حسین آزاد سے ہوا تھا اور جو حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ زندگی بھر علم و ادب سے وابستہ رہے اور نہایت خاموشی لیکن استقامت کے ساتھ اردو زبان و ادب کی ترقی اور خدمت میں لگے رہے۔ ان کی کتابوں میں "نقدِ میر"، "ولی سے اقبال تک"، "وجہی سے عبدالحق تک"، "سر سید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کی نثر کا فنی و فکری جائزہ"، "اشاراتِ تنقید"، "مقاماتِ اقبال"، "مباحث"، "اردو تذکرے" اور "تذکرہ نگاری" وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا طرز تحریر سادہ، رواں اور سلیس ہے۔ ان کے نزدیک زبان، خیال کے ابلاغ اور ادراک کا ذریعہ ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ سادہ اور مناسب الفاظ میں اپنے مفہوم کو اس طرح بیان کریں کہ پڑھنے والا اس کو بخوبی سمجھ سکے، ادبی تنقید میں ان کے ہاں مغربی مطالعے اور حوالوں کے باوجود مشرقی نقطہ نظر غالب رہتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون "الفاظ کی کہانی" ان کے طرزِ تحریر اور فنی نقطہ نظر کی نمایاں مثال ہے۔

الفاظ کی کہانی

الفاظ کیا ہیں؟ اشیا، اسما، حالتوں اور کیفیتوں کے آئینے ہیں۔ جب انسانی عمل ان میں ربط پیدا کرتا ہے تو یہ آئینے مل کر معانی کا "چراغاں" بن جاتے ہیں۔ زیادہ علمی زبان میں انھیں معانی کی علامتیں کہا جا سکتا ہے۔ ان علامتوں کی مدد سے انسان اظہار و ابلاغ کرتا ہے۔

الفاظ کی کہانی انسانی ارتقا کی کہانی ہے ـــــ الفاظ کی تاریخ ہر ملک میں اپنے سماجی ماحول کے تابع رہی ہے' اس ماحول میں الفاظ نے جنم لیا' نشو و نما پا کر جوان ہوئے' پھر پھلے پھولے اور حوادث و واقعات کے تحت لیل و نہار کا شکار ہو کر کبھی مضمحل و بیمار ہو گئے' کبھی بالکل مر گئے ـــــ فقرے اور عبارتیں الفاظ کے طویل سلسلوں پر مشتمل ہوتی ہیں ـــــ عبارتوں میں الفاظ ہی جان ڈالتے ہیں اور مختلف قسم کے جذبات و خیالات کی تصویر بن جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے الفاظ کی قیمتیں کئی انواع میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ قیمتیں جذبات و خیالات کے حوالے سے مقرر ہوتی ہیں اور اس بنیاد پر الفاظ کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں۔

بعض الفاظ جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں' ان میں قلب انسانی کی مختلف حالتوں کا عکس ہوتا ہے۔ بعض الفاظ تصویر دار ہوتے ہیں' یعنی ان میں خارجی کائنات کی تصویریں ہوتی ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کی قیمت ان کی آواز کی وجہ سے مقرر ہوتی ہے ـــــ یہ گاتے بجاتے الفاظ جب عبارتوں کی صورت اختیار کرتے ہیں تو اس سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صَوتی قیمت رکھتے ہیں۔

مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت حاضر ہے۔ علم و حکمت کی زبان الفاظ کی ایک مستقل دنیا ہے جن کے مابین منطقی ربط ایک فکری خیال کو جنم دیتا ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ الفاظ مرتے بھی ہیں اور مرتے تب ہیں جب ان کا استعمال ترک ہو جاتا ہے۔

الفاظ ایک زندہ سلسلہ ہے' لفظوں میں' ماحول اور زمان و مکان کے ساتھ تبدیلیاں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لفظ کے مختلف ادوار میں مختلف معنی نظر آتے ہیں۔

عربی کا لفظ عیش' ابتدا میں محض بمعنی زندگی استعمال ہوتا تھا۔ پھر جب عربوں پر خوش حالی کا دور آیا تو اس میں خوش حالی کا مفہوم شامل ہو گیا' یعنی عیش سے مراد خوش حالی کی زندگی ہوئی۔ رفتہ رفتہ خصوصاً فارسی' اردو تک پہنچتے پہنچتے لفظ عیش نہ صرف خوش حالی بلکہ پُر تکلف زندگی اور شوقِ فضول کا مترادف ٹھہرا۔ اب عیش کے ساتھ عشرت کا لفظ ملا لیا جاتا ہے اور یہ بے

لگام مشاغل زندگی کا قائم مقام ہے۔

لفظ 'خان' کو دیکھیے۔ اس کا عروج و زوال بذات خود عبرت کی کہانی ہے۔ خان کسی زمانے مین قبیلے کے رئیسِ اعظم یا سلطانِ وقت کا لقب ہوا کرتا تھا۔ چنگیز اپنے زمانے کا خان تھا۔ پھر اس کے شہزادوں نے یہ لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا جب بڑے بڑے عمائد و امرا کے لیے مخصوص ہوا۔ مگر بڑی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ اس کا رتبہ گرا' اس کا اطلاق ہر سرکاری عہدے دار پر ہونے لگا اور اب آخر میں ایک خاص قبیلے کے ہر فرد کے نام کا لاحقہ ہے' بلاامتیاز۔

لفظوں کے بیمار اور مضمحل ہونے کا قصہ اور بھی دل چسپ ہے۔ یہ بیماری دراصل بچارے لفظوں کی نہیں' ان کے بولنے والوں کی ہے۔

جب معاشرہ بگڑ جاتا ہے تو اس میں شریف اور بااخلاق الفاظ' غلط یا بالکل الٹے معنوں میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ لفظوں میں منافقت پیدا ہو جاتی ہے وہ اظہار کا ذریعہ نہیں رہتے' اخفا کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اثباتِ حقیقت نہیں کرتے' اخفائے حقیقت کرنے لگتے ہیں۔

اہلِ مغرب جس زبان کو "ڈپلومیسی"[1] کی زبان کہتے ہیں' اس میں لفظوں کے دو دو معنیٰ ہوتے ہیں' ان سے بہت بڑا کام لیا جاتا ہے ـــــ یہ وعدوں سے مکر جانے کی زبان ہے۔

مگر بعض اوقات لفظ بے چارے خود دھوکا کھا رہے ہوتے ہیں۔ بولنے والے شریف الفاظ کو دھوکا دیتے ہیں' اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور دل سے ان کو خود تسلیم نہیں کر رہے ہوتے۔ تہذیب' اخلاق' دین اور مذہب سے متعلق لفظوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کا استعمال قلب کا ہم قدم نہیں ہو پاتا۔

بعض اوقات شریف الفاظ کی شرافت ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ سچائی' وفاداری' حیا، تواضع' حقیقت جیسے الفاظ سے ان کا اصلی سرمایۂ معنی ہی چھین لیا جاتا ہے۔ فرانس کے نیم رومانی' نیم مجہول ادب پر یہی گزر رہی ہے اور بعض اشتراکی معاشروں میں پرانی شریفانہ اقدار کو جاگیردارانہ اقدار کہ کر ان سے متعلق الفاظ کی حقیقت ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ خیر اور شر' نیکی

---

[1] Diplomacy' سفارت کاری۔

اور بدی، صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی جیسے الفاظ کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

سیاست اور اس کی امدادی سائنس نے جس طرح لفظوں کا خانہ خراب کیا ہے اس کا حال قابلِ گریہ ہے —— اور اس کے ردِعمل کے طور پر بیمار فلسفوں نے ہر شریف لفظ کو اتنے دھکے، مکے رسید کیے ہیں کہ اب یہ الفاظ نیم جان ہیں۔ فاشزم کی زبان ساری کی ساری بیمار زبان ہے کیونکہ اس کے الفاظ کی اخلاقی صحت بگڑ چکی ہے۔

علامتی ادب میں الفاظ بعض ذہنی، نفسیاتی اور روحانی کیفیتوں کا نشان بن جاتے ہیں —— لیکن یہ بھی بولنے والے، لکھنے والے پر منحصر ہے۔ وہ لکھنے والے جو خود روحانی طور پر بیمار ہوتے ہیں ان کی علامتیں اور علامتی الفاظ بھی بیمار ہوتے ہیں۔

جو لکھنے والے امید اور توانائی کا پیغام دیتے ہیں ان کی علامتیں، خوشگوار اور توانا الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں —— ان میں رس اور قوت کے عناصر ہوتے ہیں۔ صوفیوں کی علامتوں میں وفور، ثروت اور لا انتہائیت ہوتی ہے کیونکہ وہ اس ذات کی نشاندہی کرتے ہیں، جو کہیں افق کے پار ہے۔

غرض الفاظ کی دنیا عجائبات کی دنیا ہے —— رنگا رنگ، خوش آہنگ، نرم و نازک، توانا اور طاقتور —— کمزور اور صحت مند، شریف اور منافق —— عہد کے پکے اور عہد کے بودے، مستقل اور خانہ بدوش —— ' داستان در داستان —— ایک ایک لفظ کو لیجیے، صدیوں کی کہانیاں بیان کرتا جائے گا۔

ادھر شعرا اور حکما کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو لفظوں سے مطمئن نہیں۔ انھیں ناکافی اور نارسا مانتا ہے اور خاموشی کو گویائی پر ترجیح دے رہا ہے۔ چنانچہ نظیری نے کہا۔

"خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید" [1]

اور معاصر شاعر حقی[2] نے تو یہاں تک کہہ دیا:

---

[1] خاموشی ایسے معانی رکھتی ہے کہ ان کا بیان نہیں ہو سکتا۔
[2] شان الحق حقی۔

؎ "حرف رسوا ہوئے صدا بن کر
آبرو رہ گئی اشاروں کی"

(ادب و فن)

سوالات

۱۔ الفاظ کی کیا حیثیت ہے اور ادب و فن کی دنیا میں وہ اپنے معانی کس طرح بدلتے رہتے ہیں؟
۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے اسلوب بیان کی خصوصیات پر بحث کریں۔
۳۔ ادب اور لفظ کا کیا تعلق ہے؟

—— ○○○ ——
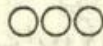
نصیر احمد بھٹی

(ولادت ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء)

نصیر احمد بھٹی ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو صوبہ پنجاب کے شہر گوجرانوالہ کے مشہور قصبے تلونڈی موسیٰ خان جو گوجرانوالہ سے مشرق کی سمت پسرور روڈ پر قریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے، پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام علی محمد بھٹی ہے جو اپریل ۱۹۸۴ء میں رحلت فرما گئے۔ معروف غزل گو شاعر جناب عبدالحمید عدم کا تعلق بھی اسی قدیم قصبے سے تھا۔

پرائمری اور مڈل تک کی تعلیم اپنے آبائی قصبے سے ہی حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ اور ایف ۔ اے اور بی ۔ اے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ سے پاس کیے اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ۔ اے سیاسیات اور ایم ۔ اے اردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۷۵ء سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور میں معاون ماہر مضمون اردو کے طور پر فرائض انجام دینا شروع کیے۔ سینئر ماہر مضمون اردو کی ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۹۱ء سے ماہر مضمون اردو کے طور پر ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجے کے طلبہ کے لیے اردو کی نصابی کتب کی تدوین و طباعت کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ماہر مضمون اردو کے طور پر فرائض سنبھالنے کے بعد انھوں نے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجے کی اردو کی تمام کتب پر بڑی محنت سے نظر ثانی کا کام کیا اور ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۵ء کے مختصر عرصے میں اردو اختیاری (IX - X) نئی کتاب تیار کی مرقع اردو (IX - X) اور اردو قواعد و انشاء (IX - X) کو نظر ثانی اور تدوین ثانی کے بعد نستعلیق رسم الخط میں از سر نو کمپیوٹر پر کمپوز کروا کر نئی کتابیں تیار کی گئیں۔

اردو لازمی (XI - XII) کا مسودہ وفاقی وزارت تعلیم کی ہدایت کے مطابق نئے سرے سے تیار کیا گیا جس میں انھوں نے ماہر مضمون کے علاوہ مرتب اور ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ اس سلسلے میں کی گئی کاوشوں کی وفاقی وزارت تعلیم نے اس مسودے کی منظوری دیتے ہوئے شاندار الفاظ میں تعریف کی اس پر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے بھی اس محنت کا تحریری طور پر اعتراف کیا۔ اور یہ نئی کتاب ۱۹۹۴ء میں پہلی بار چھپی اور اس کا اصلاح شدہ ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں چھپ چکا ہے اس کے بعد زیر نظر نئی کتاب بھی بڑی محنت سے تیار کی اور اس میں بھی بطور مصنف، نگران اور ایڈیٹر کام کیا۔

مُنشّیاتُ

اللہ تعالیٰ نے کائنات اور خاص طور پر اس کرہ ارضی، جس پر انسان آباد ہیں کی زیبائش و آرائش کے لیے نیلگوں آسمان، چمکتے اور ٹمٹماتے ستارے اور اَن گنت نظام ہائے شمسی تخلیق فرمائے جو اس کی مشیئت کے مطابق نہایت منظم طور پر اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ انسان کے استفادے کے لیے جمادات، نباتات، حیوانات، چرند، پرند اور نہ جانے دیگر کتنی فضائی، زمینی اور سمندری مخلوق پیدا کی۔ جمادات ایک جگہ پر قائم ہیں، از خود متحرک نہیں ہو سکتے البتہ حیوانات میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، گرمی سردی کا احساس، افزائشِ نسل اور اپنے بچوں سے پیار جیسی جبلتیں موجود ہیں۔ لیکن انسان کو ان حیوانی جبلتوں، احساسات، جذبات کے نظام کے علاوہ کھرے کھوٹے، اچھے برے، حق اور ناحق میں تمیز اور کائنات میں موجود انواع و اقسام کی نعمتوں سے مستفید ہونے کی صلاحیت یعنی عقل و شعور بھی عطا کیا۔ یہی وہ دولتِ بیش بہا ہے جس کی بدولت ابنِ آدم اشرف المخلوقات ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نعمت بلاتمیز رنگ و نسل، بلاقیدِ زمان و مکان اور بلاتفریق دین و مذہب ملی۔ یہی وہ گراں مایہ انعام ہے جس کے استعمال سے یہ ستاروں پر کمندیں ڈالتا، نئی نئی دنیائیں دریافت کرتا اور فضاؤں کو مسخر کرتا ہے۔ اسی کے بل بوتے پر سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں سے گوہر نایاب ڈھونڈ نکالتا ہے لیکن ہر زمانے میں کچھ انسان ایسے بھی رہے ہیں جو اس عظیم نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے اس سے کام نہیں لیتے اور زندگی کی مشکلات، ناموافق حالات کا ہمت، جوانمردی اور عقل و ذہانت سے مقابلہ کرنے کی بجائے ہمت ہار کر، خیالی دنیاؤں میں رہنے کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایسی اشیا کا استعمال شروع کر دیتے ہیں جو انھیں وقتی طور پر سکون بخشتی اور دنیا کے جھمیلوں سے کچھ دیر کے لیے پرے لے جاتی ہیں۔ وہ اس وقت اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے کہ ان کے استعمال سے وہ سوچنے سمجھنے، فیصلہ کرنے کی قوت اور جسمانی صحت جیسی نعمت سے محروم ہو رہے ہیں۔ ان اشیا کو موجودہ دَور میں "منشیات" کا نام دیا جاتا ہے۔

منشیات کا استعمال موجودہ دَور یا آج سے دو چار صدیاں پہلے تک کا مسئلہ نہیں، بلکہ نشہ آور اشیا کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا رہا ہے۔ ہر دَور میں ہر نبی اور مصلح نے ان کی مذمت کی ہے۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب معاشرہ شراب نوشی جیسی عادتِ بد میں بری طرح پھنسا ہوا تھا اور نتیجتاً "بات بات پر لڑائی جھگڑا، قتل و غارت، چوری، ڈاکا زنی اور تو

اور اپنی بچیوں کو اپنے ہاتھوں ماں باپ کا زندہ درگور کر دینے تک کے غیر انسانی اور روح فرسا جرائم اس معاشرے کا معمول بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں' جو دینِ فطرت ہے' ان تمام نشہ آور اشیا کی نہ صرف مذمت کی گئی بلکہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید نے شراب کو حرام قرار دیا، اسے اُم الخبائث قرار دیا گیا کہ اس کے استعمال سے انسان رشتوں کی پہچان تک بھول جاتا ہے' عقل و شعور' حافظہ و یادداشت کھو دیتا ہے۔ دوست اور دشمن نہیں پہچان پاتا۔ اس حالت میں وہ بدترین جرم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ موجودہ دَور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور ہے۔ انسان نے پرندوں کی طرح فضا میں اڑنا' مچھلیوں کی طرح سمندروں کی تہوں میں تیرنا سیکھ لیا ہے۔ تیز رفتار سواریوں کی بدولت فاصلے سمٹ گئے ہیں لیکن اس گوناں گوں ترقی کے ساتھ' فیکٹریوں اور گاڑیوں کے دھویں سے فضا مسموم اور ایٹمی مواد سمندروں میں غرق کرنے سے سمندر تک آلودہ ہو گئے ہیں۔ ہر طرف شور ہی شور برپا ہے۔ جس سے بے شمار نفسیاتی مسائل نے جنم لیا ہے۔ ہر شخص اتنا مصروف ہو گیا ہے کہ اس پر انسان سے زیادہ مشین کا گمان ہوتا ہے۔ آبادی میں بے تحاشا اضافے نے مسائلِ زندگی کو اور بھی گمبھیر بنا دیا ہے۔ ان حالات میں سکون کے چند لمحات کے حصول کے لیے نادانوں نے متنوع قسم کی نشہ آور اشیا کا استعمال عام کر دیا ہے۔ اس لعنت (منشیات) کے فروغ میں راتوں رات امیر سے امیر تر بننے کی خواہش نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ انسان کی تباہی اور انسانیت کی تذلیل سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے چند ٹکوں کے لیے پوری دنیا کو اس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشیا عام طور پر نشے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں:

۱۔ ہیروئن:

یہ سفید یا بھورے رنگ کے پوڈر کی شکل میں ہوتی ہے جسے افیون سے بنایا جاتا ہے اور ذائقے میں کڑوی ہوتی ہے۔ سگریٹ میں بھر کر اس کے دھویں کو سونگھا جاتا ہے۔

مضر جسمانی اثرات

اس کے استعمال سے خون کے دباؤ میں کمی واقع ہو جاتی ہے' سانس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور انسان اپنے آپ کو نیند کی سی کیفیت میں محسوس کرتا ہے۔ کسی چیز کو تفصیل سے دیکھنے یا سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر زیادہ مقدار میں استعمال کر لی جائے تو قوتِ حس کو مزید کم کر دیتی ہے۔ سانس لینے کی رفتار اور دل کی حرکت سست پڑ جاتی ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ جاتی

ہیں۔ چونکہ یہ خاصی مہنگی چیز ہے اس لیے یہ گھناؤنا کاروبار کرنے والے انسان نما بھیڑیے اس کی مقدار میں اضافے کے لیے اس میں کونین ' بے بی پاؤڈر یا دیگر خواب آور مواد بھی ملا دیتے ہیں جس سے یہ مزید مہلک اور نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ نشے باز کو اگر یہ نہ ملے تو دورے پڑتے ہیں ' بے ہوشی تک طاری ہو جاتی ہے۔ یہ چونکہ جسم اور دماغ پر بہت جلد اثر انداز ہوتی ہے ' اس لیے اس سے نشے کی بہت زیادہ لت پڑ جاتی ہے۔ صرف تین چار دن تک روزانہ دو تین سگریٹ پینے سے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر اس سے نجات بہت مشکل ہو جاتی ہے۔

۲۔ کوکین :

یہ کوکا نامی پودے کی پتیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ جو لاطینی امریکہ میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ یہ سفید رنگ کے پاؤڈر اور بعض اوقات ٹکڑوں کی شکل میں ملتی ہے۔ سگریٹ کی طرز پر پینے کے علاوہ اس کے انجکشن بھی لگائے جاتے ہیں۔

انسانی جسم پر مضر اثرات

یہ نہایت طاقتور نشہ مرکزی اعصابی نظام کو تیزی سے متحرک کر کے مفلوج بنا دیتا ہے۔ یہ نہایت زود اثر نشہ ہے۔ صرف پندرہ منٹ میں اس کے مضر اثرات نمودار ہو جاتے ہیں اور کم از کم ایک گھنٹا کے بعد اس کا اثر زائل ہونا شروع ہوتا ہے۔ یہ ایسا موذی نشہ ہے جو ایک دفعہ لگ جائے تو اسے چھوڑنا ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں اور دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ فشارِ خون بلند ہو جاتا ہے۔ منہ خشک ہو جاتا ہے۔ اس کا عادی اعصابی کشیدگی ' تناؤ ' قلبی کیفیات میں اچانک رد و بدل ' یادداشت کے مسائل ' مستقل بے خوابی ' وزن کی کمی ' سردرد کے مسائل سے دو چار ہوتا ہے۔ یہ اتنی مہلک اور خطرناک ہے کہ اس سے پھیپھڑے تو بالکل ناکارہ ہو جاتے ہیں۔

اس نشے کی مزید قباحت یہ ہے کہ اس کا عادی شخص دوسری بے شمار نشہ آور اشیا کے استعمال کا بھی عادی ہو جاتا ہے کیونکہ جب وہ اپنے اندر اعصابی تناؤ اور اندرونی بے چینی اور جھنجلاہٹ محسوس کرتا ہے تو اس سے نجات کے لیے وہ شراب اور دیگر نشہ آور اشیا کا استعمال بھی شروع کر دیتا ہے اور یوں وہ منشیات کے ایک لامتناہی سلسلے میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

۳۔ کیناَبس، چرَس اور بھنگ :

پہلی دونوں بھنگ کے پتوں، کونپلوں اور رس سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ کیناَبس، خاکستری، سبز یا سبز بھورے رنگ اور چرس جسے حشیش بھی کہتے ہیں، سیاہ بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔ سگریٹ میں بھر کر پی جاتی ہے۔ بھنگ، بھنگ کے پتوں کو گھوٹ کر مشروب کے طور پر پی جاتی ہے۔

نقصانات

ان نشہ آور اشیا کے استعمال سے انسان کو اپنی حرکات پر قابو نہیں رہتا۔ بہت زیادہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان کو فاصلے کا صحیح اندازہ اور وسعت کا احساس نہیں رہتا ہے۔ رنگ اور چیزوں کی آوازوں میں شدت محسوس ہوتی ہے۔ واقعات کو یاد رکھنے کی صلاحیت، سوچنے اور واضح طور پر بولنے کی اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اشیا دل کی حرکت اور بلڈ پریشر کو متاثر کرتی ہیں۔ سر چکراتا ہے، بھوک زیادہ لگتی ہے۔ غنودگی طاری رہتی ہے۔ آنکھیں سرخ، منہ اور گلا خشک ہو جاتے ہیں۔ ان اشیا کے استعمال کے عادی اشخاص کا موٹر گاڑی، سائیکل سواری یا کسی مشین پر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں صحت کے لیے اس قدر مضر ہیں کہ ان کا استعمال منہ، گلے اور پھیپھڑوں کے کینسر کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

۴۔ سکون بخش ادویات :

ذہنی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کرتے ہیں انھیں نشہ آور سکون بخش ادویات کہا جاتا ہے۔ ان کا اثر بالکل خواب آور گولیوں جیسا ہوتا ہے۔ یہ عموماً گولیوں اور کیپسولز کی شکل میں ہوتی ہیں۔ عام استعمال ہونے والی ایسی ادویات میں لبریم (Librium) ایٹی وان (Ativan) اور ویلیم (Valium) ہیں جنھیں ڈائزاپام (Diazpam) بھی کہا جاتا ہے، ڈاکٹروں کی تجویز کردہ مقدار میں، بتائی گئی خاص مدت تک استعمال کرنے سے کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے بلکہ آرام و سکون ملتا ہے۔ اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے لیکن جب زیادہ عرصے تک مقررہ مقدار سے زائد استعمال جاری رکھا جائے تو انسان کی حرکات میں بے ربطگی، سوچنے کی صلاحیت میں کمی اور یادداشت کو متاثر کرنے جیسے منفی اثرات ہوتے ہیں۔ پٹھے اور یادداشت کمزور ہو جاتے ہیں۔ سر چکراتا اور زبان میں لکنت تک آ جاتی ہے۔ بے چینی اور بے خوابی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ افسردگی اور انتہائی غصے جیسے جذباتی، ہیجانی مسائل بھی جنم لے

لیتے ہیں۔

خاندان اور سربراہِ خاندان کی ذِمّہ داریاں اور طرزِ عمل:

نشہ آور اشیا کے مندرجہ بالا مضر اثرات کے پیش نظر ایک خاندان کے ہر عاقل، بالغ مرد اور خصوصاً خاندان کے سرپرست کی ذمہ داری ہے کہ وہ گہری نظر رکھے اور ہر وقت جائزہ لیتا رہے کہ اس کے خاندان کا کوئی فرد اس بری عادت کا شکار تو نہیں۔ نشے کی لت کے ابتدائی مراحل میں نشہ کرنے والے افراد کے کردار اور جسمانی حرکات میں کچھ بنیادی علامات ظاہر ہوتی ہیں، جیسے صفائی ستھرائی سے لاپرواہی، بے وقت سو جانا، وزن میں کمی، بھوک میں اچانک کمی یا اضافہ، عمومی گرتی ہوئی صحت اور اسی طرح کردار میں تبدیلیاں، جیسے کام یا سکول و کالج سے غیر حاضری، نگران یا ساتھیوں سے چپقلش، چڑچڑا پن، موڈ میں اچانک مثبت یا منفی تبدیلی، کمرے میں دیر تک تنہا رہنا، منشیات سے متعلق لٹریچر اور منشیات مارکیٹ سے متعلق زیادہ واقفیت وغیرہ۔ بعض مکانی شہادتیں بھی نشے کی نشاندہی کر سکتی ہیں مثلاً کمرے میں سگریٹ کی پنی، مختلف پیکٹوں کی موجودگی، پائپ، استعمال شدہ ماچس، عجیب قسم کی بدبو یا اسے دور کرنے کے لیے اگربتی یا دیگر قسم کی خوشبوؤں کا استعمال وغیرہ۔

جب یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی فرد نشے جیسی بری عادت کا شکار ہو گیا ہے تو یہ مرحلہ سب سے زیادہ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ نازک ترین بھی ہے۔ اس وقت اہل خانہ کو غیض و غضب، طعن و تشنیع کی پالیسی کی بجائے عقل و ہوش سے پوری منصوبہ بندی اور منظم پروگرام سے اس مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس مرحلے میں نشے کے مرتکب شخص کے خلاف غیض و غضب، دھمکیوں، مار پیٹ، کمرے میں بند کر دینے اور گھر سے نکال باہر کرنے جیسے ردِ عمل سے معاملہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ سکتا ہے۔

اس وقت محض پردہ پوشی کی بجائے سائنٹیفک طریقِ کار اپنانا چاہیے کیونکہ نشے کے عادی افراد کو منشیات کے استعمال کو ترک کرنے کے لیے ہمت، حوصلے اور پختہ ارادے اور خاندان کی پرزور پشت پناہی چاہیے۔ اس کے ذہن سے محرومی، مایوسی، تذبذب اور خوف جیسی کمزوریاں دور کرنے کے لیے صحت مندانہ اور عاقلانہ اقدامات چاہئیں۔ منشیات کے نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہی بحالی کی جانب پہلا قدم ہو گا۔ نشہ باز کو نشہ ترک کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے اس لیے خاندان کے افراد کو جلد بازی اور مایوسانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے

بلکہ صبر و تحمل سے ہی یہ کٹھن مرحلہ طے کیا جا سکتا ہے۔ صبر' تدبر اور صحیح معنوں میں دستگیری سے نشے باز کے لیے اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ وہ سنجیدہ' پاک' نارمل اور مطمئن زندگی کی طرف زینہ بہ زینہ بڑھتا جائے اور اس مشکل سے نکل جائے۔

معاشرے پر منفی اثرات :

نشہ جہاں ایک شخص کی ذاتی زندگی کو تباہ کرتا ہے' وہاں اس کا پورا خاندان مالی مسائل سے بھی دو چار ہوتا ہے۔ یہ شخص نشے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے غیر قانونی کاروبار کرنے پر اتر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات گداگری جیسا ناپسندیدہ دھندا کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ نشہ جہاں ایک شخص اور اس کے خاندان کو متاثر کرتا ہے' وہاں معاشرے میں بہت سی دیگر معاشرتی' سماجی برائیوں اور الجھنوں کو بھی جنم دیتا ہے۔ اس لیے ایک فرد یا خاندان کی انفرادی کوشش کے ساتھ اس لعنت سے پوری قوم اور ملک بلکہ پوری انسانیت کو نجات دلانے کے لیے ملکی' قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی بھرپور اور مربوط کوششوں کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں درج ذیل عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں :

عملی اقدامات :

بچوں کی تربیت : والدین کو بچوں کی تربیت شروع سے ہی ایسی کرنی چاہیے کہ وہ بڑے ہو کر عملی زندگی میں مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لیے والدین کو بچے کے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینا چاہیے۔ کھل کر اظہار خیال کرنے کے سلسلے میں بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اس طرح انھیں منشیات سے دور رکھنے میں خاصی مدد ملے گی۔ سکولوں اور کالجوں میں طلبہ و طالبات کو اس لعنت سے روکنے کے لیے صحت مند جسم اور زندگی سے متعلق معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے تاکہ وہ نشے کے برے اثرات کا خود مشاہدہ کر سکیں۔

موثر تشہیر و ترغیب : اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے موثر تشہیر و ترغیب کو حکومتی سطح سے گاؤں کی سطح تک پھیلایا جائے۔ ریڈیو' ٹیلی وژن' اخبارات و جرائد وغیرہ کسی چیز کے متعلق رائے عامہ بدلنے میں بڑا موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے منشیات کے نقصانات اور برے اثرات کے متعلق جامع معلومات عوام تک پہنچانے کے لیے ان کا بھرپور استعمال کیا جانا چاہیے۔

نوجوانوں کی تنظیمیں : ملک کے کونے کونے میں نوجوانوں کی تنظیمیں تشکیل دی جائیں جو دل چسپ ' مثبت اور تعمیری پروگرام ترتیب دے کر نوجوانوں کو منشیات سے دور رہنے کی ترغیب دے سکیں۔ یہ تنظیمیں صحت مند زندگی کی اہمیت بڑھانے کے لیے ورزش اور کھیلوں وغیرہ پر مبنی پروگرام ترتیب دے کر نوجوانوں کو منشیات سے دور رکھنے میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔

سخت سزائیں : منشیات کا دھندا کرنے والوں کے خلاف سخت ترین اقدامات کیے جائیں۔ عبرتناک سزائیں دی جائیں تاکہ اس کاروبار کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

بین الاقوامی فورم کا استعمال : آخر میں بین الاقوامی طور پر اقوام متحدہ ' غیر جانبدار ممالک کی تحریک کے ممبر ممالک ' یورپی برادری اور اسلامی ممالک کے مختلف فورم سے اس لعنت کے خلاف جہاد کے جذبے سے سرشار ہو کر تحریک چلائی جائے۔ اس سلسلے میں تمام ممالک کی تمام تنظیموں کو مربوط کوشش کرنی چاہیے تاکہ پوری انسانیت کو تباہی سے بچایا جا سکے۔

سوالات

۱۔ اسلام میں منشیات کے استعمال سے متعلق کیا احکام صادر ہوئے ہیں ؟

۲۔ نشہ آور اشیا ' بالخصوص ہیروئن اور کوکین کے استعمال سے انسان کو کون کون سے عارضے لاحق ہو سکتے ہیں ؟

۳۔ ادویات کے طور پر استعمال ہونے والی سکون بخش ادویات کا زیادہ استعمال صحت کے لیے کیوں مضر ہے ؟

۴۔ منشیات کے انسداد کے لیے ہم پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ؟

۵۔ منشیات کی لعنت سے محفوظ رہنے کے لیے کیا اقدام ضروری ہیں ؟

—— ○○○ ——

سوانح / شخصیت اور سیرت نگاری

سوانح نگاری کا فن اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے جہاں ایک طرف فنِ تاریخ سے منسلک ہے تو دوسری طرف فنِ ادب سے۔ تاریخ کو عظیم شخصیتوں کی سوانح کے سلسلے کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اگر یہ شخصیتیں ادب سے یا ادیبوں سے متعلق ہوں یا ان کی سوانح نگاری میں فنی اور ادبی تقاضوں اور معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہو تو یہ ادب کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔

کامیاب سوانح نگاری کے لیے ضروری ہے کہ سوانح نگار جہاں اپنے موضوع سے پوری طرح آگاہ ہو اور اس سے قریبی وابستگی بلکہ فنی ہمدردی رکھتا ہو وہاں اس کے پورے عہد کا مکمل شعور بھی رکھتا ہو۔ کوئی شخصیت کتنی ہی قد آور اور عام سماجی سطح سے کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو' پورے فکری اور تہذیبی ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی معاشرت' تہذیب' فکری و تمدنی پس منظر سے آگاہی' سوانح نگار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ایک اچھی سوانح عمری ادیبانہ موضوعیت اور شاعرانہ حسیّت کے ساتھ ساتھ مؤرخانہ معروضیت اور سائنسی علیت کا تقاضا کرتی ہے اور ان کے درمیان توازن کی حامل ہوتی ہے۔

اپنے موضوع اور اس کے عہد سے گہری واقفیت کے علاوہ سوانح نگاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصنف کے عہد کے حوالے سے بھی معنویت کی حامل ہو اور اس کے علاوہ وسیع تر انسانی تاریخ کے نقطہ نظر سے بھی اس کی اہمیت ہو۔ یہ خصوصیت سوانح نگاری کی وسیع تر دلچسپی کا باعث بنتی ہے اور ایک اعلیٰ ادبی فن پارے کی طرح اپنے عہد سے بلند ہو کر ہر عہد کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اچھی سوانح موضوع کی صرف خوبیوں اور کارناموں کا ہی احاطہ نہیں کرتی بلکہ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی ہمدردی اور انسانی دلچسپی اور فنی بصیرت کے نقطہ نظر کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس طرح سوانح جہاں ایک طرف مکمل شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے' دوسری طرف وہ نقطہ نظر کے توازن اور اظہار کے باعث اپنے اندر سچائی' اعتماد اور یقین کی خصوصیت بھی رکھتی ہے۔ ان تمام خصوصیات اور عوامل کے اظہار کے لیے مناسب' پرکشش زبان اور سادہ لیکن دلکش اسلوب کا استعمال اس سوانح میں ادبی شان پیدا کر دیتا ہے۔ موضوع کی ترتیب و پیش کش' سوانح کی مجموعی ہیئت ترکیبی اور زبان و اظہار کا استعمال سوانح کو ادبی مرتبہ عطا کرتا ہے اور اسے فنِ ادب کا حصہ بنا دیتا ہے۔

اردو زبان و ادب کا سوانح نگاری سے قریبی تعلق رہا ہے۔ شبلی کی "الفاروق"' "المامون"' "سوانح مولانا روم" اردو ادب کی ایسی سوانح عمریاں ہیں جنھوں نے اردو نثر کے فروغ اور مسلمانوں کو ان کی تاریخ اور گذشتہ عظمت سے آگاہ کرنے میں خاصا کردار ادا کیا۔ حالی نے "حیاتِ جاوید" لکھ کر جہاں سرسید احمد خاں کی زندگی کی تفصیلات کو محفوظ کر دیا' وہیں اردو ادب میں سوانح کے فن کو بھی ایک واضح شکل عطا کی۔

سوانح نگاری کی ایک صورت کا نام "شخصیت نگاری" ہے جسے "خاکہ نگاری" بھی کہا جاتا ہے۔

"خاکہ نگاری" سے مراد کسی شخصیت کا ایک ایسا "تعارفی مرقع" ہے جس میں اس شخصیت کے نمایاں اور اہم پہلو پڑھنے والے کے سامنے آ جائیں۔ "خاکہ نگار" اپنی تحریر میں کسی شخصیت کی شکل و شباہت، شخصیت، عادات و خصائل اور خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ممدوح کی صورت و سیرت کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ موضوع سے دلچسپی و ہمدردی، شخصیت سے گہری واقفیت اور دلچسپ و دلکش پیرایہ بیان، خاکہ نگاری کے ضروری اجزا ہیں۔ کامیاب خاکہ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ زیرِ بحث شخصیت کی خوبیوں کے علاوہ اس کی خامیوں، کمزوریوں اور مخصوص عادات کو بھی پیش کیا جائے۔ اپنے اختصار، تاثر، دلچسپی، جامعیت اور دلچسپ و پرکشش اسلوبِ بیان کے باعث، خاکہ نگاری نے اردو ادب میں خاص اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" میں مختلف شعرا کی شخصیتوں کے بیان کی صورت میں ملتے ہیں لیکن اس کی نمایاں اور واضح مثالیں مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" اور چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ" ہیں۔ نئے دور کے خاکہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو کے "گنجے فرشتے"، محمد طفیل کے "آپ، جناب، صاحب" اور قرۃ العین کی "پکچر گیلری" اہمیت رکھتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی سوانح مبارک لکھنے کا فن "سیرت نگاری" کہلاتا ہے۔ اردو ادب میں سیرت نگاری، تاریخی اور ادبی حوالوں کے علاوہ قومی اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا شبلی کی "سیرۃ النبیؐ" اردو ادب میں نہایت ہی اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی "رحمت للعالمین" اور چوہدری افضل حق کی "محبوب خدا" بھی اپنے اسلوب کی دلکشی اور رسولِ کریمؐ کی ذات مبارکہ سے محبت کے باعث اردو ادب میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

— ○○○ —

مولانا شبلی نعمانی

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

اصل نام محمد شبلی تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کی نسبت سے شبلی نعمانی مشہور ہوئے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی پھر اعظم گڑھ، غازی پور، سہارن پور اور لاہور میں تعلیم مکمل کی۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا لیکن اس پیشے میں ان کا جی نہ لگا۔ علی گڑھ گئے جہاں سر سید نے انھیں عربی، فارسی کا استاد مقرر کر دیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ علی گڑھ میں پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی سیکھی اور انھیں عربی سکھائی۔ سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ سے حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں وہ چار سال تک رہے۔ وہاں سے پھر واپس لکھنؤ آ گئے اور دارالعلوم "ندوہ" سے وابستہ ہوئے۔ آخری دور میں اختلافات کے سبب ندوہ سے بھی علیحدہ ہو گئے اور اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" کے قیام میں لگ گئے۔

شبلی ایک جامع الصفات شخصیت تھے، مفکر، مورخ، ناقد، فقیہ، مصلح، واعظ کے علاوہ شاعر اور صاحب ذوق شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں "المامون"، "سیرۃ النعمان"، "الفاروق"، "الغزالی"، "علم الکلام"، "الکلام"، "موازنہ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" نمایاں ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں ان کی تمام تر توجہ "سیرۃ النبی" پر مرکوز تھی جو "اردو سیرۃ نگاری" میں ان کا اہم کارنامہ ہے۔ زیر نظر اقتباس اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

شبلی کا انداز تحریر شگفتہ، رواں لیکن مدلل ہے۔ ان کی تحریروں میں ادبی شوخی و حسن بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔ ان کے ہاں فارسی و عربی کے الفاظ و تراکیب کثرت سے استعمال ہوتی ہیں لیکن وہ سادہ، عام فہم اور شستہ ہوتی ہیں اور عبارت کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔

ہجرتِ نبویؐ

اس وقت جب کہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا لیکن خود وجود اقدسؐ جو ان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لیے حکمِ خدا کا منتظر تھا۔ مکے کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چکے تھے، وہ جانثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے، قبیلہ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا اس کے رئیس طفیلؓ بن عمرو نے اپنا قلعہ پیش کیا، کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں، لیکن آپ نے انکار فرمایا کہ کارسازِ قضا نے یہ شرف صرف انصار کے

لیے مخصوص کیا تھا چنانچہ قبل ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب دیکھا کہ دارالہجرہ ایک پُر باغ و بہار مقام ہے۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ کا شہر ہو گا' لیکن وہ شہر مدینہ نکلا۔

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہؓ مدینے پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پر اثر ہے' اور اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے' اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ انہی سے سن کر کہا ہو گا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینے میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلے کے رؤسا یعنی عتبہ' ابوسفیان' جبیر بن مطعم' نضر بن حارث بن کلاۃ۔ ابوالبختری' ابن ہشام' زمعہ بن اسود بن مطلب' حکیم بن حزم' ابوجہل۔ امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں ایک نے کہا: محمدؐ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا جلاوطن کر دینا کافی ہے۔ ابوجہل نے کہا ہر قبیلے سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر' تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے۔ اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے' اس لیے باہر ٹھہرے رہے' کہ آنحضرت نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی تاہم آپ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا' آپ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا۔ اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپ کو قریش کے ارادے کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اس بنا پر جناب امیرؓ[1] کو بلا کر فرمایا: "مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے' میں آج مدینے روانہ ہو جاؤں گا' تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو' صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔" یہ سخت خطرے کا موقع تھا۔ جناب امیرؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے

1۔ مراد حضرت علیؓ ہیں۔

قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بسترِ خواب قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے۔ دستور کے مطابق دروازے پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا "کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو۔" بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ سے شادی ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو چکی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا۔ میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہو گا؟ ارشاد ہوا: ہاں! حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینے سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں۔ محسنِ عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ ارشاد ہوا "اچھا! مگر بقیمت"۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں۔ ان کی بڑی بہن اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا۔ دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا۔ نطاق جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی، تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبے کو دیکھا اور فرمایا! "مکہ تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔" حضرت ابوبکرؓ سے پہلے قرار داد ہو چکی تھی۔ دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جاکر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ، جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ ہوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی، شام کو آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے، بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ انکا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی۔ لیکن ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزاریں۔

صبح قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بجائے جنابِ امیرؓ تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جاکر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ

دیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کیا کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے' کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں۔ آپ نے فرمایا!

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ)

"گھبراؤ نہیں' خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

بہر حال چوتھے دن آپ غار سے نکلے۔ عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا' راہنمائی کے لیے اجرت پر مقرر کر لیا گیا۔ وہ آگے آگے راستہ بتاتا تھا۔ ایک رات دن برابر چلتے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی' تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سائے میں آرام فرمائیں۔ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا' سواری سے اتر کر زمین جھاڑی' پھر اپنی چادر بچھا دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آرام فرمایا' تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے' تو لائیں' پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔ اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے' پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہایا۔ برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑ جائے۔ دودھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا۔ آپ نے پی کر فرمایا: "کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا۔" آفتاب اب ڈھل چکا تھا اس لیے آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا' اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم نے سنا' تو انعام کی امید میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) روانہ ہو رہے تھے۔ اس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا۔ لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی' وہ گر پڑا' ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں "نہیں" نکلا لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی' دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا۔ اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال نکالی' اب بھی وہی جواب تھا' لیکن مکرر تجربے نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرت کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر

فرمانِ امن لکھ دیا۔

حسنِ اتفاق یہ کہ حضرت زبیر شام سے تجارت کا مال لے کر آ رہے تھے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کیے جو اس بے سرو سامانی میں غنیمت تھے۔

تشریف آوری کی خبر مدینے میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا۔ معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آ رہے ہیں۔ لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہلِ عرب! لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا۔" تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا۔ انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے۔

سوالات

۱۔ علامہ شبلی کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیات بیان کریں۔

۲۔ اقتباس ہجرتِ نبویؐ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۳۔ ہجرتِ نبویؐ میں حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کی خدمت کا ذکر اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۴۔ ہجرت میں پیش آمدہ مشکلات پر فراستِ نبویؐ کے ذریعے سے کس طرح قابو پایا گیا؟

— ○○○ —
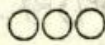
قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ
(۱۸۶۷ء - ۱۹۳۰ء)

علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری ۱۸۶۷ء میں صوبہ پنجاب (ہندوستان) کے ایک تاریخی قصبے منصور پور میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے "منصور پوری" کہلائے۔ آپ کے آباؤ اجداد سلاطینِ مغلیہ میں دہلی کے قاضی تھے' اس لیے خاندانی نام قاضی پڑ گیا۔

قاضی صاحب کے والدین نے آپ کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ آپ نے عربی اور قرآن مجید کی تعلیم اپنے والد بزرگوار قاضی احمد شاہ صاحب سے حاصل کی۔ عربی میں کامل دسترس کے لیے اس دور کے جید عالم دین مولانا عبدالعزیز کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ فارسی مہندر کالج پٹیالہ کے منشی سکھن لال سے پڑھی اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ صرف سترہ برس کی عمر میں منشی فاضل کیا اور ساڑھے سترہ سال کی عمر میں بحیثیت سررشتہ دار محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ آپ مہتمم انڈین ہاؤس مہتمم یورپین گیسٹ ہاؤس کے علاوہ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور تقریباً" پچیس سال تک جوڈیشل آفیسر رہے اور مدت العمر مجسٹریٹ درجہ اول دفعہ ۳۰ اور سیشن جج رہے۔

قاضی صاحب بے حد متواضع' خلیق اور انتہائی منکسر المزاج شخصیت تھے۔ ہمیشہ فرقہ واریت سے بہت بلند رہتے۔ مسلم اکابرین کے علاوہ وہ غیر مسلم نابغہ روزگار شخصیات مثلاً شیکسپیئر اور کارلائل کا ذکر بھی بہت احترام سے کرتے تھے۔ جملہ علما' فقرا اور آئمہ کرام کی بے حد عزت کرتے تھے۔ حضور اکرمؐ اور علمائے حق اور صوفیا عظام کے ساتھ غیر متزلزل عشق تھا۔ ذہانت و فطانت خداداد تھی۔

سیرت پر قلم اٹھانا بلاشبہ مصنف کی حضور پاکؐ سے عقیدت اور شیفتگی کا ثبوت تو ہے ہی' اس پر یہ امر اس کا متقاضی بھی ہوتا ہے کہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد کا مطالعہ اور تحقیق کر کے پوری دیانت داری سے ایک بے لاگ اور غیر متعصب رائے پیش کی جائے۔ قاضی صاحب نے سیرت پاک پر مشہور کتاب "رحمت للعالمین" لکھتے وقت تحقیق و توثیق کے اس اصول کو بڑی محنت اور دیانت داری سے پیش نظر رکھا ہے۔ جناب رسول کریمؐ کی سیرت لکھتے وقت دوسرے ادیان کا عمیق تقابلی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور اس سے ان اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا جامع جواب مہیا کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں' جو اسلام اور اس کے رسول برحقؐ پر کی جاتی ہیں۔ رسول پاکؐ کی شخصیت کی عظمت کو صرف ایک عقیدت مند مسلمان کی نظر سے ہی بیان نہیں کیا بلکہ توریت' انجیل اور دوسری مذہبی کتب سے بڑی عرق ریزی کے بعد دلائل تلاش کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ جناب رسول خداؐ رحمتہ للعالمین تھے۔

گہرے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں سیرت کی اس بہترین کتاب کا طرز بیان استدلالی ضرور ہے مگر خشک اور غیر دلچسپ ہرگز نہیں۔ قاضی صاحب نے اپنے موضوع کو اتنے خوبصورت انداز سے سمیٹا ہے کہ صرف تین جلدوں میں سیرت پاکؐ کا کوئی گوشہ بھی تشنہ تکمیل نہیں رہا۔

قاضی صاحب اپنی سیرت کی کتاب کی وجہ سے بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تفسیر، تاریخ، اسماء الحسنٰی اور تقابل ادیان اور سفرنامہ حجاز بھی ایک کلاسیکل مقام رکھتی ہیں۔

حج بیت اللہ سے واپسی پر آپ کا وصال یکم محرم الحرام ۱۳۴۹ھ بمطابق ۳ مئی ۱۹۳۰ء بروز جمعۃ المبارک عرشہ جہاز پر ہوا۔ آپ کی نماز جنازہ سید محمد اسماعیل غزنوی نے پڑھائی اور شرع کے مطابق آپ کے جسد خاکی کو تختہ پر رکھ کر سطح آب پر چھوڑ دیا گیا۔

اِسلام ہی اُخلاقِ حَسَنہ کا مُعَلِّم ہے

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: میں بزرگ ترین اخلاق اور نیکو ترین اعمال کی تکمیل کے لیے نبی بنایا گیا ہوں۔

اسلام نے بتایا ہے کہ اخلاق محمودہ کے سرچشمے چار ہیں:

(۱) صبر (۲) عفت (۳) شجاعت (۴) عدل

۱۔ **صبر کے نتائج ہیں:** برداشت مصائب، غصہ پی جانا، عدم ایذا دہی، بردباری، خاکساری، گھبراہٹ کا نہ ہونا، حملہ نہ کرنا۔

۲۔ **عفت کے نتائج ہیں:** رذائل و قبائح سے اجتناب "قولاً" و "فعلاً" پاکیزگی، عفت سے حیا پیدا ہوتی ہے اور حیا کا اثر ہر ایک خلق نیک پر ہے۔

عفت سے جھوٹ، بخل اور بدکاری کا ستیاناس ہوتا ہے۔

۳۔ **شجاعت کے نتائج ہیں:** آپ اپنی عزت کو ملحوظ رکھنا، بر ترین اخلاق کا جویا رہنا، مال و جان سے دوسرے کی امداد کرنا، طیش و غضب سے دور رہنا، اپنے نفس کی باگ عقل کے سپرد کر دینا۔

۴۔ **عدل کے نتائج ہیں:** اعتدال، اخلاق۔ اور افراط و تفریط کو چھوڑ کر وسط کو اختیار کر لینا۔

عدل بتاتا ہے کہ جود و سخا اسے کہتے ہیں جو بخل اور اسراف کے درمیان ہو۔ عدل بتاتا ہے کہ حیا وہ ہے جو ذلت و بے شرمی کا میانہ ہو۔

عدل بتاتا ہے کہ شجاعت اسے کہتے ہیں جو جبن اور تہور کا وسط ہو۔

عدل بتاتا ہے کہ حلم یہ ہے کہ تکبر و اہانت کے بیچ بیچ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اچھے خلق ہی کا نام "نیکی" ہے۔"

"قیامت کے دن تم میں سے وہ شخص مجھے پیارا اور میرے دربار میں مجھ سے قریب تر ہو گا' جو اچھے اخلاق والا ہے۔ مگر چبا چبا کر باتیں بنانے والا' خوش کلامی جتانے والا' اپنی خوش گپی سے دوسروں کو تھکا دینے والے' مجھے ناپسند ہوں گے اور دربار میں دور تر بھی ہوں گے۔"

ان احادیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ تکمیلِ ایمان اور قربِ رسول ؐ اور پسندیدگیِ مالک کے مدارج کا دار و مدار اُخلاقِ حَسنہ پر ہے۔

اُخلاقِ حُسنہ کے بیان میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا تعلق انسان کی خود اپنی ذات سے بھی ہے اور اَبنائے جنس سے بھی اور رب العالمین کے ساتھ بھی۔

خود اپنی ذات کے متعلق یہ ہے کہ آپ اپنے کو ناقص سمجھے اور سمجھ لے کہ ناقص کے افعال بھی ناقص ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان تہذیبِ اخلاق میں ہمیشہ کوشاں رہے گا۔

ابنائے جنس کے متعلق یہ ہے کہ دوسروں کی ایذا دہی برداشت کرے۔ مگر خود انھیں ایذا رسانی کا ارادہ نہ کرے۔

رب العالمین کے ساتھ حسنِ خلق کے معنی یہ ہیں کہ جو معاملہ تیرے اور رب العالمین کے درمیان ہے اسے موجبِ شکر قرار دے اور احکام یا افعالِ الٰہی کے بارہ میں کبھی دل و زبان پر ادب اور شکر کے سوا کوئی لفظ جاری نہ ہو۔

یہ ہیں وہ اَخلاقِ حَسنہ، جن کی تکمیل اسلام نے قولاً" اور فعلاً" فرمائی ہے۔

اسلام ہی غیر متعصّب دین ہے۔

الف تعصب کے معنٰی یہ بھی ہیں کہ عطائے حقوق کے وقت کسی کو حق سے زائد دیا جائے

اور کسی کو حق سے کم

ب اس کے یہ معنیٰ بھی ہیں کہ دوسرے لوگوں کی آزادی، عقل اور حریتِ مذہب پر ناجائز بندشوں کا بار ڈالا جائے۔

ج اس کے یہ معنیٰ بھی ہیں کہ اپنے مذہب کی حمایت میں دیگر مذاہب کو حقِ حفاظت سے محروم کر دیا جائے۔

د اس کے یہ معنیٰ بھی ہیں کہ اپنے مذہب کی برکات و انوار کا مستحق خود اپنے ہی آپ کو سمجھا جائے اور دوسروں کو ان برکات و انوار سے بالکل دور رکھا جائے۔

بحمد اللہ کہ اسلام کی تعلیم ان جملہ نقائص سے پاک ہے۔ قرآنِ عظیم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ تعصب کی ان جملہ اقسام کو برا بتایا اور اپنے دامنِ تعلیم کو اس خار زار سے ہمیشہ بلند تر رکھا۔

اسلام ہی کی بنیاد قومیّت سے بالاتر رکھی گئی ہے۔

عموماً" دنیا میں تین چیزیں تمام مذاہب اور جملہ ممالک پر حکمران رہی ہیں کہ ان کے دائرہ حکومت سے نکلنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی

(۱) نسل (۲) زبان (۳) رنگت

اسلام نے جو اللہ احد کا واحد دین ہے، ان ہر سہ امتیازات کی دیواروں کو مٹایا، پست و بلند کو ہموار سطح پر کھڑا کیا اور دنیا کے سب ملکوں اور سب قوموں کی شیرازہ بندی کے لیے صرف دینِ واحد کو پیش کیا۔

اسلام کی بنیادی تعلیم، اختلافِ نسل ہے نہ اختلافِ زبان ہے، نہ اختلافِ رنگ ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد خدا شناسی پر ہے اور ہر شخص کو اس میں بخوبی آزادی ہے کہ وہ قرب و رضوانِ الٰہی کے جس دروازے سے چاہیے داخل ہو جائے۔ یہ خصوصیت یقیناً اسلام ہی کو حاصل ہے۔

(رحمۃ للعالمین)

سوالات

۱۔ قاضی صاحبؒ نے سیرتِ رسولؐ کے حوالے سے اسلام کے بنیادی اصول واضح کیے ہیں۔ جائزہ لیجیے۔

۲۔ قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کا انداز بیان عالمانہ نہیں، دوستانہ ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے علم کی وسعت اور گہرائی متاثر کرتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

۳۔ اسلام ہی غیر متعصب دین ہے۔ سبق میں دی گئی وضاحت کو اپنے لفظوں میں بیان کریں۔

۴۔ سیرتِ نبویؐ سے اقتباس میں اخلاقِ حَسنہ کی توضیح کو اپنے الفاظ میں پیش کریں۔

——— ○○○ ———

سیّد سلیمان ندوی
(۱۸۸۴ء - ۱۹۵۳ء)

ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں "دسنہ" میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم پھلواری شریف' دربھنگہ میں حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں دار العلوم "ندوہ" میں داخلہ لیا جہاں انھیں مولانا شبلی نعمانی کی شاگردی اور تربیت میسر آئی۔ ۱۹۰۷ء میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور "الندوہ" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ندوہ کے اساتذہ میں شامل ہو گئے اور علم کلام اور عربی پڑھانے کا آغاز کیا پھر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا جو تمام عمر جاری رہا۔ ۱۹۱۵ء میں "دار المصنفین" کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۶ء میں ماہ نامہ "معارف" جاری کیا۔ ۱۹۱۸ء میں اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی آخری عظیم تصنیف سیرۃ النبی ؐ کی جلد اول اور دوم کی تدوین کرنے کے بعد اس کو شائع کیا اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔ ۱۹۴۳ء میں مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیات شبلی" شائع کی۔ ۱۹۵۰ء میں بھارت کے خصوصی حالات کے پیشِ نظر آپ پاکستان آ گئے۔

سیرۃ النبی ؐ کی تدوین کی تکمیل اور "حیاتِ شبلی" کی تالیف کے علاوہ بھی مولانا کی کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں عربی الفاظ کی جدید لغت (۱۹۸۱ء)' درس الادب' (۱۹۱۲ء) تاریخ ارض القرآن' حیاتِ مالک (۱۹۱۷ء)' "رسالہ اہلِ سنت" (۱۹۱۷ء)' سیرۃ عائشہ ؓ (۱۹۲۰ء)' "خلافتِ عثمانیہ" (۱۹۲۱ء) اور اسلام' خلافت اور ہندوستان (۱۹۲۱ء)' خطباتِ مدراس (۱۹۲۵ء)' رسولِ وحدت (۱۹۳۲ء)' عمر خیام (۱۹۳۳ء)' نقوشِ سلیمانی (۱۹۳۹ء)' "رحمتِ عالم" (۱۹۴۰ء)' سیر افغانستان (۱۹۴۵ء) اہمیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے کلام کا مجموعہ "ارمغانِ سلیمان" بھی شائع ہو چکا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی نثر موضوع کے اعتبار سے سنجیدہ لیکن شستہ' رواں اور سادہ ہوتی ہے۔ صحت بیان اور فصاحتِ زبان کے ساتھ ساتھ اس میں علمی متانت اور اعلیٰ و ارفع خیالات و تصورات کو ادا کرنے کی استطاعت بھی ہے۔ سلیمان ندوی اپنے عہد کے ایک بڑے عالم تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ "سیرۃ النبی ؐ" کی تکمیل ہے جس میں انھوں نے تحقیق و تفحص کا حق ادا کر دیا ہے۔ زیرِ نظر اقتباس سیرۃ النبی ؐ کی جلد دوم سے لیا گیا ہے۔

مَجالسِ نَبوی ؐ

دربارِ نبوت ؐ

شہنشاہِ کونین ؐ کا دربار نقیب و چاؤش [1] اور خَیل وحَشم [2] کا دربار نہ تھا۔ دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے۔ تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں یعنی کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا۔ گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا۔ لیکن یہ امتیاز مراتب' نسب و نام' یا دولت و مال کی بنا پر نہیں بلکہ فضل و استحقاق کی بِنا پر ہوتا تھا۔ سب سے پہلے اہلِ حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کے معروضات سن کر ان کی حاجت بر آری فرماتے۔

تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے' خود بھی آپ مؤدّب ہو کر بیٹھتے۔ جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا۔ کوئی شخص بولتا تو جب تک چپ نہ ہو جائے' دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا۔ اہلِ حاجت عرضِ مدعا میں ادب کی حد سے بڑھ جاتے تو آپ کمالِ حلم کے ساتھ برداشت فرماتے۔

آپ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے' جو بات ناپسند ہوتی' اس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے۔ کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہے تو شکریہ قبول فرماتے۔ مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا آپ بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ ہنسی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے۔ کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آجاتا تو حسبِ مرتبہ اس کی تعظیم فرماتے اور فرماتے اَكْرِمُوا كَرِيْمَ كُلِّ قَوْمٍ [3]۔ مزاج پُرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے۔ یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک نہیں پہنچا سکتے مجھ کو ان کے حالات اور ضروریات کی خبر دو۔

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آجاتا تو سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا اور امرا جب دربار جماتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے

۱۔ عصا بردار' نقیب۔
۲۔ نوکر چاکر' شان و شوکت۔
۳۔ تم سب ہر قوم کے معزز شخص کا احترام کرو۔

رہتے۔ آپ نے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ "جس کو یہ پسند آتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں۔ اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈنی چاہیے۔" البتہ جوشِ محبت میں کسی کسی کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا جب کبھی آ جاتیں، تو اکثر کھڑے ہو جاتے اور فرطِ محبت سے ان کی پیشانی چومتے۔ (حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے لیے بھی آپ نے اٹھ کر چادر بچھا دی تھی۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ کے رضاعی بھائی آئے، تو ان کے لیے بھی محبت سے کھڑے ہو گئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا۔)

ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص اس سے زیادہ عزت یاب ہے۔ جب کوئی شخص اچھی بات کہتا تو آپ تحسین فرماتے اور نامناسب گفتگو کرتا، تو اس کو مطلع فرما دیتے۔

ایک دفعہ دو شخص مجلسِ اقدس میں حاضر تھے۔ ان میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا۔ معزز صاحب کو چھینک آئی، لیکن انھوں نے اسلامی شعار کے موافق اَلْحَمْدُلِلّٰہ نہیں کہا۔ دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی، انھوں نے اَلْحَمْدُلِلّٰہ کہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ معمول یَرْحَمُکَ اللّٰہ کہا۔ معزز صاحب نے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا انھوں نے خدا کو یاد کیا تو میں نے بھی کیا۔ تم نے خدا کو بھلا دیا تو میں نے بھی تم کو بھلایا۔

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیوب آپ تک نہ پہنچائیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں۔

آدابِ مجلس

ان مجالس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ عموماً بدو اپنے اسی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے۔

خلقِ نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بن جاتا ہے۔ آپ پیغمبر خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں۔ صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمتِ اقدس میں حاضر ہیں۔ ایک شخص آتا ہے اور اس کو آں حضرت میں اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا۔ لوگوں سے پوچھتا ہے "محمد کون ہے؟" صحابہ بتاتے ہیں کہ یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتا ہے اے ابنِ عبدالمطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا، خفا نہ ہونا۔ آپ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں۔

باایں ہمہ سادگی و تواضع ' یہ مجالس رعب ' وقار اور آدابِ نبوت ؐ کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں۔ آں حضرت ؐ کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ ' اخلاق ' مذہب اور تزکیہ نفوس تک محدود تھا۔ اس کے علاوہ اور باتیں منصبِ نبوت ؐ سے خارج تھیں۔ لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے۔ مثلاً یارسول اللہ میرے باپ کا کیانام ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے' وہ کہاں ہے؟ آپ ؐ اس قسم کے سوالات کو ناپسند فرماتے تھے۔

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کیے گئے تو آپ ؐ نے برہم ہو کر فرمایا کہ "جو پوچھنا ہے پوچھو' میں سب کا جواب دوں گا۔" حضرت عمر ؓ نے آپ کے چہرے کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا' رَضِیتُ[1]

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا۔ ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ ؐ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا۔ بعض اوقات آپ ؐ گفتگو کرتے ہوتے' کوئی صحرانشین بدو جو آدابِ مجلس سے ناواقف ہوتا' دفعتہً آجاتا اور عین سلسلہ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا۔ آپ ؐ سلسلہ تقریر قائم رکھتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جواب دیتے۔ ایک دفعہ آپ ؐ تقریر فرما رہے تھے ایک بدو آیا اور آنے کے ساتھ ہی اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ؐ تقریر کرتے رہے ' حاضرین سمجھے آپ ؐ نے نہیں سنا۔ کسی نے کہا سنا۔ لیکن آپ ؐ کو ناگوار ہوا۔ آپ ؐ گفتگو سے فارغ ہو چکے تو دریافت فرمایا کہ "پوچھنے والا کہاں ہے؟" بدو نے کہا "میں یہ حاضر ہوں۔" آپ ؐ نے فرمایا "جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے۔" بولا کہ "امانت کیونکر ضائع ہوگی؟" فرمایا "جب نااہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا۔"

اوقاتِ مجلس

اس قسم کی مجالس کے لیے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا۔ نمازِ فجر کے بعد آپ ؐ بیٹھ جاتے اور فیوضِ روحانی کا سرچشمہ جاری ہو جاتا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ؐ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی۔ چنانچہ کعب بن مالک ؓ پر جب غزوہ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ ان ہی مجالس میں آکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودیِ مزاج کا پتہ لگاتے۔

1۔ میں خوش ہوں۔

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی تو اس میں وعظ و نصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ ؐ خاص طور پر حقائق و معارف کے اظہار کے لیے مجالس منعقد فرماتے تھے۔

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا اس لیے آپ ؐ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آ کر واپس چلے جاتے تو ان پر آپ ؐ نہایت ناراض ہوتے تھے۔ آپ ؐ ایک مرتبہ صحابہ ؓ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے۔ ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی ' وہیں بیٹھ گئے۔ دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہ ملا ' اس لیے سب کے پیچھے بیٹھے۔ لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی ' خدا نے بھی اس کو پناہ دی۔ ایک نے حیا کی ' خدا بھی اس سے شرمایا۔ ایک نے خدا سے منہ پھیرا ' خدا نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔

پند و نصائح کتنے ہی موثر طریقے سے بیان کیے جائیں ' لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دے کر منعقد فرماتے تھے۔

عورتوں کے لیے مخصوص مجالس

ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا اس بنا پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لیے خاص دن مقرر فرمایا جائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ درخواست منظور کی اور ان کے وعظ و ارشاد کے لیے ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔

اگرچہ مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی اور خاتونان حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلس عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرط حیا سے آپ ؐ کو ناگوار ہوتا۔

طریقۂ ارشاد

کبھی کبھی آپ ؐ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے۔ اس سے لوگوں

کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے ہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا' میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہو گا لیکن میں کم سن تھا اس لیے جرأت نہ کر سکا۔ بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضور آپ بتائیں۔ ارشاد فرمایا "کھجور" عبداللہ بن عمرؓ کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرات کر کے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا۔

ایک روز آپؐ مسجد میں تشریف لائے' صحابہؓ کے دو حلقے قائم تھے۔ ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دوسرے حلقے میں علمی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "دونوں عمل خیر کر رہے ہیں۔ لیکن خدا نے مجھ کو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے۔" یہ کہہ کر علمی حلقے میں بیٹھ گئے۔

مجالس میں شگفتہ مزاجی

باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت' ارشاد' اخلاق اور تزکیہ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے۔ **كَاَنَّ الطَّيْرُ فَوْقَ رُؤُسِهِمْ** (جیسے چڑیاں ان کے سروں پر بیٹھی ہوں) تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں۔ ایک دن آپؐ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی۔ خدا نے کہا کیا تمھاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے؟ اس نے کہا ہاں' لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بیج ڈالے' فوراً دانہ اگا' بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہو گیا۔ ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہو گی جو زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں۔ آپؐ ہنس پڑے۔

فیضِ صحبت

ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمھاری زیارت کو آتے۔

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمتِ اقدسؐ میں آئے اور کہا یا رسول اللہؐ! میں منافق ہو گیا ہوں۔ میں جب خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوتا ہوں اور آپؐ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔

(سیرۃ النبیؐ)

سوالات

۱۔ سیرتِ رسولِ پاکؐ پر قلم اٹھانا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ آپ اس مضمون کو اس رائے کے پس منظر میں جانچیے۔

۲۔ سید سلیمان ندوی کے اسلوبِ بیان پر ایک نوٹ لکھیے۔

۳۔ اس سبق کے حوالے سے آدابِ مجلس پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کیجیے۔

○○○
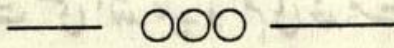
ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء)

عبدالحق ضلع میرٹھ کے قصبے ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ علی حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم فیروز پور میں پائی، علی گڑھ سے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کیا۔ علی گڑھ ہی میں وہ سرسید، محسن الملک اور حالی وغیرہ سے متاثر ہوئے۔ ملازمت کا زیادہ عرصہ حیدر آباد دکن میں گزارا۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے صدر بھی رہے۔

اردو زبان و ادب سے ان کی وابستگی مثالی تھی۔ ساری عمر اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء تک حیدر آباد میں، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک دہلی میں اسی خدمت میں مصروف رہے، پاکستان بنا تو ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ یہاں "انجمن ترقی اردو" کی بنیاد رکھی۔ پہلے اس کے سیکرٹری اور بعد میں وفات تک اسکے صدر رہے۔ اردو کی خدمت کے صلے میں قوم سے "بابائے اردو" کا لقب پایا۔ علمی و ادبی خدمات کے صلے میں ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی اور ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بہت سی کتابیں مرتب کیں اور بے شمار تنقیدی و تحقیقی و تعارفی مضامین لکھے۔ ان کی اہم کتابوں میں "قواعد اردو"، "اردو صرف و نحو"، "چند ہم عصر" اہم اور مشہور ہیں۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کے مجموعے "تنقیداتِ عبدالحق"، "مقدماتِ عبدالحق"، "خطباتِ عبدالحق" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ تالیفات و مرتبات کی تعداد اسی کے لگ بھگ ہے۔

مولوی عبدالحق کا شمار اردو کے بلند پایہ نثرنگاروں میں ہوتا ہے، وہ اردو نثر کی علی گڑھ روایت کے پیرو کار اور امین تھے جس کی بنا سرسید نے ڈالی اور جسے حالی نے فروغ دیا۔ ان کی تحریر، صاف، سادہ سنجیدہ اور دل نشین ہوتی ہے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود ان کی تحریر میں اثر اور زور ہے جس کی وجہ ان کی اپنے موضوع سے لگن اور اردو کی محبت ہے۔

اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں انھوں نے جہاں اپنے دَور کے اکابرین کے قلمی خاکے پیش کیے ہیں وہیں چند خاکے عوامی کرداروں کے بھی ہیں جن کو انھوں نے اپنے قلم اور مشاہدے کے زور سے اردو ادب کی یادگار تحریریں بنادیا ہے۔ زیرِ نظر خاکہ "نام دیو ـــــ مالی" ان کی ایک ایسی ہی تحریر ہے۔

نام دیو ـــــ مالی

نام دیو، مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو

بہت پنچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے، بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

وہ اپنے ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، اُن کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے، اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹھا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغے یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان

چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تأمل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ' تھانولے درست' سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر' جھاڑنا' بہارنا' صبح شام روزانہ' غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں نیفسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی' ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کر لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں اپنے پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا جب پانی کی قلت بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کر لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا' یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر

دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ درانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے' مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز و شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے' ٹوکیو سے جاپانی' طہران سے ایرانی' اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے' سیندھی شراب پیتے' یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج' بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی' اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا' دھوپ ہو یا سایہ' وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور

نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا' وقت پر کام کرتا' آدمیوں' جانوروں' پودوں کی خدمت کرتا' لیکن اسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا' نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان' انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی' خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

(چند ہم عصر)

۱۔ "نام دیو —— مالی" ایک عام آدمی کا خاکہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے کس ٹیکنیک کو استعمال کرتے ہوئے اس میں دلچسپی اور دلکشی پیدا کی ہے؟

۲۔ مندرجہ بالا خاکے سے مولوی عبدالحق کے اسلوب کی کیا خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں؟

۳۔ نام دیو مالی عام مالی ہونے کے باوصف حقیقت میں بڑا آدمی ہے' کیسے؟

——— ○○○ ———

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۴ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے گورنمنٹ ہائی سکول میں پائی۔ بی۔ اے کی ڈگری سینٹ اسٹیفنز کالج سے حاصل کی۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے۔ پہلے سررشتہ تعلیم میں کام کیا' بعد میں ان کی خدمات سررشتۂ عدالت نے حاصل کر لیں اور ترقی کر کے ہوم سیکرٹری ہو گئے۔

ان دنوں حیدر آباد کی ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ جنھوں نے مرزا کے ادبی ذوق کو ابھارا اور بڑی استقامت بخشی۔ ان کی مزاح نگاری بہت پسند کی گئی۔

مرزا صاحب کا طرز تحریر سادہ اور پُرلطف ہے۔ وہ بڑے شگفتہ انداز میں لکھتے ہیں۔ دلی کی خاص زبان لکھنے پر بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انھیں بے جا بناوٹ سے نفرت ہے لیکن جا بجا مزاح کی چاشنی سے تحریر میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین میں اصلاحِ معاشرہ کا پہلو نمایاں ہے مگر ان کا انداز کہیں بھی خشک ناصحانہ اور بے مزہ نہیں ہونے پاتا۔

مرزا صاحب محقق اور شگفتہ نگار ادیب تھے' انھوں نے زیادہ شہرت اپنے مضامین کے سبب ہی پائی۔ ان کے مضامین کی سنجیدہ ظرافت بہت دلکش ہے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان لکھتے ہیں لیکن وہاں کے بعض نامور مصنفین کی طرح عبارت کو محاوروں اور ضرب الامثال سے بوجھل نہیں بننے دیتے۔ بے تکلفی اور شوخی سے رواں اور سبک انداز میں ایسی دلچسپ تفصیلات بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین میں شخصیتوں کو خوب اجاگر کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ فلاں شخص سپاہی یا بادشاہ یا شاعر ہونے کی حیثیت سے کیا تھا بلکہ یہ بتاتے ہیں کہ بحیثیت انسان وہ کیا اور کیسا تھا۔ نذیر احمد دہلوی کی کہانی میں انھوں نے مولانا کے کردار اور شخصیت کے خد و خال اس انداز سے دکھائے ہیں کہ تصویر کھنچ گئی ہے۔ انھوں نے کہیں بھی اپنے ممدوح کی خوبیوں کو اجاگر کرنے اور خامیوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنا مشاہدہ اور تجربہ ہو بہو پیش کرتے چلے گئے ہیں۔

تحقیقی مقالہ نگاری میں بھی مرزا صاحب اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مگر ان کی زیادہ شہرت کا سبب ان کی مزاحیہ تحریریں ہی ہیں۔ مرزا صاحب کے کئی مضامین اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ مثلاً "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" ' "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" ' "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر" ' "آخری وصیت" ' "پھول والوں کی سیر" ' "دادا جان کا پارلیامنٹ میں جانا" وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو فراموش نہیں جا سکتیں۔

نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی

مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرزِ بیان نہ تھا جو ہنستے ہنساتے نہ لٹا دے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے، اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مقطع اور مسمے شاگردوں سے نفرت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا "ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔"

لیجیے اب مولوی صاحب کا حُلیہ سنیے:

رنگ سانولا، مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لیے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا۔ اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد باندھتے تھے۔ اس کے پلّو اڑسنے کی بجائے ادھر ادھر ڈال دیتے تھے۔ مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے، اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے رہے سے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کروائے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گگر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ فگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں، جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو مسکراتی ہوئی آنکھیں کہوں تو بے جا نہ ہو گا۔ کلہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا۔ چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے

محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لیے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہُ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ تبرم بج رہا ہے۔ اس لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے۔ اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا۔ ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری۔ ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں "گاجر" اور دلی والوں کی بول چال میں "پھلکی" کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی۔ داڑھی بہت چھدری تھی، کہ ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا۔ کلے تو کبھی قینچی کے منت کش نہیں ہوئے۔ البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنا دی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے ایکس ریز ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز۔ ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔ لیجیے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجیے۔ جنھوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے کشمیری جُبہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے، انھوں نے عالی جناب شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا، اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن یا کشمیری کام کا جبہ۔ چونکہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لیے لال زری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے، پھر بھی وقت بے وقت کے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔ ان ہی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا۔ جرابوں سے انھیں ہمیشہ نفرت تھی۔ گو دربار میں جانے کے لیے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں۔ یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔ اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھیے۔ آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں کے چلیے۔ چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آیئے۔ الٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں پر سے گزر کر لال کنویں پہنچے۔ آگے بڑھے تو

ہڈیوں کا کڑاہ ہے۔ وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آیئے۔ یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے۔ یہ بتاشے والوں کی گلی ہے۔ بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے۔ یہاں اچار چٹنی والوں کی بیسیوں دکانیں ہیں۔ ان ہی دکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے۔ تھوڑی ہی دور جاکر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے' اور نیا بنا ہوا ہے۔ صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا ہوا نظر نہیں آتا۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں' صحن کسی قدر چھوٹا ہے۔ سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے کلام مجید پر حنا کیا کرتے ہیں۔ اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے۔

چولھے بنے ہوئے ہیں۔ آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانے کا جُزوِ لَایَنفَکّ ہیں' سرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف حقے کے لیے سلگائی جاتی ہے کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے۔ دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرہ۔ گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دو دروازے بند ہیں' ایک کھلا ہے۔ باہر ایک بڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے۔ ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس' مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتہ ہے' نہ ٹوپی' نہ پیجامہ' ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے' بندھی ہوئی نہیں' محض لپٹی ہوئی ہے' لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے۔ کمرے میں نہایت اجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے' کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے۔ سرہانے تکیہ رکھا ہے۔ مگر اس کی رنگت کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ البتہ جس گاؤ تکیے سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے۔ اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا ایں چہ کاراست کہ کردہ ای"؟[2] تو ان شاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ "محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟"[3]۔ جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصہ میں رہتے تھے۔ چلیے وہاں کا بھی رنگ دکھا دوں۔ صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلا ہے۔ اس کے بعد ایک

۱۔ سرخی مائل پیلا رنگ کاغذ یا چمڑے پر لگانا۔
۲۔ مولانا! یہ کیا کام ہے جو آپ نے کیا ہے؟
۳۔ محتسب کا گھر کے اندر کیا کام؟

دروازہ آتا ہے' دروازے سے گزر کر چھت پر آتے ہیں' سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھڑیاں۔ غسل خانے کے بالکل مقابل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آخر آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی۔ یہاں بھی چاندنی کا فرش تھا۔ اس پر قالین' پیچھے گاؤ تکیہ' سامنے ایک چھوٹی نیچی میز' پہلو[1] میں حقہ اس کی حقیقت کیا حقہ' بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی ہے۔ فرشی قیمتی تھی مگر چلم پیسہ کی دو والی۔ اور نیچہ تو خدا کی پناہ۔ اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بے چارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے' مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں' اور پڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے' مگر بڑا دقیانوسی' کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں' کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں۔ کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فیلٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزئی[2] مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے۔ اوپر صندلی رنگ کا دھسہ پڑا ہوا' لیجیے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو۔ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی "پانی تیار ہے؟" جواب ملا۔ "جی ہاں۔" مولوی صاحب غسل خانہ میں کپڑے بدل (یا یوں کہوں کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو۔ لیجیے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے' آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

خوش خوراک تھے' اور مزے لے لے کے کھانا کھاتے تھے۔ ناشتہ میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوہ کا بڑا شوق تھا۔ ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ پڑھاتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھے ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے ان کے لیے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کی داڑھ میں زیرہ ہو جاتا۔ البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے۔ "بھئی کیا مزے کا

۱۔ پہلو یا بازو۔

۲۔ صدری' پوری یا آدھی آستین کی واسکٹ نما کُرتی۔

خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزے کا آم ہے۔" مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے؟ میں نے تو تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

(نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی)

سوالات

۱۔ فرحت اللہ بیگ کے مضمون کہانی سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

۲۔ فرحت اللہ بیگ نے شخصیت نگاری میں اپنے طرز بیان سے جادو پیدا کیا ہے۔ اس اقتباس کو پڑھ کر آپ کی کیا رائے ہے؟

۳۔ کتاب میں شامل اقتباس کے حوالے سے مولوی نذیر احمد کا حلیہ بیان کیجیے۔

۴۔ اچھی ظرافت وہی ہے جو تہذیبی رچاؤ کے ساتھ سامنے آئے۔ فرحت اللہ بیگ کی ظرافت نگاری پر یہ قول کہاں تک صادق ہے؟

۵۔ مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں مولوی نذیر احمد کے کردار پر ایک نوٹ لکھیں۔

—— OOO ——

چراغ حسن حسرت

(۱۹۰۲ء - ۱۹۵۵ء)

بارہ مولا (مقبوضہ کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ بچپن بڑی عسرت میں گزرا اور باقاعدہ پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن اپنی محنت اور شوق سے تعلیم حاصل کی۔ پہلے مدرس ہوئے، پھر صحافت کا شوق پیدا ہوا۔ کلکتہ پہنچ کر اخبار "نئی دنیا" میں کالم نگاری سے اپنی "صحافتی زندگی" کا آغاز کیا۔ "الہلال" میں بھی کالم لکھتے رہے۔ پھر لاہور آ گئے۔ یہاں آکر مختلف اخباروں "زمیندار"، "احسان" اور "شہباز" وغیرہ میں کام کیا۔ "سند باد جہازی" کے نام سے مزاحیہ کالم لکھ کر شہرت حاصل کی۔ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں فوج سے بھی منسلک رہے۔ قیام پاکستان کے بعد "روزنامہ امروز" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

چراغ حسن حسرت بنیادی طور پر اخبار نویس تھے۔ ان کی فکاہیہ کالم نگاری نے اخبار نویسی میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ ان کے کالموں کے مجموعے "فکاہیات" اور "حرف و حکایات" کے نام سے شائع ہوئے۔ دیگر اہم کتابوں میں "کیلے کا چھلکا" اور "جدید جغرافیہ پنجاب" مشہور ہوئیں۔ انھوں نے اہم اور مشہور شخصیات کے خاکے بھی لکھے۔ یہ خاکے مرقع نگاری کے خوبصورت نمونے ہیں اور ہمارے سامنے ان شخصیات کو منفرد انداز اور نمایاں خصوصیات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

حسرت کی زبان شگفتہ، رواں اور سلیس ہے۔ صحافتی زندگی اور کالم نگاری کی بدولت ان کو زبان کے مزاج کا اندازہ اور الفاظ و تراکیب کے استعمال کا خاص ملکہ ہے۔ اپنی اسی مہارت کو وہ اپنی عبارت میں مزاح اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اپنی موضوع شخصیات کے ساتھ گہری وابستگی اور انسانی ہمدردی بھی ہے جس کی وجہ سے وہ ان کو ایسی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ان کے مزاح میں طنز کی تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ زیر نظر خاکہ اس کی ایک مثال ہے۔

ظفر علی خاں

اب سے کئی سال ادھر کا ذکر ہے۔ کہ میں اخبار "نئی دنیا" کلکتہ کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے آکے کہا کہ "جمیندار صاحب" آئے ہیں۔ میں لنگی باندھے بیٹھا تھا۔ سر کے بال پریشان۔ داڑھی کئی دن کی بڑھی ہوئی۔ جمیندار صاحب کا نام سنتے ہی ہڑبڑا کے اٹھا۔ پوچھا کون جمیندار صاحب، وہ بے چارہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ مولانا شائق احمد عثمانی آئے اور کہنے لگے "بھئی مولانا ظفر علی خاں آئے ہیں۔" چچا صدیق انصاری نے جو اپنے گدیلے پر بیٹھے پانوں کی

جگالی فرما رہے تھے 'انگڑائی لی اور نیم باز آنکھوں سے ... ادھرادھر دیکھ کر ایک اور گلوری کلے میں دبالی۔ ان دنوں "نئی دنیا" کا دفتر چونا گلی میں ہوا کرتا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ باہر ایک طرف عصرِ جدید پریس - دوسری طرف حکیم غلام مصطفیٰ کا مُطب۔ دروازے سے اندر گھسو تو دہنی طرف نئی دنیا آباد تھی۔ اور بائیں طرف مولانا شائق احمد عثمانی نے اپنی پرانی دنیا بسا رکھی تھی۔ یعنی اپنے اہل و عیال اور عربی کی بھاری بھرکم کتابوں سمیت رہتے تھے۔ میں اس نئی دنیا کا کولمبس تھا اور مقالہ افتتاحیہ کے جہاز کے ساتھ ساتھ فکاہات کی کشتی بھی چلاتا تھا۔ افسوس یہ کہ یہ محفل سال بھر کے اندر اندر برہم ہوگئی۔ نہ نئی دنیا رہی نہ پرانی دنیا۔ رہے نام اللہ کا۔

تھوڑی دیر میں مولانا ظفر علی خاں کھٹ کھٹ کرتے تشریف لے آئے۔ میں نے انھیں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تصویریں ضرور دیکھی تھیں۔ لیکن تصویروں سے کسی شخص کی صورت شکل کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال اتنا تو یقین تھا کہ ان کی توند ضرور بڑھی ہوئی ہو گی۔ آخر جب معمولی قومی کارکنوں کا قبہ شکم گنبدِ فلک سے ہم سری کرتا ہے' تو مولانا ظفر علی خاں کو' جنھیں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت حاصل ہے 'ایک عدد گرانڈیل توند کا مالک ہونا چاہیے۔ لیکن انھیں دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ نہ توند نہ عمامہ 'آخر یہ کیسے مولانا اور کیسے لیڈر ہیں! یہ راز لاہور آ کے کھلا کہ مولانا توند سے کیوں محروم رہے؟

غرض مولانا تشریف لائے اور آتے ہی سائمن کمیشن ہندوستان کی جدید اصلاحات' راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور کامل آزادی کا قصہ چھیڑ دیا۔ مولانا شائق احمد عثمانی ان دنوں کانگریس سے باغی ہو چکے تھے۔ اور سائمن کمیشن سے تعاون کے حامی تھے۔ ان سے اس مسئلہ پر بحثیں رہتی تھیں۔ اب مولانا نے یہ حکایت شروع کی تو پھر یہ بحث چھڑ گئی۔ لیکن دراصل مجھے اس بحث سے چنداں دل چسپی نہ تھی۔

مولانا کے نزدیک آئینی کمیشن کا ہندوستان آنا بہت اہم واقعہ تھا۔ اور ہمارے نزدیک مولانا ظفر علی خاں کا کلکتہ تشریف لانا بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اب کھینچا تانی شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا مولانا شعر و شاعری کی طرف آئیں اور مولانا ہم سب کو سیاست کی طرف کھینچے لیے جاتے تھے۔ میں نے غالب کا نام لیا۔ انھوں نے برکن ہیڈ کا ذکر شروع کر دیا۔ میں نے اقبال کی رجائیت کی داستان چھیڑ دی۔ مولانا نے اقبال سے سائمن کمیشن اور سائمن کمیشن سے ٹوڈیٹ کی طرف گریز کی۔ اور ہندوستان کے ٹوڈیوں کی فہرست ایک سانس میں بیان کر گئے۔ بس اب یہ کیفیت تھی کہ میں انھیں میر کی طرف لاتا ہوں اور وہ مجھے بالڈون کی طرف لیے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مومن۔

وہ فرماتے ہیں سائن۔ غرض دیر تک یہی جھگڑا رہا۔ آخر مولانا کو فتح ہوئی۔ یعنی ہم نے مجبوراً شعرو ادب کا پنڈ چھوڑا اور خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگے۔

میں لاہور آیا تو کچھ دنوں "زمیندار" کے دفتر میں ہی قیام رہا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ کسی نے پچھلے پہر میرا شانہ ہلایا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ لیکن ابھی صبح کاذب تھی۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی شخص میرے سرھانے کھڑا ہے۔ میں گھبرایا کہ الٰہی یہ کیاماجرا ہے؟ اتنے میں مولانا کی آواز آئی کہ اٹھو میرے ساتھ سیر کو چلو۔ میں سمجھ گیا مولانا سیر کو جارہے ہیں اور مجھے شرفِ رفاقت بخشنا چاہتے ہیں۔ لیکن خدا بھلا کرے قاضی احسان اللہ مرحوم کا' انھوں نے مجھے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ اگر مولانا تمھیں اپنے ساتھ سیر کو لے جانا چاہیں تو ہرگز نہ جائیو۔ میں نے پوچھا یہ کیوں؟ کہنے لگے وہ تو پچھلے پہر اٹھ کر نہر کے کنارے میلوں دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ڈنٹر پیلتے ہیں۔ تم ساتھ گئے تو تمھیں بھی دوڑائیں گے اور جب تم نڈھال ہو جاؤ گے تو اپنے ساتھ نماز پڑھائیں گے۔ اب جو مولانا نے ساتھ چلنے کو کہا تو قاضی صاحب کی نصیحت یاد آگئی اور آنکھوں سامنے موت کا نقشہ پھر گیا۔ میں نے نہایت مضمحل آواز میں کہا کہ "مولانا میں تو سخت بیمار ہوں۔ رات بخار ہو گیا تھا' اب سر میں سخت درد ہے۔ پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے۔ غالباً قولنج ہے۔ مجھے پہلے بھی یہ مرض ہو چکا ہے ... ہائے اللہ۔" یہ کہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ مولانا نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کی' علاج کے متعلق چند معقول مشورے دیے اور تشریف لے گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جی میں تہیہ کر لیا کہ اب دفتر میں نہیں رہوں گا۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ مولانا توند سے کیوں محروم ہیں؟

آگے چل کر معلوم ہوا کہ انھیں صرف دوڑنے اور ڈنٹر پیلنے کا ہی شوق نہیں' مگدر بھی ہلاتے ہیں۔ نیزہ بازی اور شہسواری میں بھی برق ہیں۔ پیراکی اور کشتی گیری میں بھی بند نہیں۔ نشانہ بہت اچھا لگاتے ہیں۔ حیدر آباد کی ملازمت کے دنوں میں کچھ دن فوج میں بھی رہے۔ یہ قصہ عجیب ہے۔ سپاہی نیزہ بازی کے کرتب دکھا رہے تھے۔ ان کی بھی طبیعت لہرائی' گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ تانا اور آن کی آن میں میخ اکھاڑ لی۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور ان کی خدمات فوج کے صیغہ میں منتقل کر دی گئیں۔ لیکن افسر الملک سے نباہ نہ ہو سکا۔ اس لیے استعفا دے دیا۔

وہ جو راقم الحروف نے اپنی ایک جہازی غزل میں لکھا تھا کہ

حقّہ پیتا ہے، شعر کہتا ہے
اور عاشق میں کیا برائی ہے

تو وہ دراصل مولانا ظفر علی خاں کے ہی متعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ مولانا حقے کے بڑے رسیا ہیں۔ جب شعر کہتے ہیں تو حقہ ضرور پیتے ہیں اور حقہ پیتے ہیں تو شعر ضرور کہتے ہیں۔ ان کے شعر کہنے کا انداز یہ ہے کہ حقہ بھروا لیا اور شعر کہنے بیٹھ گئے۔ طبیعت کی روانی کا یہ حال کہ کبھی کبھی فی کش ایک شعر کے حساب سے کہتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی خود لکھتے ہیں کبھی کسی کو لکھوا دیتے ہیں۔ اس وقت ان کا انگوٹھا انگشتِ شہادت پر نیم دائرہ سا بناتا ہوا گھومتا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ فیضی چتوڑ کے محاصرے کے زمانے میں پہلی مرتبہ اکبر کے سامنے پیش ہوا تو پچاس ساٹھ شعر کا قصیدہ ارتجالاً کہُ ڈالا۔ لیکن ہم نے ایسے معرکے بارہا دیکھے ہیں۔ کہ باتوں باتوں میں پندرہ بیس شعر ہو گئے۔ ادھر حقہ کی نے منہ میں آئی۔ ادھر انگوٹھا انگشتِ شہادت پر پہنچا۔ پیشانی پر بل پڑے۔ دھواں ہوا میں منتشر ہوا۔ اور کھٹ سے شعر سامنے آگیا۔ اب بندش پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے۔ ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں۔

مولانا صاحب جب تک دفتر میں رہتے تھے، بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ نظم لکھی اور پکار کر کہا کہ بلاؤ قاضی کو، بلاؤ اختر کو، کہاں ہے زاہدی۔ کہاں ہے حسرت؟ سب جمع ہوئے اور مولانا نے نظم پڑھ کر سنائی۔ پھر انھیں نت نئی تجویزیں سوجھتی رہتی تھیں۔ جو دو تین دن کے چرچے میں غائب غلہ ہو جاتی تھیں۔ ہم میں سے کوئی اچھا شعر کہتا یا کوئی اچھا مضمون لکھتا تو تعریف کر کے دل بڑھاتے اور انعام بھی دیتے۔ ایک مرتبہ راقم نے فکاہات لکھے۔ بہت خوش ہوئے۔ بٹوا نکال کر دے دیا اور کہنے لگے "اس میں جو کچھ ہے لے لو۔" لیکن اکثر لوگ پھر بھی دعائیں مانگتے رہتے تھے کہ اللہ کرے مولانا کہیں دورے پر چلے جائیں۔ اور عموماً یہ دعائیں قبول بھی ہوتی تھیں۔

اصل میں مولانا کو اخبار کی زبان اور کتابت کی صحت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ کاتبوں کی جان الگ آفت میں، ایڈیٹر الگ مصیبت میں مبتلا۔ جب تک مولانا دفتر میں ہیں غل غپاڑا مچا ہوا ہے۔ جوں ہی کاپی پر نظر پڑی، شور مچ گیا "ارے یہ کیا کیا؟ یہ عبارت تو بالکل مہمل ہے۔ اس مراسلہ کی تصحیح نہیں ہوئی۔ یوں ہی کاتب کو دے دیا گیا ہے۔ خبروں کی عبارت چست نہیں، کتابت کی غلطیاں تو دیکھو ایک ایک کالم میں پچاس پچاس غلطیاں۔ اور کتابت کیسی عجیب ہوئی ہے۔ کوئی دائرہ بھی تو

صحیح نہیں۔ غضب خدا کا قرآن کی آیت غلط لکھ دی۔ اتنا خیال نہ آیا کہ کلامِ الٰہی ہے۔ ستیاناس کر دیا اخبار کا۔ ان تمام کاپیوں کو جلا دو' از سرِ نو اخبار مرتب کرو۔ کیا کہا؟ اب اخبار مرتب نہیں ہو سکتا۔ اعلان کر دو کہ کل اخبار نہیں نکلے گا۔ بلاؤ اختر کو۔ اختر! اختر کہاں ہے؟ کہاں ہے قاضی؟ بند کر دو جی اخبار کو۔ بند کر دو۔ میں یوں اخبار نہیں نکالنا چاہتا۔"

مولانا ہاتھ کے سخی ہیں اور دل کے نرم۔ جو لوگ ان کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں وہ بآسانی انھیں اپنے ڈھب پر لے آتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مولانا کو خیال ہوا کہ جیش رضاکارانِ اسلام کا مرتب ہونا چاہیے۔ ادھر ادھر سے کچھ نوجوان جمع ہوئے' انھوں نے کئی دن پلاؤ قورمے پر ہتھے مارے' نقد روپے بھی وصول کیے اور دفتر کے لیے ایک مکان کرایہ پر بھی لیا گیا۔ اب تقاضا ہوا کہ فرنیچر دلوائیے۔ چنانچہ مولانا نے اپنے ہاں سے چار پانچ کرسیاں اور ایک دری بھجوا دی۔ چند دن اس دفتر میں اچھی خاصی رونق رہی۔ جلسوں میں زندہ باد کے نعرے بھی لگتے رہے۔ پھر یہ لوگ ایسے غائب ہوئے کہ کئی دن ان کا سراغ نہ لگا۔ دفتر پہنچ کر دیکھا تو خاک اڑتی پائی۔ نہ کرسیاں' نہ میز' نہ دری۔ ہاں آموں کی گٹھلیاں اور تاش کے پتے ضرور فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کی سیرت چند لفظوں میں بیان کرنا ہو تو یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہاتھ کے سخی' دل کے نرم' کان کے کچے اور دھن کے پکے ہیں۔ جس طرف جھک پڑے' جھک پڑے۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ موقع محل کا کیا ذکر؟ گھر کے اندر یا باہر' سیاسی صحبتوں یا ادبی محفلوں میں' دلی دروازے کے جلسوں میں یا "زمیندار" کے صفحات پر' نثر میں یا نظم میں' تقریر میں یا گفتگو میں بس ایک ہی رٹ لگی ہے۔ آپ کچھ کہے جائیے۔ ادھر سے ایک ہی جواب ملے گا۔ آپ کی یا ہماری دلیل بازی بے کار ہے۔ کیونکہ آندھی بر وزن گاندھی اسی کا نام ہے۔

مولانا کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا ہے' شعرا آتے ہیں' غزلیں پڑھتے ہیں۔ جب سب اپنا اپنا کلام سنا چکتے ہیں' پہلے شاعروں کو ڈانٹ بتاتے ہیں پھر شاعری کی شامت آجاتی ہے۔ کچھ نظم' کچھ نثر' کبھی ترنم سے کبھی تحت اللفظ۔ آخر سیاسیات پر تان ٹوٹتی ہے۔ ہندوستان کے اجلاس کی شکایت' مسلمانوں کی زبوں حالی کا گلہ' قادیانی جماعت' ہندو مسلم اتحاد' برطانوی استعمار ... غرض چند لمحوں میں مشاعرہ دلی دروازے کا جلسہ بن کر رہ جاتا ہے۔

غالب کی شاعری' دکن میں اردو' قطب شمالی کی مہم' نظریہ اضافت' چغتائی کی مصوری' شاہ دولہ کے چوہے' آم' آلو کا بھرتا' ٹماٹر' غرض دنیا بھر کا کوئی موضوع ہو' مولانا ظفر علی خاں دو

تین جھٹکوں میں اسے اس طرح اپنے ڈھب پر لے آتے ہیں کہ لوگ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ "آم شاہ پسند پھل ہے۔ بابر نے تزک میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔ بابر بھی عجیب و غریب انسان تھا۔ بارہ ہزار ترک اور مغل لے کر آیا اور ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ افسوس کہ آج مسلمانوں میں بابر جیسے جواں مرد پیدا نہیں ہوتے۔ ایک طرف ہندو ہے 'ایک طرف انگریز ہے ... "غالب کا کیا کہنا ہے۔ غالب عَلٰی کُلِّ غَالِب۔ لیکن زمانے کی ناقدر شناسی نے اسے انگریزوں کی قصیدہ نگاری پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی اسے ہم ٹوڈی نہیں کہہ سکتے۔ ٹوڈی تو یہ لوگ ہیں جو .....

غرض مولانا کو جو کچھ "زمیندار" کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھنا ہے۔ جلوت 'خلوت میں وہی کہنا ہے۔ آپ ہزار کہیے کہ ان باتوں کو موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کب مانتے ہیں۔ دراصل جن لوگوں کو کسی کام کی دھن ہوتی ہے 'وہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا ظفر علی خاں اس معاملے میں دوسروں سے کسی قدر آگے ہیں۔

مولانا کی مستقل تصانیف ان کے ادبی پایہ سے بہت فروتر نظر آتی ہیں۔ جنگل میں منگل 'سیر ظلمات 'سنہری گھونگا وغیرہ تو خیر پھر غنیمت ہیں 'افسوس تو یہ ہے کہ انھوں نے مسٹریز آف لندن کا ترجمہ کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیا۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے تراجم کا ذکر آیا۔ کہنے لگے "ظفر علی خاں نے جتنا وقت مسٹریز آف لندن کے ترجمہ پر صَرف کیا، اے کاش! کسی علمی کتاب کے ترجمے پر صرف ہوتا۔ "معرکہ مذہب و سائنس" البتہ کام کی چیز ہے۔ "سورۂ روم" کی تفسیر بھی اچھی لکھی ہے۔ اسکاٹ کی تاریخ اندلس کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا جو ادھورا ہی رہ گیا۔ ڈراما روس و جاپان۔ ڈراما کی حیثیت سے شاید زیادہ اہم نہ ہو' البتہ ان کی قادر الکلامی کا اچھا نمونہ ہے۔"

بایں ہمہ مولانا ظفر علی خاں اس دور میں بہت غنیمت ہیں۔ اور آج جو لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں 'کل وہی انھیں یاد کر کے روئیں گے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(مردم دیدہ)

سوالات

۱۔ مولانا ظفر علی خاں کا اس خاکے کے مطابق شعر گوئی کا انداز بیان کریں۔

۲۔ مولانا ہاتھ کے سخی اور دل کے نرم تھے، کوئی واقعہ بیان کریں۔

۳۔ کیا مولانا اپنی دُھن کے پکے تھے، کیسے؟

۴۔ چراغ حسن حسرت کے پیش کردہ خاکے کو پڑھ کر مولانا ظفر علی خاں کا جو کردار آپ کے ذہن میں ابھرتا ہے، اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

—— ○○○ ——
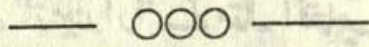
طنز و مزاح

طنز و مزاح اردو ادب کی قسم نہیں ہے بلکہ ادب کے دو رنگ ہیں جو نظم و نثر دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ کبھی ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں اور کبھی الگ الگ اور دونوں میں معنیٰ کے لحاظ سے فرق ہے۔

انسانی زندگی اعلیٰ معیاروں، معاشرتی تقاضوں، رسومات، روایات اور انسانی خواہشات و ضروریات کے ساتھ ساتھ انسانی کمزوریوں، کوتاہیوں، مغالطوں اور کج فہمیوں سے عبارت ہے جب مصنفین ان انسانی تضادات، کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں تو ان کے تضاد سے طنز و مزاح پیدا ہوتا ہے۔

طنز میں کلام کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ظاہر میں خوشنما لیکن باطن میں تلخ۔ جس پر طنز کیا جاتا ہے اس کے لیے یہ تلخی زہر ہوتی ہے لیکن دوسروں کے لیے اس کا ظاہر دلفریب ہوتا ہے اس کے برعکس مزاح یا ظرافت ہنسانے والی بات کو کہتے ہیں۔

جہاں تک طنز کا تعلق ہے، وہ معاشرے کی ناہمواریوں اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ لیکن طنز چونکہ تلخ ہوتا ہے اس لیے اس میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے طنز نگار مزاح کا سہارا لیتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے لیے طنز قابلِ مطالعہ بن سکے اور ساتھ ہی ساتھ ان زیادتیوں کی نشاندہی بھی ہو جائے جو کسی فرد یا کسی معاشرے پر کی جا رہی ہیں۔ گویا مزاح خالص مزاح بھی ہے اور دوسری طرف یہ طنز کو شوگر کوٹ بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصطلاحِ عام میں "طنز و مزاح" ادب کی ایک ہی صنف تصور کی جاتی ہے جب کہ یہ دونوں ادب کے دو مختلف مزاج ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ جب یہ دونوں ملا کر پیش کیے جاتے ہیں تو بیان زیادہ پر اثر اور دلنشین بن جاتا ہے۔ مزاح میں طنز اور طنز میں مزاح خود بخود پیدا ہوتا ہے لیکن اچھے طنز نگار اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کی تخالیق میں مزاح طنز پر حاوی رہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھتے ہیں کہ مزاح میں طنز گم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وہ مقصد جو تخلیق میں پوشیدہ ہے پورا ہو جائے۔ اسی طرح مزاح نگار فطری انداز میں طنز کا سہارا ضرور لیتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں طنز، مزاح کو زیادہ پر اثر اور دل چسپ بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ مزاح نگاروں کا مقصد صرف پڑھنے والوں کو ہنسانا ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے طنز و مزاح ادب کی مشکل صنف ہے اور اس میں لکھنے والے کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔

اردو ادب میں مزاح کا رواج سودا سے شروع ہوا لیکن وہ ہجو یہ صورت میں تھا۔ جب کسی سے ناخوش ہوتے تو اس کی ہجو لکھتے اور اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کر لیتے۔ دوسرے لوگ ان کی ہجو سن کر خوش ہوتے لیکن جو شخص ان کی ہجو کا نشانہ بنتا تھا اس کے لیے وہ زہریلے تیر ہوتے تھے۔

سودا کے بعد ظرافت کا رنگ میر انشا کی شاعری میں ملتا ہے لیکن ان کی ظرافت بھی ہجو میں محصور ہے۔ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی ہجویں لکھیں۔ مصحفی سے نوک جھوک رہی تو ان کی ہجو میں غزلیں لکھ ڈالیں۔

طنز و مزاح کی صحت مند اور خوشگوار روایت کا آغاز مرزا غالب سے ہوتا ہے۔ غالب کی شخصیت کی عظمت تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کے اداس ترین اور تاریک ادوار میں بھی اپنے دل کو مرنے نہیں دیا بلکہ اسے ہر حال میں زندہ رکھا' اس زندہ دلی کی بدولت ان کی شوخی اور ظرافت بھی مرتے دم تک زندہ رہی اور وہ محفلوں کی جان رہے' ان کے خطوط میں بھی مزاح کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔

غالب کے یہاں خواہ' وہ نظم ہو یا نثر' شوخی اور ظرافت کے بے شمار نمونے ملتے ہیں لیکن وہ طنز کریں یا مزاح سے کام لیں' ان کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنے آپ کو اور دوسروں کو خوش رکھنا ہوتا ہے۔ وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے مزاح کا ایک معیار مقرر کیا اور آنے والے ادیبوں کو فکر کی ایک نئی راہ دکھائی۔ معیاری اور ادبی طنز و مزاح کی صنف نے ان کے خطوط سے تحریک پائی اور یوں یہ صنفِ ادب پروان چڑھی۔

غالب کے بعد مزاحیہ نگاری اور ظرافت نے "اودھ پنچ" سے فروغ پایا جو ۱۸۷۷ء سے شروع ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے اور ان کے ساتھیوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار' مرزا مچھو بیگ ستم ظریف' پنڈت تربھون ناتھ ہجر' نواب سید محمد آزاد' مولوی عبدالغفور شہباز' منشی جوالا پرشاد برق' منشی احمد علی شوق' اکبرالہ آبادی اور مولوی احمد علی کسمنڈوی وغیرہ تھے۔ منشی سجاد حسین اس کاروانِ ظرافت کے سربراہ تھے۔ ان تمام حضرات کی ظرافت کا ایک ہی مقصد تھا کہ یہ سب لوگ معاشرے اور قوم کی اصلاح چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے وعظ و پند کے خشک اور غیر مؤثر طریقے کو چھوڑ کر طنز و مزاح کا رنگ اختیار کیا۔ ان کے طنز و مزاح کا مخاطب اگر افراد بھی ہوتے تو اس میں شخصی جذبہ کام نہیں کرتا بلکہ صرف اصولی اختلاف ہوتے ہیں۔

"اودھ اخبار" نے اردو ادب میں طنز و مزاح کو خصوصیت کے ساتھ بہت فروغ دیا۔ نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ میدان میں آئی اور یوں اس صنفِ ادب کے دامن کو وسعت اور کشادگی نصیب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادیبوں میں یہ رجحان بھی پیدا ہوا کہ مغربی مزاح نگاروں کو بھی پڑھا جائے کیونکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ خوشحال اقوام میں مزاح زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس خصوصی مطالعے کی بنا پر مزاح اور طنز دونوں میں نئے نئے اسالیب ہمارے سامنے آئے اور رفتہ رفتہ اردو ادب میں رائج ہوتے چلے گئے۔

"اودھ پنچ" کے دَور کے بعد جو مزاح نگار خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں ان میں فرحت اللہ بیگ' پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی شامل ہیں اور انھیں اردو مزاح نگاری میں سند کا درجہ حاصل ہے۔

ان کے مضامین کے مجموعے "مضامینِ فرحت"، "مضامینِ پطرس" اور "مضامینِ رشید" کے ناموں سے شائع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے۔

ان کے بعد عظیم بیگ چغتائی کا "کولتار" اور "شوہر بیوی"، شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" اور امتیاز علی تاج کی کتاب "چچا چھکن" نے مقبولیت حاصل کی۔ لیکن یہاں یہ مراد نہیں لینا چاہیے کہ طنز و مزاح صرف نثر تک محدود ہو کر رہ گیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ادب کے یہ دونوں رنگ شاعری میں بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے اور آج بھی چل رہے ہیں۔

دورِ حاضر میں طنز و مزاح نے بہت ترقی کی ہے اور بے شمار ادیب اور شاعر اس صنفِ ادب میں مستند حیثیت رکھتے ہیں جن میں ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، ابراہیم جلیس، سید ضمیر جعفری کے نام نمایاں ہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان ہنسنے اور قہقہہ لگانے کے لیے ہمہ وقت بے چین رہتا ہے اور اس میں امیر یا غریب کی تخصیص نہیں ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس کی یہ فطرت بھی زندہ ہے، بقول ضمیر جعفری:

غم نے کب آدمی کو چھوڑا ہے
خوب ہنس لو کہ وقت تھوڑا ہے

چنانچہ اس بات کو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے پیچ در پیچ مسائل اور لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی الجھنوں میں آگے چل کر یہی صنفِ ادب سب سے زیادہ مقبولِ عام ہو گی کیونکہ تھکے ہوئے اور اداس ذہنوں کو خوشی بخشنے کا یہی سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

احمد شاہ پطرس بخاری

(۱۸۹۸ء - ۱۹۵۸ء)

پشاور میں پیدا ہوئے، سید احمد شاہ نام تھا۔ "پطرس" قلمی نام اختیار کیا۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں پائی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی (انگلینڈ) سے آنرز کیا۔ وطن واپس آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں جب آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آیا تو اس میں شامل ہو کر دہلی چلے گئے اور مدت تک اس کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ قیام پاکستان پر لاہور آگئے اور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باعث بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب مقرر ہوئے، ۱۹۵۰ء میں اقوامِ متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے جہاں وہ اپنی وفات تک کام کرتے رہے۔

پطرس بخاری کو اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع، ذہن رسا، اور شخصیت متاثر کن تھی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "مضامینِ پطرس" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ گو یہ مختصر ہے لیکن اپنے معیار اور زبان و بیان کے لحاظ سے اسے اردو کے مزاحیہ ادب میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

پطرس کی تحریریں، ان کی شگفتہ شخصیت، وسیع مطالعے، اور عالمی ادب خصوصاً انگریزی ادب سے گہری شناسائی کی عکاس ہیں۔ ان کے مزاح سے لطافت، خوش طبعی اور اعلیٰ ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنی شگفتہ، رواں، بامعنی زبان اور پہلو دار اندازِ بیان میں ہماری روزمرہ کی کوتاہیوں، دلچسپیوں اور حماقتوں کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے مزاح میں طنز کی تلخی نہیں ہوتی اور ان کی تحریر پڑھنے سے ہر بار نئے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

"اخبار میں ضرورت ہے"

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہاروں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لیے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ورنہ شاید آپ پہچان نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ غالباً آپ کی نظر سے گزرا ہو گا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا۔ آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھتے تھے، ہمارا

مطلب کچھ اور تھا۔ مختصر اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا' یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں' تو تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔

اس کے بعد یا تو وہ خود ناشائستہ باتیں ہمارے بار میں کہہ کر چائے والے کا بل ادا کیے بغیر چل دیے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکالا اور وہ باہر کھڑے نعرہ لگایا کیے۔ جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈ[1] ہی کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے۔ اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے۔ جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لیے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو۔ ایک نوجوان کو شروع میں ہم نے ترجمہ کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا۔ بپھر کر بولے کہ مترجم ہوں' سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے کو ترجمے کے لیے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں مترجم نہیں ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ ناتجربہ کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں ہے۔ ہم سے بکنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کیے۔ اس لیے ہم واضح کیے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ اور اس کے لیے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انھیں تو وقتاً" فوقتاً" ساتھ کی دکان سے پان بھی لانا پڑیں گے' اور اگر انھیں بحث کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہے دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنیٰ یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں۔ لہٰذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش

---

[1] Lead

نہ فرمائے۔ پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو واضح کر دیا جائے۔ اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے' جو مرد ہوں۔ پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنٰی شاید جواں مرد سمجھیں۔ اور اہلِ قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان' نیشنل گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رخ کریں۔ بعد میں یہ خیال بھی تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی۔ مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے۔ لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔ پرزے پر نام لکھ کر بھیجا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے بلواتے ہی کیوں ؟ لیکن آج کل کم بخت نام سے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ ' زبیدہ ' عائشہ کچھ ایسا نام ہوتا تو میں غسل خانے کے راستے باہر نکل جاتا۔ لیکن وہاں تو ناز جھانجھروی ' عندلیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں۔ غلام رسول ' احمد دین ' مولاداد ایسے لوگ تو ناپید ہو گئے ہیں۔ جسے دیکھیے نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے۔ اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا ہے کہ حرارت غریزی ' نزلہ کھانسی ' ثعلب مصری ' ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں۔ عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا عورت ہے۔ دیکھا کے یہ معنٰی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسنِ ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے۔ ہم نے بعد عزت و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھیں گے۔ انھوں نے وجہ پوچھی۔ ہم نے کہا کہ پیچید گیاں۔ کہنے لگیں ' آگے بولیے۔ ہم نے کہا پیدا ہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں ' اس لیے ہم تائید و تردید نہ کر سکے۔ میری ولادت کو انھوں نے تکیہ کلام بنا لیا۔ بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اور بہرحال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق ؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں گی تو وہ آپ کی اور میری' ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریے بیان کریں گے کہ آپ ہکّا بکّا رہ جائیں۔ خدا خدا کر کے پیچھا چھٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدّم ہے۔ وہ شہر کے ایک معزز ڈپو ہولڈر ہیں۔ اخبار انھوں نے محض خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے لیے جاری کیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے۔ چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ ' ان کے ماموں کا انتقال ' ان کے صاحبزادے کی میٹریکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز ان معنٰی میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہو گئے) ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ' ہر سب

ایڈیٹر کا فرض ہو گا۔ ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خور و نوش کا انتظام بھی ہو' ہمارے پروپرائٹر مع اپنے چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی عمر پانچ سال ہے' شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے۔ اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو زیرِ لب فقرے کسنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں۔ اور حالاتِ حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سردار ابراہیم اسے گود میں لیے لیے پھرے' تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے

پیشانی پر یہ جملہ مندرج ہے کہ "آسمان بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے۔" اس فقرے کو ہٹانے کی کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ کرے' کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے۔ ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرع کا اخبار سے کیا تعلق؟ کہنے لگے اخبار کا نام "آسمان" ہے۔ اور اس مصرع میں بھی آسمان آتا ہے۔ ہم نے کہا بجا' لیکن خاص اس مصرع میں کیا خوبی ہے؟ کہنے لگے 'علامہ اقبال' کا مصرع ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے۔ اس پر ہم چپ ہو گئے۔ پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے۔ یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے۔ اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔ کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے۔ ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ ضرور لکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں۔ ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے؟ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے؟ ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں۔ مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے پریذیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی۔ لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں۔ اس لیے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈی گھیپ کے ہیڈ ماسٹر کو موسمِ سرما سے پہلے پہلے یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کرایا جائے۔ (ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ

موسم سرما میں شادی کر دی جائے)

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرزِ عمل ہے اور سب ایڈیٹر کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں، معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ہوائی جہاز اڑتا نہیں محوِ پرواز ہوتا ہے۔ مترجم کو اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انھیں کہنا چاہیے تھا کہ موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا، جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں سپیشل قسم کی ایک ٹکیہ لٹکائی جائے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہو گا۔ ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بِلّا ہونا چاہیے۔ حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں۔ اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ فی الحال یہ پروپرائٹر اور ان کے اہلِ خانہ کے کام آتے ہیں۔ لیکن عنقریب اس بارے میں سینما ہالوں سے ایک نیا سمجھوتا ہونے والا ہے۔ اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کر لے تو وہ اس کا اپنا حق ہے۔ لیکن اس کے بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جو اشیا ریویو کے لیے آتی ہیں مثلاً! بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ۔ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہو گا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو۔ اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لیے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہو گا۔ ہمارے پروپرائٹر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اسٹاف بہت بڑھ رہا ہے، بہت بڑھ رہا ہے۔

اور اسی وجہ سے انھوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے۔ عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ وہ اصولاً" اسٹاف بڑھانے کے

خلاف ہیں۔ دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ اسٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے۔ یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات؟ کون سی بات؟

اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

(کلیاتِ پطرس)

سوالات

۱۔ پطرس بخاری کے مختصر احالات زندگی اور ان کی مزاح نگاری پر نوٹ لکھیے۔

۲۔ "اخبار میں ضرورت ہے" کے اشتہار میں امیدوار کو کن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے۔

۳۔ اس مضمون میں پطرس نے عورتوں اور مردوں کے جدید ناموں سے جس طرح مزاح پیدا کیا ہے اسے اپنے لفظوں میں لکھیں۔

—— ○○○ ——

مشتاق احمد یوسفی

(ولادت : ۱۹۲۳ء)

مشتاق احمد یوسفی ۱۹۲۳ء کو راجستھان کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست "ٹونک" کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مسلم راٹھور تھے۔ ان کے والد عبدالکریم خاں یوسفی نے جے پور شہر میں کاروبار شروع کیا' بعد ازاں جے پور میونسپل کمیٹی کے چیئرمین اور ریاستی اسمبلی کی حزب مخالف کے راہنما بھی رہے۔ بہت ہی مذہبی' سادہ دل' نیک منش انسان تھے۔ اسمبلی میں سقوطِ حیدر آباد کے بعد پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر ان کو ہجرت کر کے کراچی آنا پڑا۔

مشتاق احمد یوسفی نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور عربی' فارسی و دینیات کے علوم پڑھے۔ انٹرمیڈیٹ راجپوتانہ بورڈ سے درجہ اول میں پاس کیا۔ بی۔ اے آگرہ یونیورسٹی سے اول درجہ میں پاس کیا اور ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے فلسفہ کی ڈگری بھی درجہ اول میں حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں راجپوتانہ سول سروس میں شامل ہوئے اور ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے۔ پاکستان آنے کے بعد بطور مینجر مسلم کمرشل بنک اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے عہدے تک پہنچے۔

مشتاق احمد یوسفی کی اہم تصانیف میں چراغ تلے (۱۹۶۶ء)' زرگزشت (۱۹۷۶ء)' خاکم بدہن (۱۹۸۸ء) اور آبِ گم (۱۹۸۸ء) اہمیت رکھتی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں اگرچہ سلیقہ مندی' رکھ رکھاؤ اور عبارت کی تزئین و آرائش کا خصوصی اہتمام ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے جملے رواں' شگفتہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور ظاہری کوائف سے ایسے گہرے اور پوشیدہ معانی پیدا کرتے ہیں کہ وہ کسی مفکر کی بے ساختہ گفتگو کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر موضوعات ہماری روزمرہ زندگی اور معمولات سے لیے گئے ہیں لیکن وہ ان میں بھی مزاح کے انوکھے اور چونکا دینے والے گوشے تلاش کر لیتے ہیں لیکن اس مزاح کی بنیاد ایک اعلیٰ تہذیبی شعور اور مذاقِ سلیم پر استوار ہوتی ہے۔

کافی

میں نے سوال کیا "آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "آپ کیوں نہیں پیتے؟"

"مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔"

"اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوت شامہ کی کوتاہی ہے۔"

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً" میری ناک کی طرف تھا' تاہم رفع شر کی خاطر میں نے کہا "تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے بھینی بھینی مہک آتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔"

تڑپ کر بولے "صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا' تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو ـــــ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگارے رائتے میں ہوتا ہے۔"

میں نے معذرت کی "کُھرچن اور دھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔"

فرمایا "تعجب ہے! یو۔پی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"

"میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔"

چراندے ہو کر کہنے لگے "آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔"

جواباً" عرض کیا "گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ خیر' یہ تو جملہ معترضہ تھا' لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔"

جھلا کر بولے "آپ معصوم بچوں کو بحث میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟"

میں بھی الجھ گیا "آپ لوگ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ معصوم کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گنہگار بھی ہوتے ہیں؟ خیر' آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلی کو لیجیے۔"

"بلی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟" وہ سچ مچ مچلنے لگے۔

میں نے سمجھایا "بلی اس لیے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے' بچے اور بلیاں

برے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔"

ارشاد ہوا "کل کو آپ کہیں گے کہ چونکہ بچوں اور بلیوں کو پکے گانے پسند نہیں آ سکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔"

میں نے انھیں یقین دلایا "میں ہرگز یہ نہیں کہ سکتا۔ پکے راگ انھیں کی ایجاد ہیں۔"

"آپ نے بچوں کا رونا بلیوں کا لڑنا ...."

بات کاٹ کر بولے "بہرحال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔ ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہ کر چپ ہوگئے کہ

چُھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ مگر سچے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک کرم فرما نے میری بیزاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا:

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑ کی

اصل وجہ معدے کے وہ داغ¹ تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

استصواب رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تأثرات پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقے ہی کو لیجیے۔ معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ تمباکو خراب ہو تو تفکرات ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خور و نوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤ زبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفسِ امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہل ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کی جزوِ اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے "اللہ شافی، اللہ کافی" کہہ کر مؤخر الذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چونکہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہارِ خلوصِ باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہ ملتی بلکہ غلہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلومات عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر

۱۔ (Ulcers)

آسمان سے براہ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اگتا ہوگا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک اشلکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کافی نہایت مفرّح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے اپنی مثال دی کہ "ابھی کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی مزاج دان ہیں۔ فوراً کافی کا Tea Pot لاکر سامنے رکھ دیا۔"

میں ذرا چکرایا "پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں نے دودھ دان میں سے کریم نکالی" انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "شکر دان میں سے کیا نکلا؟"

فرمایا "شکر نکلی، اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟"

مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیاگری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق ہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پُر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظرِ حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا "بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا

ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔"

"لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوئی ہے۔"

"حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟ آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا "نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔"

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی گولیاں کھانے سے بے مزہ نہ ہوا!

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے' وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن دقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اِصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔ للہذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً" پوچھتے ہیں:

"ایک چمچہ یا دو؟"

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ "میرے لیے شکر دان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔"

صاف ہی کیوں نہ کہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خور و نوش کا تعلق ہے' میں تہذیبِ حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پتّا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں برسوں تلخیِ کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں' تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنا بریں' میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں' میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے' ان پر دوزخ اور حمیم حرام ہیں۔

کافی امریکہ کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا، یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ "غبارِ خاطر" چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے "غبارِ خاطر" کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کی خاطر یہ دلیل پیش کی، امریکہ میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ عرض کیا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے تو انسدادِ جرائم میں کافی مدد ملے گی۔ پھر انھوں نے بتلایا کہ وہاں لاعلاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے۔ کافی کے سریع التّاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دمِ نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا، مجھے تو اس تجویز پر بھی اعتراض نہ ہوگا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے، تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے پھونک کر پیتا ہے ۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چائے کے ارماں ہوں گے

(چراغ تلے)

سوالات

۱۔ مشتاق احمد یوسفی نے "کافی" میں جہاں جہاں رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا کیا ہے ان کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ کافی اور چائے کا جو موازنہ مصنف نے کیا ہے اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۳۔ مصنف کے خیال میں کافی پینے کے بعد جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسے بیان کیجیے۔

○○○

ابنِ انشا

(۱۹۲۷ء - ۱۹۷۸ء)

ابن انشا کا اصل نام شیر محمد تھا۔ مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کی تحصیل پھلور کے ایک گاؤں "تھلہ" میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام منشی خاں تھا' جو کھوکھر برادری سے تعلق رکھتے تھے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں اور نواحی قصبات کے سکولوں میں حاصل کی اور لدھیانہ سے میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ملازمت کی ابتدا ملٹری اکاؤنٹس میں ایک معمولی اسامی سے کی۔ لیکن پرائیویٹ طور پر تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۶ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی وہ ہجرت کر کے لاہور آ گئے' اور ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں اپنی محنت اور کوشش سے ترقی کرتے ہوئے' پاکستان نیشنل بک سنٹر کے سربراہ اور یونیسکو کے پاکستان آفس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس ادارے سے وابستگی کی وجہ سے ان کو سفر کرنے اور دنیا گھومنے کے وافر مواقع میسر آئے جس کے نتیجے میں اردو سفرناموں میں نئے اور شگفتہ اضافے ہوئے۔ ان کے سفرناموں "چلتے ہو تو چین کو چلیے" اور "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" نے خاصی شہرت حاصل کی۔

ابنِ انشا کو آغازِ عمر سے ہی شعروشاعری سے شغف تھا۔ ان کے شاعری کے مجموعوں میں "چاند نگر" '"اس بستی کے اِک کوچے میں" اور "دلِ وحشی" شامل ہیں۔

ابن انشا نے اپنی مصروف زندگی میں کالم نگاری بھی کی۔ سفرنامے بھی لکھے اور تراجم بھی کیے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی حس مزاح سے بھرپور شگفتہ اور رواں دواں نثر ہے۔ جس نے صحافیانہ تحریروں کو بھی بلند پایہ ادبی مرتبہ اور زندہ جاوید شان عطا کر دی ہے۔ ابنِ انشا کی اہم تصانیف میں "اردو کی آخری کتاب"' "خمارِ گندم"' "آوارہ گرد کی ڈائری" اور "دنیا گول ہے" شامل ہیں۔

ابن انشا کی زبان شگفتہ' رواں اور دلکش ہے۔ ان کی تحریروں میں مزاح ایک زیرِ زمین لہر کی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ مزاح ان کے منفرد نقطہ نظر اور زندگی کے وسیع تجربے پر مبنی ہے۔ وہ زندگی کے تضادات' ان کی کوتاہیوں' معاشی و معاشرتی بے آہنگیوں کو اس انداز میں سامنے لاتے ہیں کہ قاری کو استعجاب انگیز مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کے چناؤ اور تراکیب کی بندش میں ذرا سی تبدیلی سے موضوع میں ایک نیا پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور اپنی تحریر کی دلکشی اور دلآویزی سے قاری کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔

زیرِ نظر اقتباس ان کی کتاب "اردو کی آخری کتاب" سے لیا گیا ہے۔

چند مناظرِ قدرت

آسمان

ذرا نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو' کتنا اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اس سے گرے تو بہت چوٹ آتی ہے۔ بعض لوگ آسمان سے گرتے ہیں تو کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔ نہ نیچے اتر سکتے ہیں' نہ دوبارہ آسمان پر چڑھ سکتے ہیں۔ وہیں بیٹھے کھجوریں کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن کھجوریں بھی تو کہیں کہیں ہوتی ہیں۔ ہر جگہ نہیں ہوتیں۔

کہتے ہیں پہلے زمانے میں آسمان اتنا اونچا نہیں ہوتا تھا۔ غالب نام کا شاعر جو سو سال پہلے ہوا ہے۔ ایک جگہ کسی سے کہتا ہے ۔ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟ جوں جوں چیزوں کی قیمتیں اونچی ہوتی گئیں' آسمان ان سے باتیں کرنے کے لیے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اب نہ چیزوں کی قیمتیں نیچے آئیں نہ آسمان نیچے اترے۔

ایک زمانے میں آسمان پر صرف فرشتے رہا کرتے تھے۔ پھر ہما شما جانے لگے جو خود نہ جا سکتے تھے ان کا دماغ چلا جاتا تھا۔ یہ نیچے زمین پر دماغ کے بغیر ہی کام چلاتے تھے۔ بڑی حد تک اب بھی یہی صورت ہے۔

پیارے بچو! راہ چلتے میں آسمان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تاکہ ٹھوکر نہ لگے۔ جو زمین کی طرف دیکھ کر چلتا ہے اس کے ٹھوکر نہیں لگتی۔

ستارے اور ہلال وغیرہ

واہ وا کیا سہانا منظر ہے۔ ستارے یہاں سے وہاں تک چھٹکے ہوتے ہیں۔ ان کی کثرت سے گمان ہوتا ہے جیسے میٹرک کا ریزلٹ شائع ہوا ہو۔ ادھر ایک ہلال بھی جگمگا رہا ہے۔ آسمان کی رونق بڑھا رہا ہے۔

ستارے چمکتے دمکتے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ٹوٹ کر گر بھی جاتے ہیں۔ جب یہ مٹی میں مل جائیں تو کوئی نہیں پوچھتا۔ وہی ستارے جو دوسروں کی تقدیر کی خبر دیا کرتے ہیں' بلکہ لوگوں کی قسمت بنایا بگاڑا کرتے ہیں' کبھی کبھی خود دوسروں سے اپنی قسمت کا حال بچھواتے' جنتریاں کھلواتے نظر آتے ہیں۔ ہلال کا بھی ایسا احوال ہے۔ جب تک آسمان پر ہے' بس

ہے، آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل۔ ستارے اور ہلال اچھے ہیں لیکن عزت کی غریبانہ زندگی ان سے بہتر ہے۔

ہلال یعنی نئے چاند کو پرانے لوگ دور ہی سے دیکھا کرتے تھے اور سلام کیا کرتے تھے، وہ بھی عید بقرعید پر۔ اس زمانے میں یہ چپ چاپ آپ ہی آپ نکل آتا تھا۔ پھر ایسا دور آیا کہ لوگوں نے کھدیڑ کر نکالنا شروع کر دیا بلکہ آپس میں لڑتے تھے کہ کون نکالے۔ چاند کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ سرکار کا کہا مانے یا لوگوں کا۔ بے شک اتنی بڑی قوم کے لیے ایک دن کی عید کافی نہیں۔ یکے بعد دیگرے دو تین دن کی ہو لیکن اس میں سرپھٹول بہت تھی۔ اب یہ سلسلہ بند ہے اور یہ بات ہمیں پسند ہے۔

عید کا پیغام لانے کے علاوہ چاند کا کوئی خاص مصرف نہ تھا۔ بس شاعر اور چکور وغیرہ اس سے بات کر لیتے تھے یا پھر ان بستیوں میں جہاں بجلی نہیں یہ لالٹین کا کام دیتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا ولایت والوں کو اس کے پیلے رنگ سے خیال ہوا کہ یہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ آخر اڑ کر جا پہنچے اور کالی کالی مٹی کی بوریاں بھر لائے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ ایسی مٹی، بلکہ اس سے بھی اچھی مٹی تو یہاں بھی ڈھیروں ہے، بہت پچھتائے۔

آج کل ہمارے ملک میں ہر شے میں خودکفیل ہونے کا رجحان ہے۔ اب لوگ آسمان کے چاند ستاروں کے بھی چنداں محتاج نہیں رہے۔ فلمی ستارے جن کے دم سے زمانے میں اجالا ہے، ہمارے ملک میں بنتے ہیں اور اچھے بنتے ہیں۔ بلکہ اب تو دساور کے ملکوں برطانیہ، روس، کینیا وغیرہ کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ چاند بھی دیسی برا نہیں ہوتا۔ ہم نے جس چاند کے بارے میں نظموں، غزلوں کی پوری کتاب "چاند نگر" لکھ ڈالی، وہ بھی مقامی ساخت کا تھا۔ مال اس میں اچھا لگا تھا، مدتوں چلا۔

ابر

یہ ابر ہے۔ اب سائنس کا زمانہ ہے، کوئی بچہ بھی بتا دے گا، ابر کیا ہوتا ہے۔ مرزا غالب اتنے بڑے شاعر ہو کر لوگوں سے پوچھتے پھرا کرتے تھے کہ ابر کیا چیز ہے۔ ہوا کیا ہے؟" ہماری ناقص رائے میں مرزا غالب نے سو سال پہلے پیدا ہو کر غلطی کی۔ آج ہوتے تو ابر اور ہوا کا پتہ بھی پاتے ـــــ آدم جی انعام بھی لے جاتے۔

ہوا

یہ ہوا ہے۔ تحقیق نہیں ہو سکا کہ اتنی ہوا کہاں سے آگئی کہ ایک الگ محکمہ آب و ہوا کا بنانا پڑا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کی بیرونی بستیوں میں جو پانی کے نل ہیں' ان میں سے نکلتی ہے۔

ہوا عجیب چیز ہے۔ یہ آگ کو جلاتی ہے۔ چراغ کو بجھاتی ہے۔ جہاز اسی سے چلتے ہیں' اسی سے ڈوبتے ہیں۔

لوگوں کی زندگی کا مدار ہوا پر ہے۔ ہوا نہ ملے تو لوگ مرجاتے ہیں۔ ویسے کھانا نہ ملنے سے بھی مرجاتے ہیں لیکن ہوا نہ ملنے سے جلدی مرجاتے ہیں۔ اسی لیے تو کوئی غریب آدمی بڑے آدمی کے پاس کوئی سوال لے کر جاتا ہے تو یہ جواب پاتا ہے کہ جاؤ ہوا کھاؤ۔ بڑے لوگ یہ مشورہ نہ دیتے تو بہت سے غریب کچھ اور کھا کر اب تک مرگئے ہوتے۔

ہوا کے نقصانات بھی ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ بہت اونچا اڑا کر لے جاتی ہے اور پھر پٹخ دیتی ہے۔ بعضوں کے پیٹ میں بھر جاتی ہے۔ بعضوں کے سروں میں۔ دونوں صورتوں میں تکلیف ہوتی ہے۔ شخص مذکور کو بھی' دوسروں کو بھی۔

ہوا میں وزن ہوتا ہے لیکن بہت کم۔ پرانے لوگ جو اس کی کمند میں پھنس جاتے تھے' فارسی میں خدا سے دعا کیا کرتے تھے کہ کریما' ہمارے حال پر بخشش کر۔ اب لوگ نہ فارسی پڑھیں نہ یہ دعا کریں' نہ ان کی بخشش ہو۔

سمندر

یہ سمندر ہے۔ اس میں پانی ہے۔ کراچی کی بستیوں میں تو کے۔ ڈی۔ اے[1] کے اتنے عمدہ انتظامات اور آب رسانی کے منصوبوں کے باوجود پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ سمندر میں کبھی نہیں ہوتی۔ جانے کیا بات ہے؟

سمندر میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ جب یہ چڑھائی کرتا ہے تو کسی کی نہیں مانتا خواہ کوئی کیسالاٹ صاحب کیوں نہ ہو۔ انگلستان کے ایک بادشاہ کینوٹ کو اس کے مصاحبوں اور درباریوں

---

[1] کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی۔ K.D.A

نے باور کرایا تھا کہ ساری دنیا آپ کے حکم کے تابع ہے۔ آپ کا حکم زمین پر چلتا ہے' آسمان پر چلتا ہے' ستاروں پر چلتا ہے' اخباروں پر چلتا ہے' ہوا پر چلتا ہے اور سمندر پر بھی چلتا ہے۔ ایک روز شاہ جلالت مآب سمندر کے کنارے کرسی بچھائے بیٹھے تھے لوگوں سے پوچھا۔ "یہ جو لہریں بڑھی آ رہی ہیں' ہمیں تنگ تو نہ کریں گی؟" مصاحبوں نے کہا: "حضور ان کی کیا مجال ہے۔ الٹا لٹکوا دیں گے۔" اس پر بھی لہریں جھپٹ کر آئیں۔ بادشاہ سلامت بہت ناراض ہوئے۔ سختی سے ڈانٹا "اے سمندر! خبردار پرے ہٹ' میرے پاؤں بھیگتے ہیں۔" سمندر نے ایک نہ سنی۔ بادشاہ کو بھگو دیا۔ قریب قریب ڈبو دیا۔

بادشاہ سلامت نے اپنے درباریوں اور مصاحبوں سے جواب طلب کیا کہ وجہ بیان کرو۔ تمہارے خلاف کیوں نہ ضابطہ کی کارروائی کی جائے؟ تمہارا تو بیان تھا کہ میری سلطنت عام ہے۔ اسے حشر تک دوام ہے اور سمندر تک میرا غلام ہے؟ لیکن یہ اقدام بعد از وقت تھا۔ اس دوران میں خود بادشاہ سلامت کے خلاف ضابطے کی کارروائی ہو چکی تھی۔ عالم پناہ کو پہلے یہ بات سوچنی چاہیے تھی۔ اپنے محکمہ اطلاعات پر اتنا بھروسا نہ کرنا چاہیے۔

اے پیارے بڑو! سمندر کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ چڑھائی پر آتا ہے تو ساحل کی کرسیاں بہا کر لے جاتا ہے' اور اگر کوئی ان پر بیٹھا رہنے پر اصرار کرے تو اسے بھی۔

پہاڑ

ان پہاڑوں کو دیکھو۔ بعضوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ کیا باتیں کرتی ہیں؟ یہ کسی نے نہیں سنا۔

پہاڑوں کے اندر کیا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں۔ بعض اوقات پہاڑ کو کھودو تو اندر سے چوہا نکلتا ہے۔ بعض اوقات چوہا بھی نہیں نکلتا۔ جس پہاڑ میں سے چوہا نکلے' اسے غنیمت جاننا چاہیے۔

جو لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں ان کو گرم کپڑے تو ضرور بنوانے پڑتے ہیں۔ لیکن ویسے کئی فائدے بھی ہیں۔ پہاڑوں پر برف جمتی ہے جو ان لوگوں کو مفت مل جاتی ہے۔ جتنا جی چاہے پانی میں ڈال کر پئیں۔ برف میں رہنے والوں کو ریفریجریٹر بھی نہیں خریدنے پڑتے۔ پیسے بچتے ہیں۔

پہاڑ پتھروں کے بنے ہوتے ہیں۔ پتھر بہت سخت ہوتے ہیں۔ جس طرح محبوبوں کے

دل سخت ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کبھی کبھی پتھر موم بھی ہو جاتے ہیں۔

جو پہاڑ بہت سربلندی دکھاتے ہیں ان کو کاٹتے ہیں۔ اور کاٹ کر ان کے پتھر سڑکوں پر بچھاتے ہیں۔ لوگ انھیں جوتوں سے پامال کرتے گزرتے ہیں۔ جو پتھر زیادہ ہی سختی دکھائیں، وہ چکی میں پستے ہیں۔ سرمہ بن جاتے ہیں۔ سارا پتھر پن بھول جاتے ہیں۔

چند امتحانی سوالات

۱۔ اگر محمود غزنوی ہندوستان پر سترہ حملے کرے تو احمد شاہ ابدالی کتنے حملے کرے گا؟

۲۔ پلاسی کی لڑائی جس میں فریقین نے ایک دوسرے کا دادرا بجادیا تھا، کس سن میں ہوئی تھی؟

۳۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کہاں ہوئی؟

۴۔ ہمایوں چھت پر کھڑا کون سے فلمی ستارے کو دیکھ رہا تھا جس پر پھسل پڑا اور مر گیا؟

۵۔ تم اَن پڑھ رہ کر اکبر بننا پسند کرو گے یا پڑھ لکھ کر اس کا نورتن؟

۶۔ خاندان مغلیہ میں کبوتروں کی اہمیت پر مضمون لکھو، کاغذ کے صرف دو طرف۔ تینوں طرف نہیں۔

(اردو کی آخری کتاب)

سوالات

۱۔ سبق زیرِ مطالعہ میں چند محاوروں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان محاورات کی صحیح وضاحت کریں۔

۲۔ سبق میں طنز و مزاح کے روپ میں جن اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح مقصود ہے، ان کی وضاحت کریں۔

۳۔ پہاڑ کے ذکر میں جس اخلاقی برائی کی نشاندہی کی گئی ہے، سبق کے حوالے سے وضاحت کریں۔

۴۔ سمندر کے حوالے سے بادشاہ اور مصاحبوں کی گفتگو سے مصنف کس بری انسانی خصلت کا ذکر کرنا چاہتا ہے، اپنے الفاظ میں تشریح کریں۔

—— ○○○ ——

سفرنامہ

سفرناموں کی تاریخ بہت پرانی ہے اور "ابنِ بطوطہ" کا سفرنامہ ایک بہت بڑا حوالہ ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ماضی میں بہت سے سفرنامے لکھے گئے کیونکہ سفر اختیار کرنے کا شوق انسانی فطرت کا خاصّہ ہے۔ گویا انسان کے مزاج میں تجسس کا عنصر اسے اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ دور دراز علاقوں کا سفر کرے اور نت نئی معلومات حاصل کر کے اپنے علم میں اضافہ کرے۔ دوسری جانب انسان ہمیشہ سے یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے تجربات میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک کرے۔ اس طرح سفرنامہ معرضِ وجود میں آیا اور دنیا کے بیشتر سیاحوں نے سفرنامے تحریر کر کے اس صنف کو تقویت پہنچائی' جو بذاتِ خود تو ادب نہیں لیکن کئی ادبی اصناف کی خصوصیات رکھتی ہے۔

سفرنامے کا رنگ داستانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے' اگرچہ ان میں بادشاہوں' وزیروں' سوداگروں یا درویشوں وغیرہ نے جو سفر اختیار کیے وہ سو فیصد فرضی ہیں اور جن میں بے شمار محیّر العقول باتیں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں اور قدم قدم پر عجیب و غریب ہوشربا طلسماتی دنیاؤں کے دروازے ہم پر کھلتے ہیں لیکن ایک بات یقیناً ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ انسان ازل سے سفر کا شوقین رہا ہے۔ اسی طرح ناولوں' افسانوں' ڈراموں کے علاوہ مکاتیب میں بھی اس صنفِ ادب کا رنگ جابجا بکھرا دکھائی دیتا ہے۔

گذشتہ صدیوں میں جو سفرنامے لکھے گئے وہ عموماً تاریخی یا محض معلوماتی بنیادوں کا دائرہ وسیع کرنے کی خاطر تحریر کیے گئے۔ ان سفرناموں سے ہمیں مختلف ممالک کے لوگوں کے رہن سہن' وہاں کے رسم و رواج' وہاں کی تاریخ اور وہاں کے موسموں کے بارے میں معلومات تو فراہم ہو جاتی ہیں لیکن ان کی کوئی ادبی حیثیت نہیں بنتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ماضی کے ان سفرناموں میں ہمیں سفرنامہ نگار کی اپنی شخصیت کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کے اپنے جذبات یا کسی خاص نقطہ نظر پر اس کی اپنی فکر اور مختلف مشاہدات کی ریل پیل میں اس کی اپنی انفرادیت پر پڑنے والے اثرات کا عموماً کہیں ذکر نہیں ملتا۔

یہی وجہ ہے کہ پرانے سفرناموں کو ہم تاریخ کی طرح پڑھتے ہیں جب کہ دَورِ حاضر کے سفرناموں کو ہم ادب کی طرح پڑھتے ہیں۔ اور چونکہ تاریخ کے مقابلے میں ادب زیادہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے' اس لیے آج کے سفرنامے بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

دَورِ حاضر کا سفرنامہ نہ تو محض رپورٹنگ ہے نہ ہی محض جغرافیہ ہے' نہ ہی محض تاریخ ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں شخصیت نگاری بھی ہے' کہانیاں اور واقعات بھی ہیں' طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے اور حقائق پر مبنی جزئیات نگاری بھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سفرنامے ایک حد تک مصنف کی خود نوشت بھی ہیں کیونکہ اس صنفِ ادب میں دوسری اصناف کی نسبت مصنف کی اپنی شخصیت زیادہ صاف اور واضح ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے' اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس صنفِ ادب میں مرکزی

کردار خود مصنف ہی ہوتا ہے جبکہ دوسرے کردار جو دورانِ سفر مصنف کو متاثر کرتے ہیں، سفرنامے میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس مختصر منظرنامے کی روشنی میں عمدہ سفرنامہ نگار وہی مصنف قرار پاتا ہے جو تمام دوسری اصناف نثر سے مکمل واقفیت رکھتا ہو اور جہاں جہاں اسے موقع ملے وہ ہر مخصوص صنف کی تکنیک کو فنکارانہ انداز میں برتنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے "سفرنامہ" ایک مشکل صنفِ ادب ہے کیونکہ اس میں دوسری تمام اصناف کے لوازمات کو باہم یوں مربوط کرنا پڑتا ہے کہ کہیں بھی پڑھنے والے کی دلچسپی اس میں کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ سفر نامہ نگار کے پیشِ نظر کوئی واضح اور خاص مقصد ضرور ہونا چاہیے جو انسانی ذہن اور انسانی سوچ کو جلا بخشنے اور اس میں گہرائی و گیرائی پیدا کر کے اس کی نشو و نما اور تعمیر کر سکے۔ اگر سفرنامے میں یہ عنصر موجود نہ ہو تو اس کی حقیقت ایک عام روداد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ سفرنامے میں صرف حقیقت تحریر کرنی چاہیے اور زیبِ داستاں کے لیے فرضی کردار یا واقعات کو ہرگز رقم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ بات ادبی بددیانتی کے زمرے میں آتی ہے اور ناجائز ہے۔

اچھے سفرنامے لکھنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جن ممالک میں جائے وہاں کی زندگی کا بغور مطالعہ کر کے صرف وہی باتیں لکھے جو اس کے ہم وطنوں کے لیے نئی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور فکر انگیز ہوں۔ بہت سے سفرناموں میں یہ کمزوری دیکھنے میں آئی ہے کہ مصنف غیرضروری اور غیر دلچسپ باتیں بھی قلمبند کرتے چلے جاتے ہیں اور ایسی باتیں بھی لکھ ڈالتے ہیں جن سے ہم پاکستانی پہلے سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ سفرناموں میں مصلحت کوشی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ادیبوں نے غیراہم اور غیر دلچسپ شخصیتوں کو اپنے مفادات کے لیے اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ سفرنامہ محض چند لوگوں کا قصیدہ بن کر رہ گیا ہے اور جسے پڑھ کر ذہن میں کوئی تازگی محسوس نہیں ہوتی۔

سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر قاری بھی یوں محسوس کرے جیسے وہ بھی مصنف کے ہمراہ شریکِ سفر ہے اور سفر کے تمام نشیب و فراز میں اس طرح مصنف کے ساتھ ہے کہ جو کچھ مصنف محسوس کر رہا ہے وہی سب کچھ اسے بھی محسوس ہو رہا ہے۔ اگر قاری کا ذہن ان تمام باتوں کو جو مصنف نے تحریر کی ہیں قبول کر رہا ہے تو بلاشبہ سفرنامہ کامیاب ہے، لیکن اس کے برعکس اگر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ سفرنامے میں حقیقت کم اور افسانہ زیادہ ہے، یا اسے منطقی ربط کی کمی محسوس ہوتی ہے، یا وہ عقلی طور پر سفرنامے میں لکھی گئی باتوں کو تسلیم نہیں کر پاتا تو سفرنامہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی ادب میں اسے کوئی اعلیٰ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

سفرنامے کا اصل جوہر موثر حقیقت نگاری ہے۔ تصنع، بناوٹ یا تکلف اس کے حسن کو متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ سفرنامے لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے اجتناب کرے۔

انہی وجوہات کی بنا پر اردو ادب میں وہی سفرنامے کامیابی اور مقبولیت سے ہمکنار ہوئے جو مستند

اور اچھے ادیبوں نے لکھے اور وہ سفرنامے جو غیر ادیب حضرات نے قلمبند کیے، مؤثر ثابت نہیں ہو سکے۔ پھر بھی یہ ایک اچھی روایت قائم ہوئی ہے کہ بے شمار اہلِ قلم اس صنف ادب کی طرف مائل ہوئے ہیں اور جن کی کوششوں کی بدولت کچھ اچھے سفرنامے منظرعام پر آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پرانے اور نئے سفرناموں کا ایک واضح فرق بھی سامنے آیا ہے، پرانے ادیب عموماً عالمانہ، فلسفیانہ، تاریخی یا تحقیقی انداز اختیار کرتے تھے جب کہ دَورِ حاضر کے سفرناموں میں فکر و فن کی زیادہ گہرائی دکھائی دیتی ہے اور ان کی زبان بھی عام فہم اور صاف ہے، اسی لیے اس صنفِ ادب کو اب باقاعدہ ادبی درجہ مل گیا ہے۔

اردو ادب میں سفرناموں کی ایک مضبوط روایت موجود ہے غالباً اردو میں سب سے پہلا سفرنامہ یوسف کمبل پوش کا ہے۔ آزاد نے ایران کے سفر کا حال لکھا ہے۔ سرسید احمد خاں نے یورپ سے واپسی پر سفر نامہ لکھا ہے۔ ایک اہم سفرنامہ شبلی کا "سفرِروم و شام" ہے۔ سر عبدالقادر نے اپنے سفرِیورپ کا حال تفصیل سے لکھا ہے جو مخزن میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ شیخ منظور الٰہی کا سفرنامہ "اندلس" اور محمود نظامی کا سفرنامہ، اردو کے اہم سفرنامے ہیں۔

دَورِ حاضر میں سفرنامے کو جن اُدبا نے بلندیوں سے ہم کنار کیا ان میں اشفاق احمد، ابنِ انشا، مستنصر حسین تارڑ، مختار مسعود، شیخ منظور الٰہی، سید اسد گیلانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ آگے چل کر یہ صنفِ ادب اور بھی زیادہ مقبولیت اختیار کرے گی اور بہت اچھے سفرنامے معرضِ وجود میں آ کر اپنی خوشبو ادبی فضاؤں میں بکھیریں گے۔

—— ○○○ ——
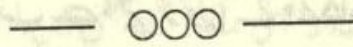
مولانا شبلی نعمانی[1]

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

قبرص سے قسطنطنیہ تک

۱۷- مئی کو جہاز سے سائپرس[2] پہنچا۔ یہ ایک مختصر سا جزیرہ ہے، جو بحرِ روم میں واقع ہے اور جس کو عربی میں قبرص کہتے ہیں۔ یہ جزیرہ اسلام کی قدیم فتوحات کی یادگار ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ۲۷ھ میں امیر معاویہؓ نے اس پر حملہ کیا، شہر والوں نے اس شرط پر صلح کی کہ جس طرح ہم سلطنتِ روم کو خراج دیتے ہیں تم کو بھی سات ہزار دو سو دینار سالانہ دیا کریں گے اور تم میں اور رومیوں میں کبھی جنگ ہوگی تو ہم کو کسی سے واسطہ نہ ہو گا۔ امیر معاویہؓ نے یہ شرط قبول کر لی لیکن ۳۳ھ میں ان لوگوں نے خلافِ عہد مسلمانوں کے مقابلے میں رومیوں کو مدد دی۔ امیر موصوف نے پانسو کشتیوں کے بیڑے کے ساتھ دوبارہ چڑھائی کی اور نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ تاہم خراج اور صلح کی شرطیں وہی رہنے دیں، ان کے حکم سے بارہ ہزار عرب وہاں جاکر آباد ہوئے اور مکانات اور مسجدیں تعمیر کیں۔ ایک مدت کے بعد یہ جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا اور کئی بار فتح ہو کر پھر نکل گیا۔ سب سے اخیر ترکوں نے ۱۵۷۰ء میں عیسائیوں سے واپس لیا اور (اب تک) انھیں کے قبضے میں تھا۔ روم و روس کی اخیر جنگ میں انگریزوں نے اس شرط پر لیا کہ سالانہ خراج جو سلطان کو ملتا تھا، اب بھی ملتا رہے گا۔ چنانچہ اب وہاں انگریزی حکومت اور انگریزی انتظام ہے۔

اس جزیرے میں لرنکہ اور لماسول دو بڑے شہر ہیں اور دونوں جگہ جہاز تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے لنگر کرتا ہے۔ میں نے لماسول کی سیر کی، چونکہ یہاں انگریزی حکومت ہے، اس لیے راہداری کے پروانے کی پُرس و جُو نہ تھی۔ میں داخل ہوا تو میرے سر پر ایرانی ٹوپی اور بدن پر شیروانی اچکن تھی۔ غالباً وہاں کے لوگوں نے یہ وضع کبھی دیکھی نہ تھی۔ میں جدھر سے گزرتا لوگ تعجب سے دیکھتے اور کہیں کھڑا ہو جاتا تو تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سب سے پہلے میں جامع مسجد میں گیا، مسجد کے متصل ایک مکتب ہے، وہاں ایک مولوی صاحب جو نہایت باوقار اور خوش لباس تھے،

۱- سوانحی حالات صفحہ ۱۷۸ پر آچکے ہیں

۲- جغرافیے کی کتابوں میں لکھا ہے کہ زمانہ قدیم میں اس جزیرے میں نو صوبے، بارہ شہر، آٹھ سو پانچ گاؤں، ۱۰ لاکھ باشندے تھے۔ ترکوں نے ۱۵۷۰ء میں اس پر قبضہ کیا، ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۵۷۷,۶۱۵ ہے۔

ابتدائی صفوں کو درس دے رہے تھے۔ میں نے سلام علیک کی' وہ کھڑے ہو گئے اور نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے تپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے' میں بھی ان کے برابر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب کے اشارے سے ایک لڑکے نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔ میرے دل پر عجیب اثر ہوا' خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان' کہاں بحر روم کے دور دراز جزیرے! اس مقدس کلام (قرآن) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی قوت بن کر دوڑ گئی اور آج تک باقی ہے' وہ معصوم لڑکا خوش لحن بھی تھا اور اصولِ قرآت کے مطابق پڑھتا تھا۔ اتفاق سے آیتیں بھی مؤثر تھیں۔ ان باتوں نے مجھ کو بالکل مدہوش کر دیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی۔

اگرچہ پندرہ سولہ برس سے انگریز یہاں حکومت کر رہے ہیں لیکن حکمت عملی کے لحاظ سے طرزِ انتظام میں بہت سی قدیم باتیں قائم رکھی ہیں۔ محکمہ قضا بالکل الگ ہے اور شرعی مقدمات سے حکومت انگریزی کو کچھ واسطہ نہیں۔ اتفاق سے مجھ کو قاضی صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا' بہت خلیق اور باوقار آدمی ہیں۔ تعلیم کا طریقہ بھی بالکل ترکی انتظام کے مطابق ہے۔ تمام مکتبوں اور مدرسوں میں ترکی سررشتہ تعلیم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ جس مکتب کا میں نے ابھی ذکر کیا' اس میں قرآن مجید' فقہ کا ابتدائی رسالہ' تاریخ' جغرافیہ درس میں داخل ہیں اور تعلیم نہایت خوبی سے ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ سے واپسی کے وقت بھی میں اس مکتب میں گیا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور مدرس صاحب اس وقت تک تشریف نہیں لا چکے تھے' دو تین لڑکے موجود تھے' وہ نہایت ادب اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا وطن کہاں ہے۔ میں نے کہا ہندوستان' بولا "ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ خاص شہر کا نام بتایئے" میں نے علی گڑھ کا نام لیا' کہنے لگا' میں نقشے میں دیکھتا ہوں' کہاں واقع ہے۔ ہندوستان کا نقشہ سامنے آویزاں تھا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور فوراً علی گڑھ پر انگلی رکھ کر کہا "ہاں یہ ہے۔" اس کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس لیے مجھ کو اس کی اس تیزی اور یادداشت پر تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا تمہارا بادشاہ کون ہے؟ بولا "آفندم" آفندی ترکی زبان میں جناب مخدوم کے ہم معنی ہے اور جب میم متکلم کے ساتھ استعمال کیا جائے تو عموماً اس سے سلطان مراد ہوتے ہیں۔ میں نے کہا "یہاں تو انگریز حکومت کر رہے ہیں" بولا کہ ہاں مستاجری[1] کے طور پر لیا ہے اور سالانہ خراج ادا کرتے ہیں۔ انگریزوں کی حکمت عملی نہایت دانشمندانہ ہے کہ کسی ملک پر قبضہ کرتے ہیں تو اس تدریج

---

[1] ٹھیکے پر۔

اور آہستگی سے کہ ملک والوں کو انقلابِ حکومت کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہاں کی زبان ترکی ہے اور یہاں سے قسطنطنیہ تک ہر شہر اور قصبہ کی یہی زبان ہے۔ اس سے ترکوں کی حکومت کی سطوت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ممالکِ مفتوحہ کی زبان تک بدل دی۔ ایشیائے کوچک اتنا بڑا وسیع ملک ہے اور کثرت سے عیسائی آباد ہیں جن کی زبان کسی زمانے میں یونانی یا لیٹن تھی لیکن اب تمام ملک میں ترکی بولی جاتی ہے۔ سائپرس کے مولوی صاحب اور قاضی صاحب جن کا میں نے ذکر کیا' اگرچہ عربی بخوبی جانتے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ البتہ معمولی جملے سمجھ لیتے تھے اور اسی سہارے پر میں نے ان سے بات چیت کی۔

مجھ کو اس قدر قلیل زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت کا صحیح اندازہ تو کیا ہو سکتا تھا لیکن ظاہر طور سے قیاس ہوتا تھا کہ اچھی نہیں' جس قدر بلند مکانات یا عمدہ دکانیں نظر آئیں' دریافت سے معلوم ہوا کہ کل عیسائیوں کی ہیں۔

۱۸ - مئی کو جہاز روڈس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ ہے' جس کی وسعت ہمارے قدیم مورخوں نے ساٹھ میل بیان کی ہے اور جغرافیہ مترجمہ سوسائٹی علی گڑھ[۱] میں طول چالیس میل عرض پندرہ میل لکھا ہے یہ بھی قدیم فتوحات میں سے ہے۔ امیر معاویہؓ کے عہد ۵۲ھ میں فتح ہوا اور اس وقت بہت سے مسلمان وہاں جاکر آباد ہوئے۔ قدامت کے لحاظ سے میں اس کی سیر کا مشتاق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے رات کا وقت تھا اور جہاز والوں میں سے اور کسی نے میرا ساتھ نہ دیا۔ زیادہ بدقسمتی یہ کہ واپسی کے وقت بھی اتفاق سے یہی اسباب پیش آئے اور اس کی سیر سے بالکل محروم رہ گیا۔

۲۰ - مئی صبح کے وقت ازمیر پہنچے' چونکہ یہ ایک بہت بڑی بندرگاہ ہے' جہاز دو روز تک یہاں مقیم رہا۔ اور اپنے شامی دوستوں کے ساتھ جہاز سے اترا۔ کنارے پر وہی تذکرے (پروانہ راہداری) کی بازپُرس تھی' لیکن ساتھیوں کی بدولت مجھ کو چنداں زحمت نہیں ہوئی۔ یہ شہر جس کو انگریزی میں سمرنا کہتے ہیں۔ ایشیائے کوچک کا صدر مقام ہے اور اس صوبے میں اس سے زیادہ وسیع اور آباد کوئی شہر نہیں ہے۔ قدامت اور تاریخی واقعات کے لحاظ سے بھی ایک یادگار مقام ہے۔ ہومر جو یونان کا مشہور شاعر گزرا ہے اور جس کی نسبت یورپ کا خیال ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا' اس کی قبر یہیں ہے۔ سات مقدس گرجے جن کا ذکر انجیل کے سفرِ رویا میں

۱۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق اس کا رقبہ ۵۴۰ مربع میل ہے۔

ہے' ان میں سے ایک اسی شہر میں تھا۔ زمانے کے انقلابات نے اس کو دس دفعہ تباہ و برباد کیا تاہم اس کی موجودہ آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ اطراف کی زمین نہایت سیر حاصل ہے اور خود شہر تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ ہمیشہ بیسیوں دخانی جہاز بندر گاہ میں موجود رہتے ہیں۔ ریل بھی یہاں جاری ہے اور دو وقت یہاں سے ٹرین روانہ ہوتی ہے۔

اسلامی آثار بکثرت ہیں' لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ مسجدوں کی تعداد تین سو سے کم نہیں' جن میں بعض بڑی شوکت و شان کی ہیں۔

جہاز سے ہم اترے تو نہایت بلند اور شاندار عمارتوں کا سلسلہ نظر آیا جو دور تک بخط مستقیم دریا کے کنارے چلا گیا ہے' یہ عمارات ہوٹل' قہوہ خانے' تھیٹر' ناچ گھر اور عیسائی تاجروں کی دکانیں نہایت خوش منظر اور پر فضا ہیں' رات کے وقت ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میلہ یا شادی کی تقریب ہے' قہوہ خانوں اور ناچ گھروں کے علاوہ سڑک پر کثرت سے مجمع رہتا ہے اور جدھر جاؤ نغمہ و سرود کی آواز آتی ہے۔ اس سلسلہ عمارات کے عقب میں عیسائیوں کا محلہ ہے اور اس قدر بلند اور عالی شان عمارتیں ہیں کہ میں نے اب تک کہیں نہیں دیکھیں' اس محلے کے تمام گلی کوچے نہایت صاف اور ہموار ہیں۔

اس محلے کی سیر سے فارغ ہو کر میں نے شہر کا رخ کیا' شہر اگرچہ نہایت پُر رونق ہے اور آدمیوں کی کثرت سے ہر وقت ایک میلہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن تمام سڑکیں ناہموار اور ناصاف ہیں اور گلی کوچوں میں تو نجاست اور کیچڑ کی وجہ سے رستہ چلنا مشکل ہے' حقیقت یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں میونسپلٹی کا انتظام نہایت خراب ہے اور حکومت ترکی کے لیے یہ ایک نہایت قابلِ لحاظ امر ہے۔ چلتے چلتے ہمارے شامی دوستوں کو بھوک لگی اور ایک نانبائی کی دکان پر جا بیٹھے۔ مجھ کو اگرچہ اشتہا نہ تھی لیکن ان کے اِصرار سے شریک ہوا۔ نانبائی کے لفظ سے ہمارے ناظرین کو ہندوستان کے نانبائیوں اور ان کی ذلیل دکانوں کا خیال آیا ہو گا لیکن یہ قیاس صحیح نہیں' یہاں معمولی سے معمولی دکان کی آراستگی کی یہ صورت ہے کہ متعدد چھوٹی چھوٹی میزیں اور ان کے گرد کرسیاں لگی ہیں۔ میزوں پر نہایت صاف چادر بچھی ہوئی ہے' دیوار کے ایک کونے میں ٹونٹی لگی ہے اور اس کے نیچے طشت اور دائیں طرف صابون اور تولیہ رکھا ہے۔ یہ نہایت معمولی دکانوں کی کیفیت ہے اور بڑی بڑی دکانیں جن کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے' نہایت پُر تکلف اور پُر شان ہیں لیکن اس قسم کے جس قدر ہوٹل ہیں' عموماً عیسائیوں کے ہیں۔

میں نے مدرسوں کی سیر کرنی چاہی لیکن چونکہ جمعے کا دن تھا' تمام مدرسے بند تھے۔ نماز

جمعہ جامع حصار میں پڑھی۔ یہ مسجد پُر تکلف اور آراستہ ہے، چھت پر طلائی نقش و نگار ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ صحن کے دونوں طرف بڑے بڑے ستونوں پر گھنٹے لگے ہیں جن سے اوقات نماز معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ مسجد کی زیبائش بھی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اس کی تقلید کی جاتی تو اچھا ہوتا۔ خطبہ نماز میں یہاں بعض جدّتیں ہیں۔ مگر نہ شریعت میں ان کی کچھ اصل ہے نہ بجائے خود وہ موزوں ہیں۔ خطیب جب خطبہ پڑھتا ہے تو بیچ بیچ میں رکتا جاتا ہے۔ اس وقت چند اشخاص آواز ملا کر کچھ پڑھتے ہیں یہ چپ ہوتے ہیں تو خطیب پھر شروع کرتا ہے اور اس طرح کئی بار اتفاق ہوتا ہے۔ نماز میں عموماً چھوٹی سورتیں پڑھتے ہیں جو تین چار آیتوں سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ حالانکہ تمام دنیا میں جمعے کی نماز میں بڑی سورتوں کے پڑھنے کا دستور ہے۔

۲۱۔ مئی کو شام کے قریب جہاز نے لنگر اٹھایا۔ یہاں سے قسطنطنیہ تک کوئی بڑا اسٹیشن نہیں ہے۔ بعض بعض مقامات پر جہاز تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرا لیکن ہم اتر نہ سکے۔ یہ مقلات زیادہ تر جنگ کی ضرورتوں کے لیے ہیں اور ہر جگہ کثرت سے جنگی آلات فراہم ہیں۔ چناق قلعہ ایک مقام ہے جہاں نہایت مضبوط قلعہ ہے۔ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ فتح کرنے کا عزم کیا تو اس وقت توپ اور گولے کا عام رواج نہ تھا۔ محمد نے خود توپیں ڈھلوائیں اور مٹی کا گولہ بنوایا جن میں سے چند یادگار کے طور پر اب بھی محفوظ ہیں۔ یہ گولے پختہ اور نہایت مضبوط ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ لوہے کے گولوں سے کم نہیں۔ ازمیر سے قسطنطنیہ تک دریا کے دونوں طرف ایسے محفوظ قلعے اور دمدمے تیار کیے گئے ہیں اور اس کثرت سے سلمانِ جنگ موجود ہے کہ قوی سے قوی سلطنت بھی اس راستے سے دارالسلطنت پر حملہ کرنے کا قصد نہیں کر سکتی۔ یہ تمام قلعے اور دمدمے فاتح کے عہد کے ہیں۔ یہ نامور شہنشاہ جب قسطنطنیہ کی تسخیر کے ارادے سے بڑھا تو راہ میں جابجا جنگی چھاؤنیاں بنوائیں اور قلعے اور دمدمے تیار کروائے لیکن یہ تمام تفصیل لوگوں کی زبانی روایت ہے۔ میں نے تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں کی ہے۔

چناق قلعے سے آگے بڑھ کر ہم نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ جہاز تیزی سے جا رہا تھا کہ دور سے پانی میں ایک فوارہ سا چھوٹتا نظر آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سامنے سے چار پانچ مچھلیاں جہاز کی طرف دوڑی آ رہی ہیں، قریب آگئیں تو جہاز کے ساتھ ساتھ ہولیں۔ ان کا جسم پانی کی سطح سے صاف نظر آتا تھا۔ جہاز اگرچہ نہایت تیزی سے جا رہا تھا لیکن وہ برابر ساتھ ساتھ آتی تھیں، کبھی کبھی جب سانس چڑھ جاتی، تو بڑے زور سے پھنکار مارتی تھیں۔ اس وقت پانی میں فوارہ

چھوٹا نظر آتا تھا۔ تقریباً دو تین میل تک جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔ تمام لوگ حیرت سے تماشا دیکھتے تھے۔ بعضوں کو خیال ہوا کہ ان مچھلیوں نے کبھی جہاز کی صورت نہیں دیکھی تھی' اس لیے اس کو کوئی جانور سمجھیں اور مقابلے کے جوش میں چاہتی تھیں کہ جہاز ان سے بڑھنے نہ پائے۔ واپسی کے وقت بھی ایسا ہی اتفاق ہوا اور اس وقت دریافت سے معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک دفعہ اتفاق سے یہ مچھلیاں آگئی تھیں اور جہاز کے ملازموں نے ان کے لیے کھانے کی کوئی چیز دریا میں ڈال دی تھی۔ اس کی طمع پر جب کوئی جہاز ادھر سے گزرتا ہے تو اکثر یہ مچھلیاں آجاتی ہیں اور دور تک جہاز کے ساتھ دوڑتی ہیں۔

۳۱۔ مئی صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے' جہاز نے لنگر کیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ مجھ کو منزلِ مقصود پر پہنچنے کی نہایت خوشی ہونی چاہیے تھی لیکن قلیوں اور ملاحوں کے ہنگامے اور شور و غل میں میرے حواس جاتے رہے۔ ملاحوں نے تمام جہاز گھیر لیا۔ ان کے شور و غل اور کشاکش سے ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے پہلے کچھ طے نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتا تھا کہ جہاز سے اتر کر کہاں جاؤں' ہوٹل میرے مناسبِ حال نہ تھا (اس کی وجہ آگے چل کر معلوم ہو گی) اور سراؤں پر ناواقفیت کی وجہ سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ سخت مصیبت یہ ہوئی کہ شامی احباب جن سے ہر قسم کی مدد کی توقع ہو سکتی تھی' ان کو کالجوں میں پہنچنے کی جلدی تھی' اس لیے وہ میرا انتظار نہ کر سکے۔ مجھ کو اکیلا پا کر ملاحوں اور قلیوں نے اور بھی دق کرنا شروع کیا' میرا اضطراب اس خیال سے اور بڑھتا جاتا تھا کہ جہاز پر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے یہ دقت ہے تو شہر میں کیا حال ہو گا؟ اس لیت ولعل میں زیادہ دیر ہوتی جاتی تھی' اکثر مسافر جہاز سے اتر گئے اور اترتے جاتے تھے' آخر خانساماں کو اسباب سپرد کیا اور اس سے کہا کہ میں شہر کی سیر کر کے واپس آتا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ پہلے شہر میں جا کر قیام کا انتظام کر آؤں تب اسباب جہاز سے اتاروں۔ شام کے چند عربوں نے ایک کشتی کرایہ کی لی۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ کنارے پر تذکرے کی پُرس وجُو تھی۔ میں نے انگریزی چٹھیاں دکھائیں لیکن وہ پاسپورٹ مانگتے تھے۔ غرض بہزار دقت رہائی ہوئی۔ اب حیران تھا کہ کہاں جاؤں۔ ایک شامی عرب سے جن کا نام عبدالفتاح تھا' کشتی میں تعارف ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ "آپ مجھ کو کوئی معقول طریقہ بتائیں۔" انھوں نے کہا کہ "میری حالت بھی تمھارے قریب قریب ہے' اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہیں۔" یہ طریقہ اگرچہ احتیاط کے خلاف تھا لیکن ناواقفیت اور اجنبیتِ زبان کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا اور سچ پوچھیے تو یہی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی۔

یہاں مسافروں کے ٹھہرنے کے چند طریقے ہیں۔ سب سے زیادہ اطمینان اور آرام تو ہوٹلوں میں ہے لیکن اولاً تو ان کا کرایہ ایک پونڈ یعنی ۱۲ روپے سے کم نہیں' دوسرے اکثر بلکہ تقریباً تمام عمدہ ہوٹل یورپین آبادی میں ہیں' جو استنبول سے دور ہے' اور جامع مسجدیں' کتب خانے' مدرسے' مکاتب جس قدر ہیں' سب استنبول میں ہیں۔

ہوٹل کے بعد خانات یعنی سرائیں ہیں لیکن یہ سرائیں ہندوستان سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں' یہاں بڑی بڑی سراؤں میں جس قدر کمرے ہوتے ہیں عموماً وسیع اور پرفضا ہوتے ہیں اور ان میں ہر وقت نواڑ کا پلنگ' توشک' چادر' لحاف اور ضروری چیزیں مہیا رہتی ہیں۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ ہوتے ہیں۔ فی پلنگ آٹھ دس آنے کرایہ ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ کرائے کے مکانات ہیں۔ یہ مکانات اکثر دو منزلہ' سہ منزلہ ہوتے ہیں' ہر درجے میں متعدد کمرے اور ہر کمرے میں میز' کرسی' کوچ' لیمپ' فرش' پلنگ' توشک' لحاف' تکیہ مہیا رہتا ہے۔ کرایہ فی کمرہ دس روپیہ ماہوار سے بیس تیس تک ہوتا ہے' اور ان مکانوں کے مالک یا اجارہ دار عموماً عیسائی ہیں' وہ خود بھی انھیں مکانوں میں رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے مسافروں کو بہت کچھ آرام ملتا ہے۔

اگرچہ جیسا میں نے ابھی بیان کیا کرائے کا مکان لینا زیادہ آرام کا طریقہ تھا لیکن میں اور میرے شامی دوست دونوں اس امر سے ناواقف تھے' اس لیے ایک خان یعنی سرائے میں جاکر ٹھہرے۔ اس انتظام کی طرف سے اطمینان ہوا تو جہاز پر جاکر اپنا اسباب اٹھوا لایا۔ چھے سات دن تک ہم اس خان میں رہے۔ پھر باب عالی کے پاس ایک عمدہ مکان کرائے پر لے لیا۔

خوش قسمتی سے شیخ عبدالفتاح جن کے ساتھ میں نے زبردستی دوستی پیدا کی تھی۔ بڑے معزز خاندان کے آدمی نکلے۔ دمشق میں حضرت خالد نقشبندی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ جن کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو اس قدر ارادت ہے کہ ان کا نام نہیں لیتے' بلکہ حضرت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بزرگ ہماری خاک ہندوستان کے تربیت یافتہ یعنی حضرت میرزا جان جاناں دہلوی کے مرید تھے' شیخ عبدالفتاح انھیں کے بھتیجے ہیں اور اس تعلق سے لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں' چونکہ قسطنطنیہ میں شامیوں کا ایک بڑا گروہ ہے' دو ہی چار روز میں شیخ الفتاح کی اکثر نوابوں[1] سے شناسائی ہوگئی اور ان کے ذریعے سے مجھ کو بھی ان لوگوں سے تعارف ہوتا گیا۔

---

[1] یہاں نواب سے مراد پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ اس کا واحد نائب ہے۔

ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں۔ شیخ الفتاح سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ "اِشکاتُ المُعتَدِی" جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھاکر دیکھا اور کہا کہ آہا یہ رسالہ مدت ہوئی، میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا۔ "شَکَرَ اللہ مُسَاعِیَہٗ"۔ شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ کو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا، نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کس مپرسی میں اتنا ذریعہ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔ شیخ علی ظبیان نوجوان آدمی ہیں۔ فقہ کی تحصیل شیخ عبدالرحمٰن سے کی ہے جو مصنف ردالمختار (مشہور بہ شامی) کے نواسے اور شاگرد تھے۔ اگرچہ ان کو اکثر علوم متداولہ میں دخل ہے لیکن ادب میں زیادہ مہارت ہے، ایک غیر منقوط قصیدہ سلطان کی مدح میں پیش کیا تھا جس پر ان کو صلہ و انعام بھی عطا ہوا۔ مدت سے درویش پاشا کے مہمان ہیں اور پاشائے موصوف ان کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ رکھتے ہیں۔ مجھ سے ان کا تعلق روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ باوجود بعد مسافت تقریباً ہر روز میرے مکان پر تشریف لاتے اور کبھی کبھی تمام دن میرے پاس رہتے۔ شیخ عبدالفتاح چند روز کے بعد دمشق کو واپس چلے گئے۔ اس وقت تنہائی میں شاید مجھ کو تکلیف پہنچتی لیکن شیخ علی ظبیان کی غم گساریوں نے تمام تردّدات دل سے دور کردیے۔

مکان جو ہم نے کرائے پر لیا تھا۔ اگرچہ نہایت خوش فضا اور موزوں تھا لیکن چونکہ مکان کا مالک (عارضی) نہایت بد معاملہ اور آوارہ مزاج تھا۔ چند روز کے بعد میں نے دوسرا مکان کرائے پر لیا اور اخیر تک وہیں رہا۔ یہاں مکان کی خوبی کے ساتھ بڑا آرام یہ تھا کہ مالک مکان ایک نیک مزاج عورت تھی، اگرچہ اس کا مذہب عیسائی تھا اور قوم کی اٹالین تھی تاہم بقدر ضرورت عربی بول لیتی تھی اور مسلمانوں سے ایک خاص انس رکھتی تھی۔

کھانے پینے کے انتظام کی ہم کو کچھ ضرورت نہ تھی، ہوٹل اور دکانیں کثرت سے ہیں اور نہایت مرتّب اور پُر تکلف ہیں۔ بازار میں کھانا یہاں مطلق عیب نہیں۔ میں نے اکثر معزز عہدے داروں کو ہوٹلوں میں کھاتے دیکھا۔ یہ ہوٹل عموماً عیسائیوں کے ہیں۔ مسلمانوں کی دکانیں

بجز اس کے کہ میز و کرسی وہاں بھی ہوتی ہے' باقی اور باتوں میں ہندوستان کی دکانوں سے مشابہ ہیں۔

(سفرنامۂ روم و مصر و شام)

سوالات

۱۔ درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

پُرس و جُو' طرزِ انتظام' سررشتہ' ممالکِ مفتوحہ۔

نقش و نگار' لیت و لعل' کس مپرسی۔

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

(الف) "انگریزوں کی حکمت عملی نہایت دانشمندانہ ہے کہ کسی ملک پر قبضہ کرتے ہیں تو اس تدریج اور آہستگی سے کہ ملک والوں کو انقلاب حکومت کی خبر بھی نہیں ہوتی۔"

(ب) "یہ طریقہ اگرچہ احتیاط کے خلاف تھا لیکن ناواقفیت اور اجنبیتِ زبان کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا۔ اور سچ پوچھیے تو یہی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی۔"

۳۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے:

(الف) مولوی صاحب کے اشارے سے ---------- عجیب حالت طاری رہی۔

(ب) چناق قلعے سے آگے بڑھ کر ---------- جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔

۴۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

—— OOO ——
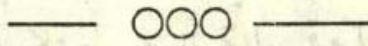
شیخ منظور الٰہی

(ولادت ۱۹۱۹ء)

شیخ منظور الٰہی کا تعلق فیصل آباد سے ہے لیکن وہ طویل عرصے سے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ایف۔ سی۔ سی روڈ گلبرگ میں مقیم ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک سیاسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد شیخ محبوب الٰہی مسلم لیگ کی طرف سے دو بار رکن اسمبلی رہے ہیں۔ وہ فیصل آباد سے پنجاب اسمبلی اور مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے۔

شیخ منظور الٰہی نے اپنی ملازمت کا آغاز فوج میں کمیشنڈ آفیسر کی حیثیت سے کیا اور برما کے محاذ پر متعین رہے اور بعد میں ۱۹۴۶ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کمشنر کیمبل پور اور ملتان کے بعد کمشنر بہاول پور، سیکرٹری ایجوکیشن ویسٹ پاکستان، چیف سیکرٹری سندھ رہے۔ بعد ازاں ڈائرکٹر جنرل سول سروسز اکیڈمی بھی رہے۔ آپ حکومت پنجاب کی طرف سے قائم کردہ بیت المال کے امین اور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے بھی رکن رہے۔ اور صدر مملکت غلام اسحاق خان کی طرف سے استعفا دینے کے آخر میں نئے سیٹ اپ کے بعد ۱۹ جولائی ۹۳ء کو نامزد وزیر اعلیٰ پنجاب کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ مرکزیہ مجلسِ اقبال کے بھی عہدہ دار ہیں۔

شیخ منظور الٰہی کی محبوب شخصیت علامہ اقبالؒ ہیں۔ آپ کے قریبی دوستوں میں قدرت اللہ شہاب (مرحوم) سید فدا حسین، مختار مسعود اور شیخ اکرام اللہ شامل ہیں۔ خواجہ احمد طارق رحیم کے والد شیخ عبدالرحیم کے گہرے دوست تھے۔ ادیبوں کے حلقے میں ان کا اشفاق احمد اور بانو قدسیہ سے بھی قریبی تعلق ہے۔

شیخ منظور الٰہی مسلم تشخص کے بہت بڑے حامی رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے اندلس (سپین) میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ دو کتابوں "درِ دل کشا" اور "روز و شب" کے مصنف ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنے والد کے بارے میں ایک مضمون "غروبِ عظمت" لکھا جسے قدرت اللہ شہاب کے کردار "ماں جی" کی طرح شہرت ملی۔

شیخ منظور الٰہی کی نثر بڑی نرم اور گداز ہے۔ "درِ دل کشا" میں انھوں نے جس طرزِ بیان کے دروازے کھولے ہیں وہ کلاسیکی نفاست میں ڈوبا ہوا انداز ہے۔ احساس جمال کی گہری چھاپ ایک ایک لفظ پر لگی ہوئی ہے۔ ان کی نثر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے انتہائی شستہ کلاسیکی ادبی زبان کو اپنے درون و بیرون کے تجربات اور ماحول کا ترجمان بنا دیا ہے اور کہیں یہ التباس نہیں ہونے دیا کہ یہ زبان اظہارِ خیال کے لیے نامکمل ہو سکتی ہے۔

اُے گُلستانِ اُندلُس

اندلس کی فضائیں اداس ہیں' اس کے در و بام پر ایک ناقابلِ بیان افسردگی سحر کی طرح مسلط ہے۔ اس گہری مسلسل اداسی کی وجہ لین پول نے لکھی ہے "جب یورپ میں چار سُو ظلمت تھی' عربوں نے علم و ادب کی شمعیں روشن کیں' شجاعت کے اصول وضع کیے' ہسپانویوں نے موروں [2] کو جلاوطن کر کے کیا پایا؟ کچھ عرصہ ہسپانیہ چاند کی طرح مستعار روشنی سے چمکتا رہا' پھر گرہن لگ گیا اور اس وقت سے یہ ملک تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔

ابھی نور کا تڑکا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ سیرا مورینہ کا سلسلہ کوہ طے کر رہی تھی۔ تاریخ کے فیصلہ کن موڑ پر یہ پہاڑیاں خون میں نہا گئی تھیں۔ اس خون میں طوائف الملوکی اور دودمان پرستی کی بے سود قربانیاں بھی شامل تھیں۔ زائر ان احساسات کے ساتھ قرطبہ کے نواحی علاقے میں پہنچتا ہے' انہی ویران پہاڑیوں پر عربوں نے کاریزیں [3] بنا کر سارا علاقہ شاداب کیا تھا۔ چاول' کپاس' شکر اور زیتون کی کاشت پہلی بار کی۔ انار' آڑو' بادام اور سنگترہ مقامی پھلوں پر ایزاد کیے۔ اب یہ علاقہ زمین بردگی کا شکار ہے۔ مٹی کے ٹیلوں میں گہرے شگاف نظر آرہے ہیں۔

دیہی علاقوں میں لوگوں کے دن نہیں پھرے۔ پہاڑیوں سے چپکے ہوئے دیہات محرومی کی تصویر ہیں۔ گھر میں مٹی کا فرش' تن کے پھٹے کپڑے' کم عمر میں شادی' کم عمر میں موت' سڑک کے کنارے ایک نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں کہا' "ہماری غربت کی بڑی وجہ اہلِ کلیسا اور زمینداروں کا گٹھ جوڑ ہے۔ بڑے زمیندار نہیں چاہتے کہ علم کی روشنی عام ہو' کبھی سنو کہ اس حصے میں کسانوں نے بغاوت کر دی ہے تو حیران نہ ہونا۔"

عربوں کے آنے سے پہلے بھی غریب کسان' جاگیرداروں اور پادریوں کے رحم و کرم پر تھے اور ایک ہزار برس بعد بھی! کیا گزشتہ پانچ سو برس ترقیِ معکوس کی نذر ہوئے۔ عرب حکمرانوں نے کاشت کار کو اراضی اور آب رسانی کے حقوق دیے۔ یوں ملک کی خوش حالی میں اسے حصہ ملا تھا۔ شکست سے پہلے یہ عافیت خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بدنظمی کے مختصر وقفے کے سوا اڑھائی سو برس قرطبہ مغرب کا عظیم ترین شہر رہا۔ اس

۱۔ Brooding Sadness

۲۔ اہلِ یورپ عربوں کو مُور کہتے ہیں۔

۳۔ Aqueducts

کے کمالِ عروج کا زمانہ دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ صاف پانی بکثرت مہیا کیا گیا تھا۔ معبدوں کے طلائی گنبد اور خوشنما باغات دور سے نظر آتے تھے۔ آئندہ دو سو برس تک یورپ میں کوئی شہر نہ تھا جہاں گلی کوچوں میں سنگی فرش ہو' نہ ہی اسکول یا پبلک حمام ایسی نعمتوں کا خیال کیا جا سکتا تھا۔

قرطبہ میں ستر لائبریریاں اور کتابوں کی بے شمار دکانیں تھیں۔ کاغذ سازی کا فن مراکو اور ہسپانیہ نے عربوں سے سیکھا جہاں سے یورپ تک پہنچا۔ لکھائی کے لیے عرب کاغذ کی بہترین قسم استعمال کرتے تھے۔ جامعہ قرطبہ نظامیہ بغداد اور الازہر کی پیش رو تھی۔ قرطبہ کے عظیم فرزند ابن رشد نے ارسطو کی شرح لکھی اور اس کے بہت سے نظریات کو رد کیا۔ مدت تک ابن رشد کے افکار نے یورپ کے فلسفیوں کو متاثر کیا۔ اندلس میں ابتدائی تعلیم عام تھی۔ یورپ میں جہالت کا دُور دورہ تھا۔ راہبوں یا پادریوں کے علاوہ لوگ مروجہ علوم سے بے بہرہ تھے۔

قدیم شہر کا محیط چودہ میل تھا۔ وادی الحسن' جنان العجوبہ ایسے دل کشا مضافات دریا کے کنارے پھیلے تھے۔ کوچوں میں پتھر کا فرش اس نفاست سے بچھا تھا کہ آج بھی لکڑی کے پہیوں والی گاڑی شور مچاتی ان گول پتھروں پر سے گزرتی ہے جو ایک ہزار برس پہلے عربوں نے ترتیب سے جوڑے تھے۔ دیدہ زیب پل' دریا کے دونوں کناروں کو ملاتے تھے' سب سے بڑا پل وادی الکبیر کی حد سیلاب سے بلند' دعوتِ فکر دیتا ہے۔

قرطبہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے۔ لیکن وضع قطع کے لحاظ سے اس میں ایک جاذبیت ہے' امرا کے مکانات جیسے مشرقی طرز کی ڈیوڑھی دار حویلیاں' اندر سنگِ مرمر کا صحن اور فوارہ' اردگرد بیل بوٹے' باہر صیقل شدہ جنگلا' مکان مکینوں کی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک چوک سے دوسرے چوک تک' عرب کوچوں کے پیچ و خم' فواروں سے آراستہ چھوٹے چھوٹے دلآویز چوک' فضا میں شگوفوں کی مہک تھی' گھروں اور کوچوں کے درمیان گلاب اور حنا کے چمن تھے۔ پھول دار بیلیں' دو منزلہ مکانوں پر چڑھ گئی تھیں۔ منظر کی رنگینی میں کچھ کمی تھی تو وہ پھولوں سے لدی پھندی ٹوکریوں نے پوری کر دی اور جو شہ نشینوں میں لٹک رہی تھیں۔

قرطبہ کے بھرے بازاروں میں سیاہ فام حبشی' گندمی رنگ بربر' عرب علما اور امرا'

ملکوں ملکوں کے تجار' شاہی محلوں کے پاسبان اور عقب میں کاریگر اور مزدور قافلہ بن کر گزر گئے۔ آج سوادِ شہر میں بگولے اٹھتے ہیں جیسے شوکتِ پارینہ کا ماتم کر رہے ہوں۔

مسجد اس "عروس البلاد" کا دل تھی۔ اندر قدم دھرتے ہی اس کی عظمت نقشِ دل پہ ثبت ہو جاتا ہے۔ لاتعداد ستون اور محراب' حجم اور پائیداری کا تأثر دیتے ہیں۔ ان کے حسنِ ترتیب سے مسجد کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ وسعت کا تقاضا تھا کہ مسجد بلند بام ہو۔ اونچی چھت اور ستونوں کی کثرت سے بے پایاں کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ مسجد کی خوبصورتی اس کی سادگی اور پہنائی میں نہاں ہے۔ اطراف میں نظر بے محابا دوڑتی ہے۔ سنگِ یشب' سنگِ موسیٰ اور سنگِ سرخ کے ستونوں کی طویل روشیں' ملگجے سایوں میں کھو جاتی ہیں' چار سو ایک حسیں جھٹپٹا ہے۔ انجانے گوشوں سے چھنتی ہوئی روشنی منظر کو لطیف نورانی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ ستونوں سے ابھرتی ہوئی دوہری محرابیں چھت کو سہارا دیے ہیں۔ محرابوں پر قرمزی اور پیلی دھاریوں کی وہ فراوانی ہے کہ نظر اچٹتی چلی جاتی ہے۔ اور ایک نکتے پر ٹھہرنے نہیں پاتی۔ اس سے عمق کا دلکش تأثر ملتا ہے۔ چار سو ستون گرا کر شمالاً جنوباً کلیسا بنا دیے گئے ہیں۔ لیکن کلیساؤں کی بے جا مداخلت بھی اس طلسم کو نہیں توڑ سکی جو بے کراں فراخی سے پیدا ہوتا ہے۔

مسجد کی وجاہت لازوال ہے۔ انسان اندرونی حصے کی زیبائی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ امتدادِ وقت نے بہت سے نقش و نگار مٹا ڈالے۔ دولت قرطبہ برباد ہوئی تو مسجد کے ستون اور چاندی کے جھاڑ گرجوں کی زینت ہوئے۔ آبنوس اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا بیش بہا منبر پارہ پارہ کر دیا گیا۔ لیکن پتھر میں ترشے ہوئے ڈیزائن اور شیشے کی پھول پتیاں پرانی آب و تب کی یاد دلاتی ہیں۔

ہسپانیہ میں اموی سلطنت کے بانی عبدالرحمٰن اول نے آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ مسجد تعمیر کی۔ المنصور اور دیگر حکمرانوں نے گراں قدر اضافے کیے۔ رمضان کی راتوں میں مسجد اسلام کی عظمت کا مظہر ہوتی۔ پیتل کے شمعدانوں میں اَن گنت بتیاں جگمگاتیں' دین کے متوالوں سے صحن اور دالان پُر ہوتے۔ تسبیح و تراویح کے ترنم اور عنبر کی خوشبو سے فضا مہک اٹھتی۔

نصرانی ہونے کے باوجود اہل قرطبہ نے کلیسا بنانے کی مخالفت کی تھی۔ وہ آخر دم تک

کہتے رہے کہ کلیسا کی تعمیر سے مسجد کی خوبصورتی تباہ ہو جائے گی' لیکن آرچ بشپ نے ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ دو برس بعد آرچ بشپ وہاں سے گذرا تو اسے پہلی مرتبہ مسجد دیکھنے کا اتفاق ہوا' اپنے کیے پر متاسف ہوا اور اس نے کہا ''اگر مجھے معلوم ہوتا مسجد اتنی جمیل ہے' تو کبھی کلیسا کی تعمیر کا حکم نہ دیتا۔'' یہ بات قرطبہ کے میونسپل ہال میں ایک دستاویز کی شکل میں محفوظ ہے۔ ہمارے راہبر نے کہا ''مسجد کے بیچ کلیساؤں کی تعمیر افسوس ناک ہے' لیکن مجھے یہ سوچ کر ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ اگر یہ کلیسا نہ ہوتے تو شاید اس مسجد کا بھی وہی حشر ہوتا جو قرطبہ میں چھ سو مساجد اور سات سو حماموں کا ہوا' یعنی ڈھونڈے سے بھی اس کا نشان نہ ملتا۔''

حاکمِ وقت ابنِ ابی عامر المنصور نے مسجد کی توسیع کی تو عام مزدور کی طرح ٹوکری ڈھوئی اور کدال لے کر کھدائی کی۔ المنصور جس نے بے شمار جنگیں لڑیں لیکن کبھی شکست نہیں کھائی' جو شوقِ شہادت میں ہر جنگ میں کفن ساتھ رکھتا تھا۔ چشمِ تصور نے دیکھا کہ عمامہ باندھے عربی شہسوار اپنی آرام گاہوں سے نکل کر کہہ رہے ہیں ''باری تعالیٰ تو نے اپنے دیوانوں کو دیکھا' جہاں ایک ستون تھا ہم نے دس نصب کیے۔ دراز قامت' مجلّا ستون' قطار اندر قطار اور ان پہ سایہ افگن رنگین مرمر دنیا کے مختلف حصوں سے لایا گیا۔ سلاطین قسطنطنیہ اور روم نے ستونوں کے تحائف بھیجے۔ آبنوس افریقہ سے' خوشبودار لکڑی شرق سے' سونے کے جانور' مطلّا ہال کمرے' سالم سنگ سماق سے ترشا ہوا پارے سے لبریز حوض' اپنے عروج پر قصرِ زہرا دنیا کے نوادر سے بھرپور تھا۔ یہیں سفیر باریاب ہوتے اور خلیفہ صوبائی حکام کی رپورٹیں سنتے۔

شہر تین مدارج پر بنا تھا۔ شاہی محل بلندی پر تھا' اس کے قرب و جوار میں امرا کی رہائش گاہیں تھیں' نچلے درجے میں چمن اور باغات تھے اور زیریں حصے میں دفاتر اور شاگرد پیشہ دارالحکومت کے لیے شہری منصوبہ بندی کا شاید یہ پہلا منصوبہ تھا۔ یوں یہ شہر کینبرا اور برازیلا کا پیش رو تھا۔ مدینتہ الزہرا کی زندگی مختصر تھی' اس کی تکمیل چالیس برس میں ہوئی۔ پچاس برس بعد یہ مشقت' فتنہ کی نذر ہو گئی۔ اس دلھن کا سہاگ بربروں کے ہاتھوں لٹا تھا۔ تہذیب و تمدن سے ناآشنا افریقی سپاہی ایک سیلاب کی طرح اس حسین مرقع پر ٹوٹ پڑے اور وحشیانہ تنفر کے ساتھ آرائش و زیبائش کی دھجیاں اڑا دیں۔ پھر اس لٹے ہوئے شہر کو دیا سلائی دکھا دی۔ آج مختلف

سطحوں پر گھاس کے تین قطعے باقی ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس !

(دَرِ دل کُشا)

سوالات

۱۔ اُندُلس کی فضاؤں کو افسردہ دیکھ کر لین پول نے کیا لکھا تھا؟

۲۔ عربوں نے اندلس میں پہلی بار کیا کیا فصلیں کاشت کیں ؟

۳۔ قرطبہ کا شہر مغرب میں ایک طویل عرصے تک "عروس البلاد" کیسے بنا رہا؟

۴۔ مسجد قرطبہ کی شان و شوکت اور عظمت کے متعلق مصنف نے جو تأثرات بیان کیے ہیں انھیں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۵۔ اندلس مسلمانوں کے تمدنی عروج کی داستان کا نام ہے اور پھر یہی زوال کا ثبوت بھی۔ اس سفرنامہ میں لکھنے والا ہمیں اس فرق کا احساس دلاتا ہے۔ اپنے تاثرات بیان کیجیے۔

۶۔ اس اقتباس کے حوالے سے شہر قرطبہ اور مسجد قرطبہ پر ایک مضمون لکھیے۔

——— ○○○ ———
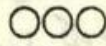
مکتوب نگاری

کسی ادبی یا تاریخی شخصیت کے متعلق مختلف ذرائع سے معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مورخ اپنے انداز میں معلومات مہیا کرتا ہے اور ایک سوانح نگار اپنے طور پر اپنے مشاہدات اور تجربے کی روشنی میں زیر موضوع شخصیت کے ہر گوشہ زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت سے زیادہ قریب خود نوشت سوانح ہے کیونکہ کوئی شخص جتنا اپنے متعلق بہتر جانتا ہے کسی دوسرے سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بہت ہی حقیقت پسندانہ انداز میں شخصیت کی تصویر کشی کے باوجود بھی زیر بحث شخصیت کے کچھ گوشوں کی جان بوجھ کر اس خیال سے کہ کل یہ تحریریں لوگوں کے زیرِ مطالعہ ہوں گی' پردہ داری کی جاتی ہے۔ خطوط ایسا ذریعہ ہیں جن سے لوگوں کے متعلق ذاتی 'شخصی اور انفرادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

خطوط لکھتے وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ تحریریں عام لوگوں کے مطالعہ میں آئیں گی۔ مکتوب الیہ اس کے قریبی عزیز' بے تکلف دوست' رفیق و آشنا لوگ ہوتے ہیں جو بہت حد تک لکھنے والے کی شخصیت میں موجود عیب صواب سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے مکتوب نگار عموماً" بے دھڑک' بے تکلفانہ اور بغیر کسی حجاب کے اپنے متعلق جو چاہتا اور محسوس کرتا ہے' سپرد قلم کر دیتا ہے۔ اس طرح اس شخصیت کا مکمل اور صحیح ترین مرقع سامنے آتا ہے۔ اس سے ذہنوں میں اس کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خط لکھا تو اس لیے جاتا ہے کہ وہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک امانت ہوتا ہے۔ لیکن بعض عظیم لوگوں کی نجی تحریریں بھی اپنی زبان 'اسلوب بیان اور تخیل کی بلندی کے باعث ان کی ذاتی نہیں رہتیں بلکہ ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ نہ صرف گوشہ نشینی میں زندگی نہیں گزارتے بلکہ اپنی زندگی و ماحول کے ترجمان ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی کا مطالعہ ایک عہد اور ماحول کا مطالعہ کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔

مکتوب کا اسلوب خط لکھنے والے کی ذات کا غماز ہوتا ہے اور اپنی راہیں خود متعین کرتا ہے اور اس سلسلے میں اس کے شعور و آگہی اس کی راہنمائی کرتے ہیں اور وہ اپنے دور کی روش کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اس کی تحریر خود ایک نئی طرز کی موجد ہوتی ہے اور بعض اوقات تو اس دور کی پوری نثر نگاری کو متاثر کرتی اور ایک نئے رخ کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اس طرح یہ انفرادی انداز اجتماعی اسلوب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ غالب کی خطوط نگاری۔ غالب سے پہلے فارسی انشاء پردازی کے تتبع میں سادہ انداز کی بجائے پر تکلف انداز رواج پا گیا تھا۔ دوسرا طریقہ جو سادہ تھا اور جسے فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں نے رائج کیا' مرزا غالب کے خطوط میں ان دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس اسلوب کو انھوں نے اپنی شخصیت کا آئینہ بنا دیا۔ ان کی شاعری سے ان کی شخصیت کے صرف چند پہلو نمایاں ہوتے ہیں 'مگر خطوط کے ذریعے ان کی شخصیت کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔

بڑی شخصیتیں چاہے وہ ادبی دنیا سے متعلق ہوں یا سیاست و معاشرت کے مردِ میدان ہوں' ان کو جاننا اور سمجھنا بھی قوم کی ذہنی تربیت کے لیے ازحد ضروری ہوتا ہے۔ جن شخصیات کی پبلک زندگی سے ہم واقف ہوتے ہیں، ان کی نجی زندگی بھی ہمارے لیے بڑی کشش رکھتی ہے۔ جو باتیں عام مجالس میں نہ کہی جا سکیں' خطوط ان گوشوں پر بھی روشنی ڈال دیتے ہیں۔ تاریخ کی بہت سی جزئیات اور شخصی تاثرات خطوں کے ذریعے ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ جہاں لکھنے والے کی زندگی کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے' وہاں پورے معاشرے کا ذہن ہمارے لیے ایک واضح حقیقت کی مانند ہو جاتا ہے۔

کسی نثرپارے اور خاص کر اچھے مکتوب کی خوبی یہ ہے کہ اس کی تحریر سادہ ہونے کے باوجود لطیف اور دلکش بھی ہو۔ بیان میں سادگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہنے والا پوری دیانت داری اور خلوص سے ہر بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہے۔ اس طرح خطوط نگاری بول چال کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ اس انداز کو اپنانے میں مرزا غالب سب سے اول نظر آتے ہیں۔ وہ خود مرزا حاتم علی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" اسی طرح نواب انور الدولہ کو خط لکھتے ہیں: "پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔"

بڑی بڑی سیاسی و ادبی شخصیات کے خطوط چونکہ اس دور کی سیاست' معاشرت اور اردگرد کے ماحول کے بھرپور عکاس ہوتے ہیں' اس لیے بعد میں آنے والے وقتوں میں یہی مکاتیب ایک مستند تاریخی دستاویزات ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے متعلق مختلف لوگوں کے خطوط سے جو معلومات ملی ہیں انھیں بعد میں آنے والے مؤرخین نے ایک ادبی سرمائے کے ساتھ ساتھ گراں قدر تاریخی دستاویز کا درجہ دے کر آنکھوں سے لگایا۔ مرزا غالب دلی کی ویرانی کے بارے میں ایک خط میں تشویش کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: "گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے ہیں۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں ——— دیکھیے انجام کا کیا ہوتا ہے۔"

مکتوب نگاری بھی اب ادب کی تسلیم شدہ صنف شمار ہونے لگی ہے اور یہ صنفِ ادب دوسرے ادب پر اس قدر اثرانداز ہوئی ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور موجودہ صدی میں اردو نثر کی جو اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے بغور مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان پر غالب کے مکاتیب "اردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" کی گہری چھاپ ہے۔ بالخصوص جہاں تک مکاتیبی ادب کا تعلق ہے' اس میں بھی غالب کا رنگ و آہنگ جھلکتا ہے۔ مولانا حالی' محمد حسین آزاد' شبلی نعمانی کے مجموعۂ خطوط "مکاتیبِ شبلی" (دو جلدیں) جسے سید سلیمان ندوی نے مرتب کیا۔ یا سلیمان ندوی کے خطوط کا مجموعہ جسے عبدالماجد دریا بادی نے مرتب کیا اور علامہ اقبالؒ کے مکاتیب "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" اور دوسرے بے شمار مجموعوں میں خطوطِ غالب کا تاثر واضح دیکھا جا سکتا ہے۔

بہر حال ادبا اور شعرا کی مشترکہ کوششوں کے سبب آج مکتوب نگاری ادب کی ایک تسلیم شدہ صنف شمار کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکیٹ میں نامور ادیبوں اور شاعروں کے خطوط مجموعوں کی شکل میں دستیاب ہیں۔ اور انتہائی ذوق شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ حالی ' آزاد ' شبلی ' سرسید ' نذیر احمد ' اقبال ' اکبر ' امیر مینائی ' عبدالماجد دریا بادی ' سید سلیمان ندوی اور پطرس بخاری کے بیشتر خطوط کتابی صورت میں شائع ہو کر منظرعام پر آ چکے ہیں۔ جن کے مطالعے سے اس دور کی طرز زندگی 'تاریخ اور سماجی حالات کی تصویر سامنے آ جاتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ مکاتیب 'مکتوب نگار ' شاعروں ' ادیبوں یا سیاسی راہنماؤں کی خود نوشت سوانح عمریاں ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں ادب جن نشیب و فراز سے دو چار رہا' دنیائے ادب میں جو تعمیری و مثبت کام ہوئے مکاتیب ان سے متعلق ایک زندہ و جیتی جاگتی دستاویزات کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس طرح مکتوب نگاری سے مستقبل کے ادیبوں کو فکر و عمل کی ایک نئی راہ ملی ہے۔ قلم کو تحریک اور مشاہدے کو مضبوط بنیاد فراہم ہوئی ہے۔ اسی لیے اردو ادب کو باقاعدہ طور پر سمجھنے کے لیے مکاتیب کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے مطالعے کے بغیر بے شمار باتیں وضاحت طلب رہ جاتی ہیں اور آگے کا راستہ دشوار اور منزلِ مقصود موہوم ہو جاتی ہے۔

—— ooo ——

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

(۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

اسد اللہ خاں نام ؛ گھر پر "مرزا نوشہ" پکارے جاتے تھے۔ پہلے "اسد" تخلص کیا پھر "غالب"۔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ نسلاً ایک ترک تھے۔ والد عبداللہ بیگ سپاہی پیشہ تھے۔ غالب پانچ برس کے تھے کہ وہ ایک معرکے میں مارے گئے۔ غالب کی پرورش ان کے چچا نے سنبھالی لیکن چار سال بعد وہ بھی وفات پا گئے اور غالب اپنے نانا کی نگرانی میں آ گئے۔ عنفوانِ شباب بڑی بے فکری میں گزرا۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی ہوگئی اور یہ دلی میں رہنے لگے۔

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے اور اپنی فارسی شاعری پر فخر کرتے تھے۔ ابتدا میں خط بھی فارسی میں لکھتے تھے لیکن بعد میں کچھ تو اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور کچھ اپنی جدت پسندی کے باعث اردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بہت سے خط لکھے جن کے مجموعے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ کے نام سے ان کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے۔ بعد میں دو اور مجموعے "مکاتیب غالب" اور "نادرات غالب" کے نام سے شائع ہوئے۔ غالب کی دیگر کتابوں میں ان کے اردو اور فارسی کے دیوان 'ابتدائی دیوان "نسخہ حمیدیہ" اور کچھ فارسی نثر اور تاریخ کی کتابیں شامل ہیں۔

غالب اپنے عہد اور زمانے کی ایک نابغہ شخصیت تھے۔ جو اپنے دَور کے علمی و ادبی کمالات اور روایات کی عکاسی کرتی تھی۔ یہی شخصیت 'اپنے تمام تر رچاؤ اور وسعت کے ساتھ ان کے خطوط میں بھی جھلکتی ہے۔ ان کے خطوط کی اہم خصوصیت ان کا اسلوب بیان اور زبان ہے۔ ان کے خطوط بے ساختگی ' بے تکلفی ' طنز و ظرافت اور تازگی و شوخی کے عناصر سے بھرپور ہیں۔ ان کی زبان سادہ ' پرکار اور جوش و ولولے سے لبریز ہے۔ جس میں کہیں کہیں مشکل الفاظ و تراکیب بھی آتی ہیں لیکن وہ بھی غالب کی علمیت 'ظرافت اور جدت پسندی کی جھلک کے طور پر۔ ان کے خطوط کی زبان و بیان کی روانی بے مثال ہے۔ غالب ان میں اکثر و بیشتر مکالمہ اور قافیہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس سے تصنع کی بجائے بے ساختگی اور ظرافت کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو بے تکلف دوست ' عالم ' فاضل ' دنیا اور اس کے معاملات پر گہری نظر رکھنے والے آمنے سامنے بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ لیکن اس بے تکلفی و سادگی کے باوجود ان خطوط میں علمی و ادبی شان پائی جاتی ہے۔ ان خطوط میں غالب کی شخصیت اپنی پوری علمیت 'انسانیت اور شعریت کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

مکاتیبِ غالب

(۱)

بنام علاء الدین احمد خاں علائی

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا ہے۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بد تر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے' ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں' میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی' جس میں میر حسن رہتے تھے' اپنی پھوپی کے رہنے کو' اور کوٹھی میں وہ بالا خانہ مع دالان زیریں' جو الٰہی بخش مرحوم کا مسکن تھا' میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائے گی' مرمت ہو جائے گی' پھر صاحب اور ہم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان' میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔

صبح یک شنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۴   غالب

(۲)

بنام منشی ہرگوپال میرزا تفتہ

لو صاحب!

کھچڑی کھائی' دن بہلائے
کپڑے پھاٹے گھر کو آئے

۸ جنوری ماہ سالِ حال، دو شنبہ کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامینِ درد ناک سے بھرا ہوا رام پور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور[۱] صاحب کے ہاں پڑا رہا۔

---

[۱] مراد محمد حسن خاں بہادر

انھوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت کی۔

کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا' جس کو اتار کر پھینکو گے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارہ نہ ہو گا۔ سختی و سستی' رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہ ہر صورت گزرنے دو۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس خط کی رسید کا طالب' غالب

(۳)

بنام میر مہدی حسین مجروح

جانِ غالب!

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔

"ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے"[1]

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا؟

اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی:

"میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے"

ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں' یا خاکی[2] ہیں' یا پنجابی ہیں' یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا' ریاست تو جاتی رہی' باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

خس کی ٹٹی' پُروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا' اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے' بہ ہر حال مے گزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں'

۱۔ پیش مصرع ہے "نہیں لیتا ہوں فرطِ رشک سے نام"
۲۔ فوجی

بند ہو گیا۔ "لال ڈگی" کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر! کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا ' راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک ' بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکاں ہو جائے۔

یاد کرو ' مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا' اب وہ باغیچہ صحن کے برابر ہو گیا' یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں' باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو ' اب آہنی سڑک[1] کے واسطے کلکتہ دروازہ' سے کابلی دروازہ' تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ' دھوبی واڑہ ' رام جی گنج' سعادت خاں کا کٹرہ' جرنیل بی بی کی حویلی ' رام جی داس گودام والے کے مکانات ' صاحب رام کا باغ' حویلی ' ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر' شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا ' صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ ' اللہ ' دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندہ خدا ' اردو بازار نہ رہا' اردو کہاں دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے' کیمپ[2] ہے' چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ' نہ شہر' نہ بازار' نہ نہر۔

الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام! الگزنڈر ہڈرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت[3] نہیں۔ ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیرالدین کو دعا۔

جون (۱۸۶۰)

(غالب)

۱۔ مراد ریلوے لائن۔

۲۔ Camp

۳۔ اردوئے معلیٰ: "مصاحت"

(۴)

بنام میر مہدی حسین مجروح

سید صاحب!

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں' اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال ہے کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے' دوست ہوں' عاشقِ زار نہیں۔ بندۂ مہر و وفا ہوں' گرفتار نہیں۔ تمہارے بھائی نے مشوّش بلکہ لغل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آوں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں' وہ آئیں گے تو یہیں ان کو دوں گا۔ محرم تمام ہوا' آج سہ شنبہ غرہ صفر ہے' حضرت کا پتہ نہیں۔ ظاہرا برسات نے آنے نہ دیا۔ برسات کا نام آگیا' سو پہلے مجملا" سنو:

ایک غدر کالوں کا' ایک ہنگامہ گوروں کا' ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا' ایک آفت وبا کی' ایک مصیبت کال کی' اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا' ہزارہا مکان گر گئے' سیکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر' وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا' اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پَن کال ہے' پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا' وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جنابِ میرن کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

سہ شنبہ یکم صفر ۱۲۷۹ھ۔

۲۹۔ جولائی ۱۸۶۲ء

غالب

(۵)

بنام مجتہد العصر میر سرفراز حسین

نورِ چشم، راحتِ جاں، میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمھارے دستخطی نے میرے ساتھ وہ کیا، جو بوئے پیرہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تو بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی بھلا جلا بھنا کہتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گئے ہیں۔ اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟ سنو غالب، رونا پیٹنا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔ کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے، کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا۔ میں نے ان کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے۔ اگر بھول نہ جائیں گے، پہنچائیں گے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ صاحب اِبن نہیں ہے، نہ ہو، غلام اشرف نہیں ہے، نہ ہو، اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں، ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع:

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

تم سے کب انکار کرتا ہوں۔ اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو، تو خوش، اگر غلام اشرف مانو تو راضی، رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ، دن کو مجھ سے جی بہلاؤ۔ قصہ مختصر آؤ اور جلدی آؤ۔

سید، الور کا جو حال لکھتے ہو، وہ سچ ہے۔ راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں، مگر مہاراجا مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر وہاں آتے ہیں۔ کیا مجمع برخواست ہوا ہے! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے! تم اس جرگے سے جدا ہو تم کو کیا اندیشہ ہے؟ میر قربان علی صاحب جیسا لکھیں، ویسا کرو۔ میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے، مجھ کو دعا بھی نہ لکھی۔

بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیرالدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے۔ اب میں نہیں جانتا۔ یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیار ہے۔ دعا سلام کی حاجت کیا؟ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ کس کا خط ہے؟

سوالات

۱۔ غالب کے خطوں نے جدید اردو نثر کے نقوش مرتب کیے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

۲۔ غالب کے خط ان کی نجی زندگی کی دستاویز ہیں۔ کیا آپ متفق ہیں۔

۳۔ غالب نے جس طرح کے خط لکھے۔ ان کے سامنے ویسا کوئی نمونہ نہ تھا۔ کیا ان کی جدتِ طبع نے انھیں یہ راستہ دکھایا؟

—— ○○○ ——
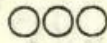
مولانا شبلی نعمانی[1]

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

مولانا شبلی کی مکتوب نگاری

تاریخ کی بڑی بڑی شخصیات کے حالاتِ زندگی، ان کی سوانح عمریوں، خاکوں اور حتیٰ کہ ان کی خود نوشتوں کی نسبت ان کے ذاتی اور نجی خطوط کے مجموعوں سے زیادہ بہتر طور پر معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ان کے مکتوب الیہ ان کے رشتہ دار، عزیز اور محرم دوست ہوتے ہیں جن سے وہ کوئی حجاب محسوس نہ کرتے ہوئے سادگی اور بے تکلفی سے اپنا ہر حال اور خیال حوالہ قلم کر جاتے ہیں۔ اس طرح ان خطوط سے ان شخصیتوں کی جو تصویر قاری کے ذہن میں ابھرتی ہے وہ بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ زیرِ مطالعہ شخصیت درحقیقت تھی۔

مولانا شبلی کے زمانے میں شرفا کی مراسلت کی زبان فارسی تھی چنانچہ ان کے علی گڑھ جانے سے پہلے یعنی ۱۸۸۲ء تک کے تمام خطوط فارسی زبان میں ہی ہیں تاہم یہاں بھی ان کو جن کی نسبت معلوم تھا کہ ان کو فارسی سے ذوق ہے انھیں فارسی زبان میں ہی خط لکھتے تھے۔ فارسی خطوط اکثر قلم برداشتہ ہی لکھتے تھے۔ ان خطوط کی زبان رواں، بامحاورہ، عبارت مقفیٰ لیکن بے تکلف ہے۔ مولانا کی نظر میں اپنے اردو خطوط کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی اسی لیے انھیں جمع یا محفوظ کرنے کا انھیں کبھی خیال نہ آیا البتہ فارسی خطوط انھیں عزیز تھے اور انھیں جمع بھی کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ایک عزیز دوست جس نے اردو خطوط کے جمع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، آپ نے فرمایا تھا: "میرے خطوط بالکل بے مزہ ہوتے ہیں ان کو کیا جمع کرتے ہو؟ مجھے جو مزہ نہیں آیا، اوروں کو کیا آئے گا۔" حالانکہ ان کی مستقل تصنیفات کے مقابلے میں ان کے اردو خطوط بھی کچھ کم دلچسپ اور غیر اہم نہیں ہیں۔

مولانا اردو، فارسی کے علاوہ عربی میں بھی خط لکھتے تھے۔ علمائے مصر کے نام تمام خطوط عربی میں ہی ہیں۔ آپ خطوط نہایت مختصر لکھتے تھے۔ بعض اوقات تو صرف "ہاں" اور "ناں" پر ہی اکتفا کر جاتے اور مفصل و طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقروں میں ہی مناسب سمجھتے۔ اسی لیے بعض لوگ آپ کے خطوط کو "تار" کہتے تھے۔ صرف مختصر نویسی ہی نہ تھی بلکہ اختصار الفاظ کے ساتھ معانی میں پوری وسعت موجود ہوتی ہے اور یہی خوبی مولانا کی انشاء پردازی اور بلاغت کی جان ہے۔ خط لکھتے وقت آداب و القاب کا خاص اہتمام نہیں کرتے اور بلاتمہید، مطلب بیان کر دیتے ہیں۔ خط کا جواب بڑی پابندی سے دیتے بلکہ اکثر اسی دن لکھتے تھے۔ شبلی ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آتے ہیں۔ عبدالماجد دریا بادی جیسے دوست سے مغربیات کی باتیں، مہدی حسن (مصنف دائرہ ادبیہ سے محاسنِ ادبی اور لطائفِ شعری پر گل فشانیاں ہیں اور مولانا حمید الدین صاحب کے خطوط میں تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں۔

---

[1] مولانا شبلی کے سوانحی حالات کے لیے صفحہ نمبر ۸۷ دیکھیے۔

آپ کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے آپ کے خطوط "مکاتیب شبلی" کے نام سے دو جلدوں میں جمع کر کے شائع کیے۔

مکاتیبِ شبلی

(۱)

بنام سید سلیمان ندوی

برادرم!

مجھ کو معلوم نہ تھا کہ تم پونا آگئے' یہاں نہایت سکون سے کام ہو رہا ہے۔ ہندوستان[1] میں تمام وقت رائگاں گیا۔ اب تو کام پورا کر کے یہاں سے نکلوں گا' نہایت قابلِ مسرت اکتشافات ہوئے۔ خیبر وغیرہ کی نسبت قطعی ثابت ہوا کہ یہودیوں نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ اور تیاریاں کر لی تھیں اور امدادی قبائل خیبر میں پہنچ چکے تھے۔ اور بہت سے اہم امور ہیں' ترتیبِ کتاب بھی اب جا کر طے ہوئی۔

اچھا تو یہ خاص کام ذاتی کام ہے 'ندوۃ تو سرِدست گیا' اب کیا کرنا چاہیے۔ آزاد[2] سے مشورہ ہوا۔ رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے' اس لیے میں خود دو چار قابل طلبہ اپنے پاس رکھوں اور ان کو کسی فن میں تیار کروں اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے۔ ان کے مصارف کا "تکفل بھی' (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہو گا۔ اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو۔ نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہیے۔ اس میں کچھ ماہوار تم بھی دو۔

میاں حمید الہ آباد جا رہے ہیں۔ چارج دے چکے 'شاید بمبئی ہوتے جائیں' اب کی مولوی سید علی اور شبلی متعلم بھی اسٹرائیک کے جرم میں نکالے جانے والے ہیں۔

کر دیا سفاک نے میدان صاف

ایک اسکیم حسب رائے مذکورہ بالا تیار کرو' اور اس کے کام ہم لوگوں میں تقسیم کر لیے جائیں۔ ایک حصہ میاں حمید کے ذمہ بھی ہو گا۔

شبلی

(بمبئی ۲۱ جون ۱۹۱۴ء)

۱۔ یہ خط طلبہ ندوۃ کی اسٹرائیک اور دہلی میں حاذق الملک حکیم اجمل خان کی کوشش سے جو ندوۃ کا اصلاحی جلسہ اس زمانے میں ہونے والا تھا' اس کے متعلق ہے۔

۲۔ مولوی ابوالکلام آزاد۔

(۲)

بنام مولوی محمد ریاض حسن خاں صاحب
المتخلص بہ خیال و دانش رئیس رسول پور، ضلع میر پور

پالن جی ہوٹل، بمبئی

جنابِ من! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

سیرتِ نبویؐ جو زیرِ تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آں حضرتؐ کے متعلق لکھا ہے، اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسبِ موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔ اس بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں، جو آں حضرتؐ کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں، لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے، اس لیے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو، ان کے پاس ایک ایک کتاب بھیج دی جائے، وہ مطالعہ فرما کر قابلِ ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے، اس بنا پر آپ سے درخواست ہے کہ کیا آپ بھی اس کام میں حصہ لینا پسند فرمائیں گے۔

شبلی نعمانی

سوالات

۱۔ علامہ شبلی کے نزدیک قابل افراد کی تیاری کیسے ممکن ہے۔ ان کے خط بنام سید سلیمان ندوی کے حوالے سے تحریر کریں۔

۲۔ شبلی نے اپنے خط میں یورپی مصنفین کی سیرۃ النبیؐ کے سلسلے میں بددیانتیوں کا کیا حل تجویز کیا ہے۔ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ شامل کتاب خطوط کے حوالے سے علامہ شبلی کی شخصیت کی کن خوبیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مختصر طور پر بیان کریں۔

——— ○○○ ———

علامہ اقبالؒ رح

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

علامہ اقبالؒ [۱] (مکتوب نگاری)

غالب کے بعد علامہ محمد اقبال اردو کے دوسرے عظیم اور اہم شاعر ہیں جن کی مقبولیت ہمہ گیر ہے اور ان کے بارے میں ذرہ ذرہ سی تفصیل کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ علامہ کے مکتوب الیہم کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد سے ان کے ذاتی خادم علی بخش تک بے شمار شخصیات' معاصرین' رشتہ دار' مداحین' سیاسی راہنما' اخبار نویس' علما' شعرا اور اہلِ خانقاہ سب شامل ہیں۔

علامہ اقبال صرف اردو ہی میں خط نہیں لکھتے تھے۔ ان کے بہت سے خطوط انگریزی میں بھی ہیں اور چند خطوط جرمن' عربی اور فارسی میں بھی ملتے ہیں۔ علامہ اقبال خط کا جواب لکھنے میں بڑے مستعد تھے۔ فوراً جواب لکھتے۔ بیماری اور معذوری کے زمانے میں دوسروں سے لکھواتے تھے البتہ خط لکھنے میں ان کے ہاں کوئی خاص اہتمام یا تصنع نہیں تھا۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔ خطوط کی عبارت بھی عموماً بے تکلف ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں اور اس اختصار کے ساتھ بھی جامعیت ہوتی ہے۔ القاب وہ بہت مختصر اور مکتوب الیہ کے رتبے کی رعایت سے لکھتے ہیں۔

علامہ اقبال کے خطوط کے بہت سے مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے دس پندرہ خطوط اپنی کتاب "اتالیقِ خطوط نویسی" میں شائع کیے تھے' باقی مجموعے درج ذیل ہیں :

۱۔ "شاد اقبال" مرتّبہ ڈاکٹر محی الدین زور

۲۔ "اقبال کے خطوط جناح کے نام" مرتّبہ حمید اللہ ہاشمی

۳۔ "اقبال نامہ" "حصہ اول و دوم" مرتبہ شیخ محمد عطااللہ

۴۔ "اقبال از عطیہ بیگم" مرتبہ بشیر احمد ڈار

۵۔ "انوار اقبال" مرتبہ بشیر احمد ڈار

۶۔ "مکاتیب اقبال بنام گرامی" مرتبہ محمد عبداللہ قریشی

۷۔ "نوادر اقبال"

۸۔ "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی

۱۔ سوانحی تنقیدی خاکے کے لیے صفحہ نمبر ۲۵۰ ملاحظہ فرمائیں

مکاتیبِ اقبال (۱)

بنام مہاراجہ کشن پرشاد شاد (وزیرِ اعظم حیدر آباد دکن)

لاہور ۷ مارچ ۱۹۱۴ء

سرکار والاتبار، تسلیم

شاد کا نقش اقبال کے دل سے محو ہو یہ کیوں کر ممکن ہے۔ ایام میں ایک وصف دیرینہ سازی کا ہے۔ یعنی زمانہ ابتدا و انتہا کی قیود سے آزاد ہے۔ اشیا کو اپنے ہاتھ کے لمس سے پرانا کر دیتا ہے۔ بحمد اللہ کہ دل اس اثر سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر شاد کی یاد ہمیشہ تازہ کیوں نہ رہے۔ اگرچہ خدا کے فضل و کرم سے بے نیاز دل رکھتا ہوں۔ مگر کبھی کبھی یہ دل بھی افکار دنیا سے عاجز آ ہی جاتا ہے اور علائق کی زنجیروں کی جھنکار بیرونی اشیا کی طرف سے اسے عارضی طور پر غافل کر دیتی ہے۔ کیا عرض کروں عرفی کا ایک مصرع میرے دل اور مجھ ایسے تمام دلوں کی کیفیت کا آئینہ ہے۔

؎ در تابم از شکنجہ طبع سلیم خویش

آنکھ نادیدنی نظارے دیکھتی ہے۔ طبعِ سلیم ان کی بے ہودگی سے گھبراتی ہے۔ لیکن ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں کہ ان نظاروں سے اپنے آپ کو اور اہلِ دنیا کو نجات دے سکے۔ سچ فرمایا مولانا اکبر نے :

؎ "بے دست و پا کو دیدہ بینا نہ چاہیے"

کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ آج آپ کا خط آیا تو مسرت کے ساتھ ندامت کا پیغام بھی لایا۔ ہاتھوں میں عمل کی قوت پیدا ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ چند سطور ہیں۔ سنا تھا کہ آپ لاہور تشریف لاتے ہیں۔ اپنے دوست نواب ذوالفقار علی خاں کے محل میں آپ کو ٹھہرانے کا فیصلہ بھی ان کے مشورے سے کر چکا تھا۔ مگر جب اراکین کھتری کانفرنس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ تشریف نہ لاویں گے۔ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

گزشتہ ایام میں جب آپ لاہور تشریف لائے تھے تو میرے وردِ زبان غالب مرحوم کا یہ

شعر رہا تھا :

تھی خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس دفعہ توقع تھی کہ کچھ نہ کچھ ارمان نکلیں گے، مگر آسمان شعرا کا پرانا دشمن ہے، اس کا کیا علاج۔ خیر آپ تشریف نہ لائے تو عشاق کی پرانی رسم یعنی "بخون و خاک غلطیدن" تو ادا ہو جائے گی۔ اور یہ تسلی مزید کہ پنجاب میں آپ کی یاد اقبال کے دل تک ہی محدود نہیں بلکہ سیکڑوں دل اس یاد سے سرمایہ اندوز ہیں۔ نہیں صاحب، ہمارے عشق میں رشک کو دخل نہیں۔ ہم رقیبوں سے دل بہلا لیا کرتے ہیں۔ اقبال آپ سے دور ہو یا نزدیک، خط لکھے یا نہ لکھے مگر اس کا دل ہمیشہ آپ کی یاد سے لبریز ہے اور رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو فراغِ خاطر اور اطمینانِ قلب نصیب کرے۔ میسر تو یہ چیزیں آسمان والوں کو بھی نہیں مگر دعا نہ کرنا سوئے ادب میں داخل ہے۔

"سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ، کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر

ذرا سا اک دل دیا تھا، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

آج کل شعرو شاعری کا شغل بھی کم ہے۔ "بھائی گدھا" یعنی پیٹ دم بھر کے لیے مہلت نہیں دیتا۔ "لاؤ چارا، لاؤ چارا" خدا اسے غارت کرے۔ مولانا اکبر کا خط کل آیا تھا، خیریت سے ہیں۔ ان کا دم بھی غنیمت ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ میں نے ان کے رنگ میں چند اشعار لکھے تھے مگر وہ بات کہاں۔ دو شعر عرض کرتا ہوں :

ـ شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں

مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے

ـ وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف

پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

فارسی مثنوی کے اشعار ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس مثنوی کو میں اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتا ہوں۔ میں مر جاؤں گا یہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔ ہنود کو مخاطب کر کے چند اشعار لکھے ہیں۔ اس کے بعد گنگا اور ہمالہ کی آپس میں گفتگو ہے۔ جو ہنوز ناتمام ہے۔ پھر عرض کروں گا۔ بہت

سا وقت آپ کا ضائع کیا، معاف فرمائیے۔

آپ کا مخلص نیاز مند

محمد اقبال، لاہور

(۲)

نواب بہادر یار جنگ کے نام

لاہور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب نواب صاحب۔ السلام علیکم

مظلومینِ کشمیر کی امداد کے لیے آپ سے درخواست کرنے کے لیے یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ اس وقت حکومت کی طرف سے ان پر متعدد مقدمات چل رہے ہیں جن کے اخراجات کی وجہ سے فنڈ کی نہایت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔ اس سے پہلے ایک خط مجھے ایک بزرگ محمد اعظم نامی نصیر والا عثمان آباد کی طرف سے آیا تھا۔ انھوں نے خود بھی چندہ کر کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا اور مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کی توجہ اس طرف منعطف کراؤں۔ مجھے یقین ہے کہ (آپ) مسلمانانِ کشمیر کو امداد کا مستحق تصور کرتے ہیں۔ یہ طباع اور ذہین قوم ایک مدت سے استبداد و ظلم کا شکار ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کا فرض ہے کہ ان کی موجودہ مشکلات میں ان کی مدد کی جائے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ یہ خط خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی معرفت آپ تک پہنچاتا ہوں۔ مجھے آپ کا ایڈریس معلوم نہ تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ میرا خط کسی اور طرف نہ چلا جائے۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۳)

عبدالماجد دریابادی کے نام

لاہور۔ ۵ جنوری ۱۹۳۰ء

مخدومی السلام علیکم!

آپ کا نوازش نامہ کل موصول ہوا جس کے لیے شکریہ قبول فرمائیے۔ میں بھی ایک ہفتہ کے لیے علی گڑھ گیا تھا۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوگی۔ آپ بھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف (اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں، مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام کے لیے تڑپ ہے لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔

لاہور کانگرس نے آزادی کامل کا اعلان کر دیا ہے۔ جماعتی اختلافات کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ دیکھیے ہندوؤں کا لبرل گروہ ان اختلافات کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ مسلمانوں میں آزادی کے لیے ایک ولولہ موجود ہے مگر

مشکل ایں نیست کہ بزم از سر ہنگامہ گزشت [۱]
مشکل ایں است کہ بے نُقل و ندیم اند ہمہ

مخلص (محمد اقبال)

سوالات

۱۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام خط کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کی مکتوب نگاری کی کن خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے۔ بیان کریں۔

۲۔ دوسرے خط کے حوالے سے مظلومین کشمیر کے متعلق علامہ اقبالؒ کے جذبات کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلام مخالف قوتوں کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

۱۔ ترجمہ: دشواری یہ نہیں ہے کہ محفل میں ہنگامہ نہیں رہا اصل مشکل یہ ہے کہ بزم میں کسی کے لیے نہ نقل (گزک) ہے نہ کوئی ندیم ہے!

سید سلیمان ندوی[1] (مکتوب نگاری)

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں بھی اس ہمہ جہت عالمانہ شخصیت کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اپنی تمام زندگی علم و ادب اور ملک و قوم کی خدمت میں بسر کی۔ یہ زندگی مسلسل عمل اور جہد سے عبارت تھی۔ لہٰذا ان کے خطوط میں بھی ان کی اسی زندگی کی ہمہ جہتی اور عمل و جہد کی مقصدیت حاوی ہے۔ ان کے مکتوبات میں باہمی تعلقات، نجی معاملات اور شخصیت کے ذاتی اور تخلی پہلو کم اور اجتماعی، مذہبی و معاشرتی مسائل اور قومی معاملات زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت کا رچاؤ اور ہمہ گیری ان میں جھلکتی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے خطوط کا مطالعہ ہمارے سامنے ہماری قومی زندگی کے ایک نہایت ہی پُر آشوب عہد کے ایسے پہلو بھی لاتا ہے جو بصورت دیگر ہم سے پوشیدہ رہتے اس طرح ان کے خطوط کا مطالعہ صرف ذاتی اور ادبی نکتہ نظر سے ہی نہیں قومی اور تاریخی حوالوں سے بھی بامعنی اور اہم ہے۔

سید سلیمان ندوی کے مکتوبات کے چار مجموعے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ "برید فرنگ" ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۲۰ء میں یورپ سے ہندوستان کے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو لکھے اور ان میں سیاسی پس منظر، یورپ کے حالات اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسرا "مکاتیب سید سلیمان ندوی" ہے جو مولانا مسعود عالم ندوی کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ سید عبدالماجد دریا بادی نے اپنے نام لکھے گئے خطوط کو "مکتوبات سبحانی" کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے خط "معارف" میں بھی شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکے۔

بنام مولانا عبدالماجد دریابادی

لندن۔ کرزن ہوٹل

۴ مارچ ۱۹۲۰ء

ولائتی مسافر کا سلام لیجیے

اٹلی، سوئٹزر لینڈ اور فرانس سے انگلینڈ ایک ہفتہ گزرا کہ ہمارا وفد پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ پیرس کچھ دن قیام ہو گا مگر پیرس پہنچ کر اخبارات سے معلوم ہوا کہ کل ہی شب کو ہاؤس آف کامن[2] میں مسئلہ ٹرکی پر بحث ہونے والی ہے۔ اس لیے دوسرے ہی دن جس طرح بنا بھاگ کر انگلینڈ پہنچے، جہاں آدھا مناظرہ ختم ہو چکا تھا۔ تمام ممبروں کی تقریریں تعصب سے لبریز تھیں۔ ہم

۱۔ سوانحی حالات کے لیے صفحہ نمبر ۱۸۔

۲۔ House of Common (ایوان عام)

مسلمانوں کو تو تعصب پر طعنہ دیا جاتا ہے مگر یہ کیا چیز ہے جو تمام یورپ میں نظر آ رہی ہے؟ روزانہ مشہور اخباروں کے نامہ نگار ملاقات کو آتے ہیں اور ہمارے مکالمہ اور پیغام کو شائع کر رہے ہیں۔ پرسوں شب کو پروفیسر آرنلڈ ملنے آئے، خاص طور سے دارالمصنفین اور سیرت کا تذکرہ کیا۔ دلچسپی لی۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں کے دکھانے کا وعدہ کیا۔ کل شب کو مسٹر فشر نے بحیثیت قائم مقام وزیر ہند (مانٹیگو صاحب آج کل نہیں ہیں) وفد کو باریاب کیا۔ مسٹر محمد علی اور سید حسین صاحب نے اپنے مطالبات نہایت دلیری اور صفائی سے پیش کیے۔ پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے مسئلہ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی مذہبی حیثیت ظاہر کرنے کی خاطر ان سے کہا کہ میں کوئی پولیٹیکل آدمی نہیں۔ مذہبی اور علمی آدمی ہوں اور علما کی جماعت کا قائم مقام ہوں۔ میرا اس وفد میں شامل ہو جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہم جن مطالبات کو پیش کرتے ہیں وہ سراسر مذہبی ہیں۔ فشر صاحب بڑے غور سے ایک ایک لفظ کو سن رہے تھے اور پھر نہایت متانت اور خندہ جبینی کے ساتھ جواب دیا کہ "ہم حتی الامکان مسلمانانِ ہند کے جذبات کا ضرور خیال رکھیں گے۔"

آج مورننگ پوسٹ میں ایک اطالین پروفیسر مشرقیات (رومن یونیورسٹی) کے حوالے سے "سلطان بحیثیت خلیفہ" ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ میں نے آج اس کا جواب لکھا ہے۔ دیکھیے کون سا اخبار چھاپے۔ کم بخت کہتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے خلافت دنیائے اسلام میں رہی ہی نہیں۔ "نیچر آف خلافت" ان کا ایک رسالہ ہے، جو اطالین وزارتِ خارجہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

یہاں کے مستشرقین میں پروفیسر براؤن ہمارے ساتھ ہیں۔ اور مارکولیوتھ مخالف۔ براؤن کو چار صفحوں کا عربی میں مسائل پر پھر ایک خط لکھا ہے اور ان سے تائید چاہی ہے۔ اپنی کتابیں بھی بھیجی ہیں۔ جواب آئے تو مطلع کروں گا۔ دیگر مستشرقین سے بھی اس سلسلہ میں خط کتابت کا ارادہ ہے۔ آج برٹش کانگریس کمیٹی کی طرف سے ہمارے فوٹو لیے جائیں گے۔ شام کو مصریوں کی طرف سے دعوت ہے۔ مسٹر امیر علی بھی اس مسئلہ میں اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بعض مسلمان انگریز ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ چار پانچ روز ہوئے انھوں نے وفد کو چائے کی دعوت دی تھی۔ اپنی کارگزاریاں بیان کیں۔ انھوں نے اپنا پروپیگنڈا اس طرح پھیلایا ہے کہ وہ تمام دنیائے عرب پر چھا گیا ہے۔ سردی بے حد ہے۔ معارف کا خدا حافظ

والسلام

سید سلیمان ندوی

سوالات

۱۔ جب زندگی ایک مقصد کی خاطر سنجیدگی سے وقف کر دی جائے، تو پھر نجی تحریریں بھی اسی طرح سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ کیا سید سلیمان ندوی کے زیر نظر خط سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے؟

۲۔ جہاں تک مسلمانوں کی بہتری کا سوال ہے، سید سلیمان ندوی اپنے استاد شبلی کی طرح ہی بے چین رہتے ہیں۔ کیا ان کے اس خط سے یہ اثر جھلکتا ہے؟

—— ○○○ ——

عبدالماجد دریا بادی

(۱۸۹۲ء - ۱۹۷۸ء)

مولانا عبدالماجد دریا بادی کا تعلق ایک معزز علمی خاندان سے تھا۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ جوانی ہی میں فلسفے کے فاضل مانے جاتے تھے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) میں مترجم فلسفہ رہے۔ جب آپ واپس لکھنؤ گئے تو باقاعدہ علمی تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا' ۱۹۲۵ء میں ایک ہفت روزہ (سچ) اور بعد میں (صدقِ جدیدہ) شائع کرتے رہے۔ ان کی ساری زندگی مذہبی و ملی شعاروں کی بے باک وکالت میں گذری۔ مولانا محمد علی جوہر کے خاص رفیقوں میں سے تھے۔ ان کی علمی تصانیف اردو ادب کے ذخیرے میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "نفسیاتِ عوام" انگلستان میں چھپی۔ دوسری اہم تصانیف فلسفہ جذبات ' "فلسفہ اجتماع" "مکالماتِ برکلے" (ترجمہ) "تاریخ اخلاقِ یورپ" (ترجمہ) "محمد علی جوہر" (سیرت) "حکیم الامت" (مولانا اشرف علی تھانوی) اردو اور انگریزی میں ان کی سب سے بڑھ کر دینی اور علمی خدمت قرآن مجید کا ترجمہ ہے یہ مختصر مگر محققانہ تفسیری' حواشی ہیں۔

عبدالماجد دریا بادی اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انھوں نے ادب کے ہر کوچے کی مسافت طے کی اور بالآخر مذہب کو اپنی منزل قرار دیا۔ بیسویں صدی میں بیک وقت ایسے متخالف و متضاد نظریات زندگی میں در آئے کہ ذہین انسان کا ان سے متاثر ہونا کوئی ایسی غیر فطری بات نہیں معلوم ہوتی تھی' خاص طور پر نفسیاتی موشگافیوں نے نئی نئی راہیں سجھائیں اور فلسفہ زندگی کی نئی نئی تعبیریں سامنے آنے لگیں۔ عبدالماجد دریا بادی بھی اپنے عہد کے نظریات و تصورات سے متاثر ہوئے۔ وہ صحیح معنوں میں پڑھے لکھے انسان تھے۔ انھوں نے عقل کے راستے سے زندگی کے تجربوں کو پرکھنا شروع کیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ عقل ایک حد سے آگے نہیں جا سکتی۔ وجدان اس سے زیادہ معتبر ہے اور وہ اخلاق کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ ٹھوکر کھانے کے امکان ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے خطوں میں بھی وہ ٹھہراؤ ملتا ہے جو طوفان کے گذر جانے کے بعد کا مقدر ہے' اس لیے کہ اس سکون کی قدر دانی اس شخص سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا جو خود عقل و منطق کی طوفان خیزیوں کا نشانہ رہا ہو۔

وہ اردو زبان کے مزاج دان ہیں اور اپنی عبارت پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ زبان سادہ، جملے چھوٹے مگر بڑے بامعانی ہوتے ہیں۔ ان کی نقادانہ نظر کسی مسئلے کی تہ تک پہنچ کر کوئی نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ ان کے خطوط میں ان کی اس علمیت کا اندازہ ان کی دوسری تحریروں کی طرح تو نہیں ہوتا لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان میں اس کی جھلک سرے سے دکھائی ہی نہ دے۔

بنام مولوی ضیاء احمد بدایونی

کرم گُستر! وعلیکم السلام

خود مدیر میگزین سلمہ اللہ ہی کا خط ہی کیا کم تھا کہ اس پر مستزاد آپ کا سفارش نامہ!۔

لو تبسم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

کیسے انکار کروں، معذرت کن الفاظ سے پیش کروں؟ کاش آپ کو میری مصروفیتوں کا تفصیل سے علم ہوتا! آپ خود ہی اس وقت ایسا حکم نہ دیتے لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا[1]۔ جب اللہ نے عذر کی بنا پر بندوں کو معافی دے دی ہے تو کیا خود بندے بندوں کے حق میں اپنی درگزر سے کام نہ لیں گے؟

لکھ ڈالنا تو خیر کچھ ایسا مشکل نہیں، قلم گھسیٹ دینے میں وقت ہی کیا ایسا لگتا ہے، اصل سوال پڑھنے کا ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کو از سرِ نو پڑھے بغیر کیسے اس پر لکھ دیا جائے۔ اور پھر پڑھنے ہی کا وقت نکالنا تو محال ہے۔

اپنے محبوب سے محبوب ادیب یا شاعر کا از سرِ نَو مطالعہ کرنا ایک مجاہدہ عظیم ہے۔ اور یہیں اکثر بجز آپ سے معذرت کر دینے کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔

خدمت صرف اتنی ممکن ہے کہ کچھ عام مشورے دے دوں۔ خود وہ نمبر ہو سامنے تو اس پر بطور دیباچہ یا پیش لفظ چند سطریں لکھ دوں یا کوئی خاص مقالہ آ جائے تو اس پر الٹی سیدھی کچھ رائے دے دوں۔ بوڑھے پہلوانوں کو آپ نے سنا ہو گا کہ اکھاڑے میں اتر کر کشتی کے قابل نہیں رہ جاتے باہر بیٹھے ہوئے داؤ پیچ بتا سکتے ہیں۔ فن کے گر سکھا دیتے ہیں۔

مزاح و ظرافت و طنز و تعریض دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ امید ہے کہ اس فرق کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا، بلکہ خود شوخی و ظرافت کے درمیان جو لطیف فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

شاعروں میں اکبر اور نثر نگاروں میں محمد علی جوہر ان سب اصناف کے جامع ہوئے ہیں۔

---

[1] اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اکبر پر تو یقینی ہے کہ میگزین میں خوب کھل کر لکھا جائے گا۔ باقی کسی کو جوہر کی نثر نگاری پر بھی پوری توجہ کرنی چاہیے۔ "مضامینِ محمد علی" "حالاتِ محمد علی" "گزارشاتِ محمد علی" وغیرہ کے نام سے کئی مجموعے نکل چکے ہیں۔ کم از کم انھیں تو ضرور ہی لیا جائے۔

لطیف، سبک، شوخ نگاری کی مثالیں ریاض خیر آبادی کے ہاں کثرت سے ملیں گی۔ کوئی ریسرچ کر کے ذرا دیکھے تو، اور نذیر احمد تو کسی بھی طرح بھولنے والی چیز ہی نہیں۔

غیر مشہور اور گمنام لکھنے والوں میں یہ دو بھی از سرِ نو قدر دانی کے محتاج ہیں۔ سید محفوظ علی بدایونی مغفور، دوسرے شیخ ولایت علی۔

ظرافت اپنی حدود سے تجاوز کر کے ذاتیات اور شخصی ہجو گوئی تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں اودھ پنچ سکول میں بہت ملیں گی۔ اور گلزار نسیم پر جو قیامت خیز بحث شروع ہوئی تھی اس میں آخر میں طرف داران شرر بھی اسی سطح پر اتر آئے تھے۔ ملاحظہ ہوں ہفتہ وار ظریف مرحوم کی فائلیں ـــــ ایک طرف ہیں خطوط "بوا حلیمن کے نام" دوسری طرف ہیں مکتوب "سجادی خانم کے نام"

ہزل، پھکڑ، فحاشی سب کے ڈانڈے آکر مسخ شدہ ظرافت سے مل جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کا جو مقام ادبیات میں ہے وہ تو نظر میں ہی ہو گا۔ بھر حال کے لکھنے والوں میں شوکت تھانوی، رشید صدیقی، قاضی عبدالغفار، سالک، پطرس اور کنہیا لال کپور نمایاں ہیں۔

ایک مستقل عنوان "علی گڑھ کا حصہ ظرافت و طنز میں" ضرور رکھیے اور اس کی ابتدا خود سر سید سے کیجیے۔ لیجیے معذرت نامہ خود ہی مضمون بن چلا۔

والسلام، نیاز مند

(عبدالماجد)

سوالات

۱۔ عبدالماجد دریا بادی کا ادبی ذہن ان کے خطوں پر بھی چھایا ہوا ہے۔ اس خط کے حوالے سے تبصرہ کیجیے۔
۲۔ زیرِ نظر خط کے مطالعے سے عبدالماجد دریا بادی کے اسلوب بیان پر مختصر مضمون لکھیے۔

ـــ ○○○ ـــ

علی بابا (مصنف)

جناب علی بابا، بلوچوں کے رند قبیلے میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد رمضان رند تھا۔ علی بابا سندھی زبان میں جدید طرز کی مختصر کہانیاں لکھنے والوں میں سے ہیں۔ وہ زندگی کے گوناں گوں مسائل اور ان کے معاشرے پر اثرات نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ معاشرے کی پیچیدگیاں، معاشی اور معاشرتی ناہمواریاں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل، ان کی کہانیوں کے خاص موضوع ہیں۔ حقائق پر مبنی یہ کہانیاں سبق آموز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

سندھی زبان میں کہانی لکھنے والوں میں علی بابا کا ایک منفرد مقام ہے۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹی۔وی کے لیے بھی بے شمار ڈرامے اور فیچر لکھے۔ ان کے ایک ٹی۔وی ڈرامے کو بین الاقوامی ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے دھرتی، دھکانہ، آپل ڑی اولان زیادہ مشہور ہیں۔ ایک ناول "موہنی جودڑو بھی شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی (مترجم)

علی بابا کے سندھی افسانے کا اردو ترجمہ "ہم لوگ" کے عنوان سے شامل کتاب ہے جس کے مترجم ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی ہیں۔ آپ ۱۴ نومبر ۱۹۳۶ء کو کاسگنج، یو۔پی بھارت میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے (اردو)، ایم۔اے (انگریزی)، ایل۔ایل۔بی اور پی۔ایچ۔ڈی تک تعلیم حاصل کی اور سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ میں سینئر ماہر مضمون کے عہدے پر فائز ہیں۔

جناب ڈاکٹر عبدالحق خان حسرت کاسگنجوی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ اردو انگریزی اور سندھی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں تنقید و تحقیق کے علاوہ ان کی نگارشات میں افسانہ نگاری، ناول نگاری جیسی اصنافِ ادب شامل ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں اور ان کے طبع زاد افسانوں کے مجموعے "آدھا سورج، آدھا سایا" محوِ تماشا ہوں" اور "زخم بنے پھول" منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

سندھی افسانوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کا خاص سلیقہ اور مہارت رکھتے ہیں کہ ان کے تراجم پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے پچاس سندھی افسانوں کے اردو تراجم کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور مزید پینتیس سندھی افسانوں کے تراجم کا مجموعہ "پھول سرخ ہیں" کے نام سے زیرِ اشاعت ہے۔ زیرِ نظر افسانہ "ہم لوگ" بھی ان کا سندھی افسانے کا اردو ترجمہ ہے۔

ہم لوگ

وہ کوشش کے باوجود بھی تیز نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ میں لنگ تھا کہتے ہیں

بچپن سے ہی کولھے کی ہڈی ایک طرف کو نکلی ہوئی تھی بعض کہتے ہیں کہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا تو چاند گرہن سے متاثر ہوا تھا۔ بہر حال اس کی ایک ٹانگ میں نمایاں فرق تھا۔ وہ جب چلتا تھا تو یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ اس کی حالت بھی کچھ عجیب عجیب سی تھی۔ تھکا تھکا' اداس اداس مریضوں کی طرح۔ اسے دیکھتے ہی ترس آنے لگتا تھا۔ وہ ہمارے گڈس آفس میں سیلز مین تھا۔ معصوم چہرہ' بونا سا قد' نحیف و لاغر جسم' دور سے دیکھنے پر وہ چودہ پندرہ سال کا لڑکا ہی معلوم ہوتا تھا۔ سارا دن کام میں گتھا رہتا تھا وہ کاہلوں کی طرح کبھی نہیں بیٹھا لیکن نہ جانے کیوں سارے دن اسے جھڑکیاں ہی ملتی تھیں۔

"ارے او نظاموں کے بچے۔ جا ایک سیر برف تو لے آیا۔"

"ارے وہ سیلز مین کہاں مر گیا! اس سے کہو جا کر دو لفافے لے آئے۔"

"ارے او نظاموں دوڑ کر یہ تار دے آ اور واپسی پر گھر سے کپڑے لا کر دھوبی کو دے دینا۔ جا جلدی جا کیا رینگ کر چیونٹی کی چال چلتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے دفتر میں کوئی چپراسی تھا ہی نہیں اس لیے سارے اوپر کے کام بھی نظاموں کو ہی کرنے پڑتے تھے۔ ایک کام ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ دوسرا کام تیار ہوتا تھا۔ اے لو ...... کہاں مر گیا تھا تو جا یہ میمو سی ٹی او کو اور یہ ڈبلیو ایف او کو دے کر آ۔ واپسی پر گھر سے میرا کھانا لیتے آنا۔ ابے او ..... میری بات سن بھی رہا ہے اور یہ تو اٹک اٹک کر چلتا کیسے ہے۔ جا جلدی کر ایک میمو دینے میں ہی سارا دن لگا دیتا ہے۔"

موسلا دھار بارش ہو رہی ہو یا آسمان سے آگ برس رہی ہو' آندھی ہو یا طوفان' نظاموں کے فرائض اور جھڑکیوں میں کبھی کمی نہیں آتی تھی۔ وہ سارا دن پسینے میں شرابور لنگڑا لنگڑا کر چلتا رہتا' کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ یہاں تک کہ رات کے دس گیارہ بج جاتے۔ میں نے کئی دفعہ اسے اپنا مُیلا سا تولیہ دیا تاکہ وہ جب دھوپ میں باہر جائے تو سر پر ڈال لے۔ کبھی کبھی وہ تولیہ اپنے پیٹ سے باندھ لیتا تھا۔ کہتا تھا پیٹ میں سخت تکلیف محسوس کرتا ہوں کبھی کبھی تو وہ اپنے پیٹ کی تکلیف سے رونے لگتا تھا۔ نہ جانے کیا بیماری لگ گئی تھی' دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

مجھ سے اس کی دوستی تھی۔ جب بھی اسے کوئی بات پوچھنی ہوتی تو وہ مجھ سے پوچھتا تھا۔ گھر سے خط آتا تو مجھ سے ہی پڑھواتا۔ دفتر کے معاملوں میں بھی وہ مجھ سے مشورہ لیتا اور جب کوئی مسئلہ یا بات اس کی سمجھ سے باہر ہوتی تو وہ مجھے اپنا رازدار سمجھ کر پوچھتا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ "بابو جی! یہ لوگ اوور ٹائم کیوں نہیں دیتے' صبح آٹھ بجے آتا ہوں اور رات کو

گیارہ بجے تک کام کرتا ہوں۔" میں کیا جواب دیتا' میں بھی ملازم ہی تھا۔ کبھی کبھی کہتا۔ "بابو جی! یہ بڑا صاحب نہایت حقارت سے ناک سکیڑ کر ،گٹ آوٹ کر دوں گا' ،گٹ آوٹ کر دوں گا' کیا کہتا ہے؟" کبھی کبھی تو اس کے مسلسل سوالوں پر مجھے ہنسی بھی آجاتی تھی اور بعض اوقات اس کے سوالات اتنے تیکھے 'کڑوے' کسیلے اور طنز سے بھرپور ہوتے تھے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے پاتا تھا۔

ایک دن وہ مجھے غیر معمولی طور پر زیادہ خوش نظر آیا۔ وہ شاید تنخواہ کا دن تھا۔ نہ جانے کس نے اس کی کھوپڑی میں یہ بات سمادی تھی کہ تنخواہ بڑھ رہی ہے۔ تنخواہ بڑھنے کے تصور سے ہی اس کے چہرے پر خوشی چھلک رہی تھی۔ کہنے لگا۔ "بھائی' آج تو فلم دیکھیں گے! سنا ہے ٹیکسی ڈرائیور اچھی فلم ہے۔"

اور کچھ دیر کے بعد جب وہ تنخواہ لے کر آیا تو اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ بے جان سے تھے۔ چہرے پر اداسی تھی۔ "تنخواہ بڑھنا تو الگ رہا الٹے میرے بیس روپے کاٹ لیے۔ میری تو حاضریاں بھی پوری تھیں۔" میں نے اسے بتایا کہ دو ماہ سے جو واشنگ الاؤنس مل رہا تھا' وہ کاٹ لیا ہے۔ لیکن اس بے چارے کو اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔

دفتر میں سب کا خیال تھا کہ نظاموں کو ٹی بی ہو گئی ہے۔ جوں ہی یہ بات پھیلی اسے دفتر کے مٹکے میں سے پانی پینے سے منع کر دیا گیا۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسے ٹی بی یا اس قسم کا کوئی اور مرض نہیں تھا۔ میں ہی کیا سب کو معلوم تھا کہ اسے کون سی بیماری ہے اور اس بیماری کا کیا علاج ممکن ہے۔ لیکن ہم میں سے کسی کو اس بات پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہم لوگ اسے یہ مشورہ تو دیتے تھے کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کراؤ ورنہ مر جاؤ گے اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے جب بھی اس کے پیٹ پر تولیہ دیکھا تو مجھے بھی اس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں یہ مجھ سے پیسے نہ مانگے۔ وہ میرے علاوہ کسی اور سے اس درجہ فری نہیں تھا۔ "بابو جی' آج تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ دو روپے دے دو تنخواہ کے دن واپس کر دوں گا۔" وہ اس طرح معصومیت کے ساتھ کہتا کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ تنخواہ کے دن یہ پیسے واپس نہیں کرتا تھا۔ وہ پیسے پابندی کے ساتھ واپس کر دیتا تھا لیکن بات یہ تھی کہ میرا حال بھی کچھ زیادہ ہی پتلا تھا۔

ایک دن ہمارے دفتر کا سارا عملہ جمعہ کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ ہم دونوں ہی رہ گئے۔ کوئی کام بھی نہیں تھا اس لیے میں مزے سے دفتر کی میز پر ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ کے کش لینے لگا اور

ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھنے لگا۔ نظاموں بلٹیوں والی کاپیوں پر اداس بیٹھا تھا اور ٹھنڈی سانس لے رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کسی نے مارا ہے۔ کوئی سا ہی دن ہو گا جب اس کی ایسی حالت نہ ہوئی ہو۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر سکون نہیں دیکھا۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ بولا۔

"بابو جی، اب اس نوکری سے جی کھٹا ہو گیا ہے۔ آج پھر بڑے صاحب نے چارج شیٹ دی ہے۔ میں بھلا کوئی پڑھا لکھا ہوں جو یہ روز روز چارج شیٹ کا جواب لکھتا رہوں۔"

"آج کس بات پر چارج شیٹ ملی ہے؟" میں نے پوچھا۔

بڑے اداس لہجے میں کہنے لگا "انھوں نے مجھے روئی کے بوروں پر سوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دیکھو نا بھائی، میں بھی آخر انسان ہوں۔ صبح آٹھ بجے کام پر آتا ہوں، رات کے دس گیارہ بج جاتے -------- آخر یہ لوگ مجھے چین سے کیوں نہیں بیٹھنے دیتے؟"

"جس دن چھٹی ہوتی ہے اس دن بھی مجھے آنا پڑتا ہے ذرا سی دیر ہو جائے تو ہزاروں باتیں سناتے ہیں اور یہ چارج شیٹ تھما دیتے ہیں۔ میں ان روز روز کی باتوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے نوکری چھوڑ دوں۔"

"پھر کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا اور میں ہی اس کے گھر کے خط پڑھ کر سناتا تھا لہٰذا میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "پگلے! ایسا خیال بھی دل میں مت لانا۔ آج کل نوکری مشکل سے ملتی ہے اور پھر تم اکیلے تو ہو نہیں۔ سات فرد اور بھی کھانے والے ہیں۔ ان کے ہی بارے میں سوچو۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے "پھر یہ لوگ مجھے چین سے کیوں نہیں بیٹھنے دیتے؟ جینے کیوں نہیں دیتے؟ ...." وہ رونے لگا اور روتے روتے اپنا سر سامنے میز پر رکھ دیا اور منہ کے گرد بازو کر لیا۔ اس کے رونے اور ہچکیوں میں عجیب کیفیت تھی۔ عجیب درد تھا۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن میں کسی کام سے حیدر آباد چلا گیا۔ تین دن کے بعد جب واپس آیا تو دفتر میں دیکھا کوئی اور لڑکا کام کاج میں مصروف ہے۔ اس بات کا مجھے بعد میں علم ہوا کہ نظاموں نے سیل لگانے کے لیے کسی بیوپاری سے پیسے مانگے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی کئی اور شکائتیں تھیں۔ اسے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔

کافی دن گزر گئے۔ نظاموں کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ایک دن میں ساتھیوں میں بیٹھا تھا اور نظاموں کی مجبوریوں اور پریشانیوں پر افسوس کر رہا تھا تو ایک دوسرا بابو چڑ گیا تھا "ارے تم نہیں جانتے اس کو ...... ہم سب سے زیادہ کماتا تھا۔ قسم خدا کی وہ سیل لگانے کا ایک روپیہ لے لیتا تھا۔"

"میں نے ہمدردی سے کہا تھا یار، تم لوگ تو یوں ہی اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ وہ بے چارہ تو کبھی کبھی فاقے بھی کرتا تھا۔" میری اس بات پر میرا ساتھی اچھل کر بولا "یار تم بھولے بھالے آدمی ہو، تمھیں کیا پتہ وہ تو لوڈنگ تک کے پیسے کھا جاتا تھا۔ جو بھی نیا بیوپاری آتا کہتا نکال پیسے تیرا مال سب سے پہلے لوڈ ہو گا۔ سب سے پہلے جائے گا۔ میں جو اس سے جلتا تھا اس کی وجہ تھی۔ بڑا کمین تھا وہ۔"

تھوڑی دیر بعد بولا :

"تمھیں یاد نہیں شاید جس دن وہ بابو بھائی سے باتیں بنا رہا تھا اور انھوں نے غصے میں اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا تھا۔"

اس پر جتنے لوگ موجود تھے سب نے نظاموں کو برا بھلا کہا کچھ نے تو گالیاں دیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

وہ مجھے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جو اب تک میرے پاس موجود ہے۔ کہتے ہیں دوسروں کا خط پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ اس بات کا میں مجرم ہوں، اس لیے آپ سے بھی نہیں چھپایا۔ اس کا خط میں نے پڑھا۔ یوں تو وہ خط مجھ سے ہی پڑھواتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا خط پڑھنے میں ملامت محسوس نہیں کی تھی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس میں گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس خط میں کوئی بھی ایسی انوکھی بات نہیں جسے آپ کا ضمیر سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہ ایک دکھی ماں کے دکھ بھرے الفاظ ہیں۔ نہایت سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ ملک کے کروڑوں انسانوں کی درد بھری کہانی جس کو ہم سب بخوبی جانتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ہم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ نظاموں کی ماں کا خط کچھ اس طرح تھا:

"نور چشم نظام الدین، خدا تجھے خوش رکھے۔

اس سے پہلے میں ایک خط روانہ کر چکی ہوں لیکن تُو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں پریشان ہوں۔ تمھارے چھوٹے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ غالباً میعادی بخار ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگیں گی ورنہ ..... میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔

بیٹے کسی نہ کسی سے ادھا سدھار لے کر کچھ پیسے بھیج دو۔ بیماری تو ہے لیکن گھر کا حال یہ ہے کہ آج صبح سے گھر میں سب کا فاقہ ہے۔ کلو دکان دار نے ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس دفعہ کچھ کفایت سے کام لینا کچھ زیادہ پیسے بھیجنا۔ دکاندار کا قرضہ زیادہ ہو گیا ہے اور بھی گھر کے دوسرے خرچ ہیں۔ تیری بڑی بہن کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میری جان جلتی ہے۔ تیرے چاچا کا ہم لوگوں سے غیروں کا سا برتاؤ ہے پھر بتا ہم غریبوں کی بیٹی انھیں کیوں پسند آئے گی۔ تم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ تم ٹھیک نہیں ہو میں اور بھی بے چین ہو گئی۔ بیماریاں سب ہی خطرناک ہوتی ہیں' توجہ کرنا' دوا دارو کرنا۔ تمھیں دیکھے بہت دن ہو گئے اگر تنخواہ نہ کاٹیں تو کسی دن آکر منہ دکھا جاؤ۔ اپنے بیمار بھائی اور آٹے کے لیے پیسے جلد روانہ کرنا۔ فقط تمھاری ماں۔"

نظاموں کا مسئلہ معاشرے کا عام مسئلہ ہے۔ نہ جانے کتنے نظاموں روز اس مسئلے کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ میرے پاس نظاموں کے لیے ہمدردیاں تھیں' آنسو تھے جس کی اسے ضرورت نہیں تھی اس کا مداوا کیا کرتا۔ میں تو خود ایک نظاموں ہوں۔ ایک ایسا نظاموں جس نے اپنے سفید کالروں کی عزت رکھنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔

(سندھی سے آزاد ترجمہ اور تلخیص از ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی)

سوالات

۱۔ گڈس آفس والے نظاموں سے کیا کیا کام لیتے تھے؟

۲۔ نظاموں کو چارج شیٹ ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں امڈ آئے؟

۳۔ نظاموں کی والدہ نے خط میں کیا لکھا تھا؟

۴۔ نظاموں کا حلیہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۵۔ "نظاموں کا مسئلہ ہمارے معاشرے کا عام مسئلہ ہے۔" اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۶۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

—— ○○○ ——

پروین ملک

(تاریخ پیدائش ۱۹۴۷ء)

پرائمری تک تعلیم موضع شیں باغ خرد، ضلع اٹک کے سکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول اٹک سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج اٹک سے بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے صحافت کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔

ایم۔ اے کرنے کے دوران ہی میں ریڈیو پاکستان لاہور سے ان کی کئی کہانیاں نشر ہوئیں۔ کچھ عرصہ روزنامہ "آزاد" اور ہفت روزہ "نصرت" میں کام کیا۔ ریڈیو پر کئی ڈرامے لکھے۔ ۱۹۷۰ء میں پہلی پنجابی کہانی "جنج" لکھی۔ ۱۹۸۳ء میں پنجابی کہانیوں کا مجموعہ "کیہ جاناں میں کون" کے نام سے شائع ہوا۔ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "پٹیر پراگے" کے نام سے زیر طبع ہے۔ "کیہ جاناں میں کون" میں شامل چھ کہانیاں چھاچھی لہجے میں لکھی گئی ہیں جو پنجاب کے اس گوشے کی زبان ہے جو دریائے سندھ کے ادھر پنجاب کا آخری کونہ ہے۔

کیہ جاناں میں کون

ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں جا رہی تھی اور یہ سارا عرصہ میں نے اپنے ہی دیس میں پردیسن ہو کر بتایا[1] تھا۔ اگر آپ سوچیں کہ مجھے پردیسی بنانے میں کسی قسم کے جبر کا دخل تھا تو ایسا نہیں ہے۔ یہ جوگ[2] تو میں نے خود لیا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ نئے زمانے میں جو کوئی جوگ مالا گلے میں ڈالتا ہے تو وہ انسانوں کے جنگل کی طرف لپکتا ہے اور پھر وہیں کھو جاتا ہے۔

میں بھی شہر آئی اور پھر جانے کیا ہوا ...... شاید مجھے نیند آئی، پل دو پل ہی سوئی ہوں گی مگر آنکھ کھلی تو زمانہ بدل چکا تھا ... ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو میں محلے کے بچوں کو کہانیاں سنا رہی تھی کہ میری آنکھ جھپک گئی اور اتنی ہی دیر میں بچے بڑے ہو گئے، لڑکیاں اپنے بچے کھلانے میں مصروف ہو گئیں اور لڑکے اپنے بچوں کے لیے چوگا اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ میں اتنے برس سوئی رہی۔ پر نہیں۔ ٹھہریے ذرا۔ مجھے یاد ہے چند گھڑیاں پہلے ہی تو مجھے وہ خاکی لفافہ ملا تھا، اپنی پیشانی پر On Pakistan State Service کا جھومر سجائے، وہ لفافہ یہ پیغام لایا تھا "ہمیں آپ کی خدمات اپنے دفتر کے لیے حاصل کر کے خوشی ہوگی۔ آپ کو

---

[1] گزارا۔
[2] دنیا سے کنارہ کش ہونا۔

تاکید کی جاتی ہے کہ جلد از جلد ڈیوٹی پر حاضر ہو جائیں۔"

اور میں حاضر ہو گئی۔ لیکن اگر میں حاضر تھی تو پھر غائب کیسے ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے، میرے گودوں کھلائے اتنے بڑے کیسے ہو گئے، میرے اپنے بچوں نے سکول جانا شروع کر دیا اور میں غافل ہی رہی۔ دن رات کا پھیر تو مجھے یاد ہے مگر رُتوں کی خبر نہ رہی۔

پودا جب گملے میں لگ جائے تو اسے بدلتے موسموں کی پروا نہیں رہتی، دھوپ چھاؤں کے ساتھ اس کا رخ بدلنا ممکن ہو جاتا ہے، اگر اس سارے عمل کے دوران جڑیں کمزور بھی رہ جائیں تو کیا پروا۔ زندگی کا دھارا بہے چلا جاتا ہے، بسوں، رکشوں، ویگنوں کے ہارن، ہر وقت بھاگ دوڑ کا سماں، جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو، دھول اور دھوئیں کے بادل یہی تو زندگی ہے۔

سرسوں کے پھولوں کی نرمی، شرینہ اور دھریک کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، وہ سب تو ایک سپنا تھے۔ شہر کی زندگی رواں دواں، ہر وقت نئے ہنگاموں پر آمادہ، کہتے ہیں کئی کارخانے ایسے ہوتے ہیں جنھیں ایک بار چالو کر دو تو پھر رکتے نہیں، رکنے کا مطلب ہوتا ہے کوئی بڑی خرابی۔ اس بڑی خرابی سے بچنے کے لیے دن رات خام مال ان کارخانوں میں جھونکا جاتا ہے، پیداوار کیسی بھی ٹیڑھی بھینگی ہو کہیں نہ کہیں اس کی کھپت ہو ہی جاتی ہے۔

چلیے چھوڑیے ہمیں کیا۔ میں تو اپنے گمشدہ لمحوں کا حساب لگانے بیٹھی تھی، وہ لمحے جن میں سرسوں کی سی نرمی اور شرینہ کے پھولوں کی خوشبو تھی جانے کہاں گم ہو گئے۔ شکر ہے کہ ان کے سپنے میری نیم خوابیدہ آنکھوں میں موجود تھے اور شاید میں انہی سپنوں پر گزارہ کر لیتی کہ میری بیٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا وہ باہر سے بھاگی بھاگی آئی اور مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی۔ "امی ہمارا بھی کوئی گاؤں ہوتا تو کتنا مزہ آتا!"

"بیٹا ہمارا گاؤں ہے تو سہی مگر آج تمھیں کیسے خیال آیا۔" اب میں پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

"امی! ہمیں لے چلیں ناوہاں۔ پتہ ہے گوشی وغیرہ اپنے گاؤں جا رہے ہیں اور وہ کہتے ہیں تمہارا تو کوئی گاؤں ہی نہیں۔" وہ بولنے لگی تو مجھے لگا میری ساری نیند ہوا ہو چکی ہے، اب میں جاگتی آنکھوں سے اپنے گاؤں کی گلیاں دیکھ رہی تھی۔ "تم جا کے انھیں بتاؤ کہ ہمارا گاؤں ہے اور اس گاؤں میں ہمارا خوبصورت سا گھر ہے، جس کے صحن میں لگی بیری کے بیر وہ کھالیں تو سیبوں کا مزہ بھول جائیں۔"

"ہیں امی! سچ مچ؟" میری بیٹی کی آنکھوں میں جیسے جوت سی جگ گئی۔

اور پھر اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر وہ رُولا ڈالا کہ مجھے مانتے ہی بنی۔ گاؤں جانے کی تیاری کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جانے کتنے چھوٹے بڑے کام مکڑی کے جالے کی طرح میرے اردگرد لپٹے ہوئے ہیں' پر کسی نہ کسی طرح میں اس جالے سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی اور اب ہم گاؤں جا رہے تھے۔

بڑا لمبا سفر تھا یا پھر مجھے سفر کرنے کی عادت نہیں رہی تھی اس لیے ایسا لگا' بہرحال سٹیشن پر اتر کر ٹانگا لیا اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹانگے کی سواری بچوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا وہ خوشی سے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

جب گاؤں کے قریب کچی سڑک شروع ہوئی تو دھول کے بادلوں نے ہمارا استقبال کیا' مگر یہ دھول وہ نہیں تھی جو شہر کی سڑکوں کے ساتھ مل کر سب کا دم گھونٹتی پھرتی ہے۔ یہ تو جیسے ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے فضا میں بلند ہوتی اور پھر واپس اپنی جگہ پر چلی جاتی۔

گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے ایک ایک اینٹ مجھ سے شکوہ کر رہی ہو "ہم تم سے ناراض ہیں' تم کہاں گم ہو گئی تھیں۔" اپنے گھر کے صحن میں لگے بیری کے درخت کی طرف بڑھی تو وہ بھی چپ چاپ کھڑا رہا ورنہ پہلے تو وہ میرے لیے پکے پکے بیر خود ہی گرا دیتا تھا "خیر سب کو منا لوں گی۔" میں نے سوچا اور بند دروازے کھولنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں سارے گاؤں کو میرے آنے کی خبر ہو گئی اور لوگ ملنے کے لیے آ گئے۔ دراصل گاؤں میں کوئی بھی فقط پڑوسی نہیں ہوتا' سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ناتا جڑا ہوتا ہے۔ عورتیں آتیں میرا ماتھا چوم کے گلے سے لگاتیں اور پھر بچوں سے تعارف ہوتا۔ کچھ دیر تو وہ حیران و پریشان سے کھڑے رہے پھر ان سے رہا نہ گیا تو دونوں بیک وقت بولے "امی! آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ گاؤں میں ہماری اتنی نانیاں اور خالائیں ہیں۔"

"پتر! تمھاری ماں بہت ساری جماعتیں پڑھ گئی ہے نا۔ اسے یہ نمانے سے رشتے کہاں یاد رہ سکتے ہیں۔" ماسی رحمتاں نے کہا تو میں شرمندہ ہو گئی۔ "وہ ماسی! میں یاد تو سب کو کرتی تھی مگر کاموں سے فرصت ہی نہیں ملی۔"

"نہ پتر! یہ بات نہ کہو۔ یاد رکھو جب کام بندے کو ہل میں جتے بیل جیسا بنا دیں تو زندگی بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔" ماسی کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی لالہ ممتاز کا گھر تھا۔ اکثر کام سے فارغ ہو کر امی ان کے ہاں جا بیٹھتیں، میں بھی ان کا پلو پکڑے ساتھ ساتھ ہوتی۔

اس گھر میں جانے کس زمانے کی ایک لکڑی کی سیڑھی تھی' یوں تو گاؤں کے کچی چھتوں والے گھروں کے لیے سیڑھی بہت ضروری ہوتی ہے مگر گھروں میں بانس کی سیڑھی ہی ہوتی تھی جسے "پڑسانگ" کہتے تھے۔ یہ زمین میں گڑی ہوئی چوڑے تختوں والی سیڑھی ان سے مختلف تھی۔ پرانی پکی لکڑی کے یہ موٹے موٹے تختے اور دوسری طرف کٹاؤ کے کام کا جنگلا' جس کے ہر ڈنڈے پر لٹو سا بنا ہوا تھا' تختوں کی چوڑائی اور جنگلے کا ہر ڈنڈا کٹاؤ کے کام کا ایسا بہترین نمونہ جسے دیکھ کر دل خوش ہو جائے' جانے کون سی لکڑی تھی کہ اس کا رنگ روپ اتنے موسموں کی سختیاں سہ کر بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ مجھے وہ سیڑھی بہت اچھی لگتی' لالہ ممتاز کے گھر جاتے ہی میں صحن میں بچھے پلنگوں اور پیڑھوں کو نظرانداز کر کے سیڑھی کے پہلے قدمچے پر جاکر بیٹھ جاتی' گھر کے سب لوگ میرے اس معمول کے عادی ہو گئے تھے اس لیے کوئی کچھ نہ کہتا' میں ہولے ہولے کھسکتی سب سے اوپر والے قدمچے پر پہنچ کے کھڑی ہو جاتی جہاں سے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کا نظارہ کر کے میں خوشی سے بے حال ہو کر چلا اٹھتی "امی جی!" وہ گھبرا کے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کہتیں "نیچے آؤ گر جاؤ گی۔" بہت عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا نہ امی نے گھبرانا چھوڑا نہ میں سیڑھی پر چڑھنے سے باز آئی۔

اب میں اتنے عرصے بعد گاؤں آئی تو لالہ ممتاز کے گھر جانا ہی تھا' میں صحن میں بچھے پلنگ پر بیٹھی بھابی سے باتیں کر رہی تھی تو گویا آسمان سے آواز آئی "امی جی!" میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ میری بیٹی سب سے اوپر والی سیڑھی پر خوشی سے دمکتا چہرہ لیے کھڑی تھی۔

"نیچے آؤ گر پڑو گی۔" یہ شاید میری آواز تھی مگر دوسرے لمحے مجھے احساس ہوا میں سیڑھی پر کھڑی ہوں اور صحن میں بھی موجود ہوں۔ ہر طرف میں ہی میں ہوں۔

(پنجابی سے ترجمہ: مصنفہ)

سوالات

۱۔ افسانہ نگار نے شہری اور دیہاتی ماحول اور طرز زندگی میں کیا فرق محسوس کیا۔ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ افسانے میں جن نفسیاتی اور معاشرتی حقائق کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ وضاحت کیجیے۔

۳۔ افسانے کا خلاصہ لکھیے۔

——— ○○○ ———

حصہ نظم

حمد، نعت اور منقبت

حمد

حمد عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنیٰ تعریف یا ثنا ہے۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ نظم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف یا ثنا کی گئی ہو۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حمد، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مثنوی اور دیگر اصناف سخن کی طرح کوئی الگ صنف نہیں ہے بلکہ اس کو موضوعِ سخن کہنا چاہیے۔ "حمد" غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی وغیرہ کی طرح کسی خاص یا مخصوص ہیئت میں نہیں لکھی جاتی۔ اسی طرح اس کی کوئی بحر اور وزن بھی مخصوص نہیں، تاہم بعض ناقدین مرثیے کی طرح الگ ہیئت نہ ہونے کے باوجود حمد کو صنفِ سخن مانتے ہیں۔

دیگر مشرقی زبانوں کی طرح اردو میں بھی حمد کو ایک خاص تقدّس اور بلند مرتبہ حاصل ہے۔ شاعری کی قدیم کتابوں میں ہمارے اکثر شعرا اپنی کتابوں کا آغاز حمد سے کرتے تھے۔ ہمارے اس دَور میں جہاں بعض شاعروں اور ادیبوں نے مختلف شاعروں کی حمدوں پر مشتمل مجموعے مرتب کیے ہیں وہاں بعض دیگر شاعروں نے اپنے کلام پر مشتمل حمدوں کے قابلِ قدر مجموعے منظرِ عام پر لاکر اردو شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

حوالے کے طور پر بعض حمدوں کا پہلا پہلا شعر ذیل میں دیا جا رہا ہے:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے (میر درد)

○ ○ ○

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا
اس جا پہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا (بہادر شاہ ظفر)

○ ○ ○

کامل ہے جو ازل سے، وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک، وہ ہے جلال تیرا (حالی)

○ ○ ○

دوسرا کون ہے، جہاں تُو ہے
کون جانے تجھے، کہاں تُو ہے (امیر مینائی)

○ ○ ○

یہاں بھی تُو، وہاں بھی تُو، زمیں تیری، فلک تیرا
کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا (داغ)

○ ○ ○
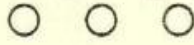
بنائے اپنی قدرت سے زمین و آسماں تُو نے
دکھائے اپنی قدرت سے ہمیں کیا کیا نشاں تُو نے (ظفر علی خان)

○ ○ ○
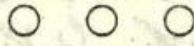
مناجات بھی معنوی اعتبار سے ایک طرح حمد ہی کا دوسرا نام ہے۔ حمد اور مناجات میں تھوڑا سا معنوی فرق یہ ہے کہ دونوں میں اللہ تعالیٰ کی تعریف تو ہوتی ہے لیکن مناجات میں دعائیہ یا التجائیہ انداز عام ہوتا ہے نیز مناجات میں عام طور پر بندہ اپنے رب سے کچھ طلب کرتا ہے۔ جیسے اقبال کی ایک مناجات کا پہلا شعر یہ ہے:

یا رب! دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

نعت

نعت کا لفظی معنیٰ بھی تعریف ہے لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ نظم ہے جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہو۔ یہ بھی بعض لوگوں کے خیال میں کوئی الگ صنفِ سخن نہیں بلکہ موضوعِ سخن ہے کیونکہ حمد کی طرح نعت کی بھی کوئی مخصوص بحر یا وزن مقرر نہیں ہوتا۔ بعض ناقدین نعت کو بھی باقاعدہ صنفِ سخن مانتے ہیں۔

حمد کی طرح نعت کو بھی ایک تقدّس اور بلند درجہ حاصل ہے بلکہ دیکھا جائے تو ہماری اردو شاعری میں اکثر شاعروں کی توجہ حمد سے زیادہ نعت گوئی کی طرف ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہم نے اپنے اللہ کو اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے سے ہی پہچانا ہے۔

قدیم اردو شاعروں نے نعت گوئی میں نہایت عظیم کارنامے انجام دیے ہیں اور موجودہ دَور میں تو نعت کے موضوع پر تھوڑے ہی عرصے میں بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اس دَور کو "نعت کا دَور" کہتے ہیں۔

آج کے دَور میں قدیم غزلیہ مشاعروں کی طرح نعتیہ مشاعرے عام ہیں۔ ہمارے اس دَور میں اتنے زیادہ نعت گو شاعر اور ان کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔

شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جس نے اردو نعت کے یہ اشعار نہ سنے ہوں :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

☆ ☆ ☆

وہ دانائے سُبل، ختم الرّسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی ظاہر، وہی باطن، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ　　　(اقبال)

☆ ☆ ☆

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اِک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں　　　(ظفر علی خاں)

☆ ☆ ☆

مَنقبَت

منقبت بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنیٰ تعریف، ذاتی خوبی، خاندانی فضیلت و برتری وغیرہ ہے۔ جس طرح حمد میں اللہ تعالیٰ کی تعریف، نعت میں اللہ کے رسول سید المرسلین، شافع المذنبین اور رحمتہٌ للعالمین کی تعریف ہوتی ہے، اسی طرح منقبت میں صحابۂ کرامؓ، اولیائے عظام اور بزرگانِ دین کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں حمد و نعت کی طرح منقبت کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

منقبت کے بھی باقاعدہ صنفِ سخن ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ناقدین میں اختلاف رائے موجود ہے۔ بہر حال حمد اور نعت کی طرح منقبت کو بھی موضوع کے اعتبار سے صنفِ سخن قرار دیا جاسکتا ہے۔

——— ○○○ ———

ظفر علی خاں

(۱۸۷۳ - ۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خان سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں پائی۔ میٹرک کا امتحان پٹیالہ سے پاس کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ریاست جموں و کشمیر میں ڈاک کے محکمے میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین بھی وہیں ملازم تھے۔ مولانا ظفر علی خاں زیادہ دیر تک اس ملازمت کو نبھا نہ سکے اور اس کو چھوڑ کر دوبارہ علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے۔ اب کے وہاں سے انھوں نے کامیابی کے ساتھ بی۔ اے کر لیا۔

مولانا ظفر علی خاں کے والد نے ریٹائر ہونے کے بعد کرم آباد (تحصیل وزیر آباد) سے ’زمیندار‘ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کیا تھا لیکن جب ۱۹۰۹ء میں وہ وفات پا گئے تو ظفر علی خاں نے ملازمت چھوڑ کر اخبار کی ادارت خود سنبھال لی اور اس کا دفتر لاہور لے آئے اور یہاں سے ہفتہ وار اخبار کو روزنامہ بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے سیاست میں زور شور سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ ظفر علی خاں کے دل میں ملک و قوم کی آزادی کے لیے جو تڑپ موجود تھی ' اس کے باعث انگریز کی مخالفت ان کے رگ و پے میں داخل ہو گئی۔ انھوں نے اپنے اخبار سے اس سلسلے میں بہت کام لیا۔ آزادی کی تحریک کے اس جذبے کی وجہ سے ان کا اخبار برصغیر میں بہت مشہور ہوا اور مولانا ظفر علی خاں کو برِصغیر پاک و ہند کے مسلم لیڈر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مولانا ظفر علی خان بہت خلیق ' شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ شاعرانہ بدیہہ گوئی میں انھیں بہت زیادہ مشق و مہارت حاصل تھی۔ ان کی شاعری کے موضوع عام طور پر سیاسی اور تازہ ترین حالات سے متعلق ہوتے تھے۔ اردو زبان پر انھیں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ مولانا حالی نے اسے نہ صرف مانا بلکہ ظفر علی خاں کی شان میں ایک تعریفی قصیدہ بھی لکھا۔

مولانا ظفر علی خان کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے جو نعتیں لکھی ہیں ' وہ اردو کی نعتیہ شاعری میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ مولانا وفات کے بعد کرم آباد (وزیر آباد) میں مدفون ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

مولانا ظفر علی خاں کے کلام کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں :

خطیبانہ لہجہ ' شکوہِ الفاظ ' مقصدیت ' جذبۂ حریت ' ہندو سے نفرت ' ہنگامی رنگ ' سنگلاخ زمینیں ' عشقِ رسول ' ' طنز ' صفائی زبان و بیان وغیرہ۔

مولانا ظفر علی خان کی کتابوں میں بہارستان ' نگارستان ' چمنستان 'حبسیات وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان مجموعوں میں مختلف موضوعات اور عنوانات پر جو منظومات ہیں' ان کو بعض ناقدین نے گزشتہ نصف صدی کی تاریخ قرار دیا ہے۔

نثر میں بھی مولانا ظفر علی خان کی بعض تحریریں نہایت قابلِ قدر ہیں۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران میں انھوں نے لارڈ کرزن کی کتاب پرشیا کا ترجمہ "خیابانِ فارس" اور امریکی سائنس دان لارڈ ڈریپر کی کتاب کا ترجمہ "معرکۂ مذہب و سائنس" کے نام سے کیا۔ مولانا ظفر علی خاں اپنی تحریروں کے علاوہ تقریروں کے ذریعے سے بھی اسلام اور اہلِ اسلام کی خدمت کی کوششوں میں مشغول رہے۔ صحافت میں ان کو بابائے صحافت کہا جاتا ہے۔

حمد

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے

نہیں موقوف خلاقی تری اس ایک دنیا پر
کیے ہیں ایسے ایسے سیکڑوں پیدا جہاں تو نے

دلوں کو معرفت کے نور سے تو نے کیا روشن
دکھایا بے نشاں ہو کر ہمیں اپنا نشاں تو نے

ہم اب سمجھے کہ شاہنشاہ ملکِ لا مکاں ہے تو
بنایا اک بشر کو سرورِ کون و مکاں تو نے

دیا اپنے کرم سے ریزہ مورِ ناتواں کو بھی
لگائے گر سلیمانؑ کے لیے نعمت کے خواں تو نے

مئے لَاتَقْنَطُوْا[1] کے نشے میں سرشار رہتا ہوں
سیہ مستوں کو بخشی ہے حیاتِ جاوداں تو نے

---

[1] اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ (لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحمَۃِ اللہ) کی طرف اشارہ ہے۔ (قرآن)

سوالات

۱۔ مولانا ظفر علی خاں کی اس حمد سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے کون کون سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

۲۔ "مورِ ناتواں" اور "حضرت سلیمانؑ" کا ذکر کر کے کس خاص واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ حسبِ ذیل تراکیب کی وضاحت کیجیے :

مُلکِ لامکاں، سُرورِ کون و مکاں، نورِ معرفت۔

۴۔ مولانا ظفر علی خان کی حمد کے اس شعر کا مفہوم آسان الفاظ میں تحریر کیجیے :

مئے لَاتَقنَطُوا کے نشے میں سرشار رہتا ہوں

سیہ مستوں کو بخشی ہے حیاتِ جاوداں تو نے

۵۔ ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہا جاتا ہے جیسے اس "حمد" کے پہلے شعر میں الفاظ آسماں، نشاں ہیں۔ قافیے کے بعد اگر کچھ الفاظ یا ایک لفظ ایسا آئے جو جوں کا توں بار بار دہرایا جائے تو یہ "ردیف" کہلاتا ہے۔ جیسے اس "حمد" میں "تُو نے" ہے۔ آپ اس نظم سے قافیوں کی نشاندہی کیجیے۔

—— ○○○ ——
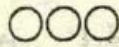
امیر مینائی

(۱۸۲۸ - ۱۹۰۰ء)

امیر مینائی کا نام امیر احمد ہے۔ تخلص بھی امیر ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ شاہ مینا رہ کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے مینائی کہلاتے ہیں۔ زیادہ تر تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے۔

امیر مینائی کے والد کا نام کرم محمد یا کرم احمد دونوں طرح مشہور ہے۔ وہ ایک عالم و فاضل آدمی تھے۔ امیر مینائی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر فرنگی محل کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔

شاعری کا شوق امیر کو بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دَور کے ایک معروف شاعر ظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے اور کچھ ہی عرصے بعد شاعری میں اس قدر نام پیدا کر لیا کہ اپنے استاد سے بھی زیادہ مشہور اور مقبول ہو گئے۔

امیر مینائی کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر اودھ کے والی نواب واجد علی شاہ نے انھیں اپنے دربار میں بلایا اور ان کی شاعری سے خوش ہو گئے۔ امیر مینائی نے اس دَور میں "ارشاد السّلاطین" اور "ہدایت السّلاطین" دو کتابیں لکھیں، جن پر نواب واجد علی شاہ نے خاص انعام دیا۔

۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۹ء میں اودھ کی ریاست بھی زوال پزیر ہو گئی۔ اس کے بعد امیر مینائی رامپور چلے گئے اور وہاں کے حکمران نواب کلب علی خان کے استاد مقرر ہو گئے۔ امیر مینائی رامپور میں چوالیس برس تک رہے۔ پھر داغ کی دعوت پر حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں ۱۹۰۰ء میں وہ انتقال کر گئے۔

داغ ان کے ہم عصر تھے اور ان کی ذاتی خوبیوں کے باعث ان کا احترام کرتے تھے۔ داغ نے امیر کی تاریخِ وفات کہی جو اس شعر پر مشتمل ہے :

قصرِ عالی پائے جنّت میں امیر ہے دعا بھی داغ کی ، تاریخ بھی

شعر و شاعری اور تصانیف

غزلیات کی صورت میں امیر مینائی کے دو دیوان مشہور ہیں۔ ایک "صنم خانۂ عشق" اور دوسرا "مرآۃ الغیب"۔ ان کا ایک نعتیہ دیوان "محامد خاتم النبین ؐ" ہے۔ امیر مینائی کی بعض مثنویاں بھی مشہور ہیں۔ جن میں "نورِ تجلّی" اور "ابرِ کرم" ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے لکھی گئیں۔ "ذکرِ شاہِ انبیا" مولود شریف ہے۔ "صبحِ ازل" حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بیان میں ہے۔ "شامِ ابد" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موضوع پر ہے۔ اسی طرح "لیلۃ القدر" میں معراج کا حال مذکور ہے۔

امیر مینائی صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ عربی اور فارسی کے متبحر فاضل تھے۔ انھوں نے "امیر اللّغات" کے نام سے اردو میں ایک لغت بھی مرتب کی جو مکمل نہ ہو سکی۔ "انتخابِ یادگار" کے نام سے

رامپور کے شاعروں کا تذکرہ بھی ان کی ایک یادگار ہے۔ اس کے علاوہ "خیابانِ آفرینش" نثر میں میلاد کی کتاب ہے۔

خصوصیاتِ کلام

امیر مینائی کا کلام مختلف اسالیب پر مشتمل ہے۔ وہ ایک مدت تک لکھنوی دبستانِ شاعری کے مطابق شعر کہتے رہے۔ پھر ایک زمانے میں انھوں نے داغ کا رنگ اختیار کر لیا۔ بہر حال مجموعی طور پر وہ اردو کے نامور شاعروں میں شامل ہیں اور اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے ایک حد تک ممتاز و منفرد بھی ہیں۔

رنگِ تصوف

امیر مشہور سلسلے صابریہ چشتیہ میں بیعت تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک دَور ایسا بھی گزارا، جب وہ تصوف کی طرف مائل رہے۔ ان کا ایک حمدیہ شعر ہے کہ :

تُو ہے خلوت میں، تُو ہے جلوت میں　　　کہیں پنہاں، کہیں عیاں تُو ہے

فقر و قناعت

امیر مینائی کی اخلاقی شاعری کا ایک پہلو فقر و قناعت کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

یہ بوجھ ان کے سر پہ، رہے ہیں جو اغنیا　　　کیا مجھ گدا کو خیمہ و خرگاہ سے غرض

درد و اثر

لکھنوی رنگ کی شاعری میں امیر کے یہاں درد و اثر اور سوز و گداز کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے　　　اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

ان کی شاعری میں ایسے دلکش اشعار بھی عام ہیں کہ :

شورِ محشر امیر کو نہ جگا　　　سو گیا ہے غریب سونے دے

نعت مبارک

سوئے طَیبہ[1] بن کے ہم زائر چلے

شُکر کی جا ہے دن اپنے پھر[2] چلے

۱۔ مدینہ منورہ کے مختلف ناموں میں سے ایک نام

۲۔ دن پھرنا یعنی اچھے دن آنا

یا رسولؐ اللہ ! جلدی آیئے
لشکرِ اندوہ میں ہم گِھر چلے

نخلِ دل میں تھے گناہوں کے جو برگ
حُبِّ حضرتؐ کی ہَوا سے گِر چلے

کیا میسر ان کو ہوتی راہِ راست
چال پر کب آپؐ کی کافر چلے

پھر رسائی کی رسا تقدیر نے
پھر مدینے ہو کے ہم زائر چلے

شوقِ دل نے کی دوبارہ رہبری
آگے بھی ہو آئے تھے، اب پھر چلے

راہِ حضرتؐ میں میں اُڑتا ہوں امیرؔ !
اڑ کے کیا مجھ سے کوئی طائر چلے

سوالات

۱۔ امیر مینائی کی نعت کے پہلے شعر میں طیبہ سے کون سا شہر مراد ہے؟

۲۔ پھر، گھر، گر وغیرہ جیسے ہم آواز الفاظ کو کیا کہتے ہیں؟

۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے:
لشکرِ اندوہ، نخلِ دل، حُبِ حضرت، شوقِ دل

۴۔ امیر مینائی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۵۔ زیرِ نظر نعت کے پہلے شعر کی تشریح کیجیے، اور "دن اپنے پھر چلے" کی وضاحت کیجیے۔

——— ○○○ ———

ماہر القادری

(۱۹۰۷ء - ۱۹۷۸ء)

اصل نام منظور حسین ہے لیکن ان کی شہرت ماہر القادری کے نام سے ہوئی۔ ان کا مقامِ پیدائش ریاست حیدر آباد دکن ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ کراچی آ گئے اور عمر کا زیادہ حصہ وہیں گزارا۔ وہ شروع ہی سے دینی مزاج رکھتے تھے۔ سلسلۂ قادریہ کی نسبت سے لفظ القادری ان کے ادبی نام کا مستقل حصہ بن گیا۔

ماہر القادری کے والد کا نام محمد معشوق علی تھا جو اپنے گاؤں کے پہلے شاعر، پہلے ادیب اور پہلے انگریزی دان تھے۔ ان کا تخلص ظریف تھا۔ لیکن ان کی شاعری ظریفانہ نہیں تھی بلکہ اردو کے برعکس عربی میں اس لفظ کا معنیٰ (زیرک) کے مصداق ہے۔

ماہر القادری نے اپنے گاؤں کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم پائی اور خاص طور پر فارسی اپنے والد سے پڑھی۔ ماہر القادری نے سعدیؒ کے شعر و ادب کا غیر معمولی اثر قبول کیا۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان مسلم یونیورسٹی سے پاس کیا اور سلسلۂ تعلیم اسی نقطے پر ختم ہو گیا۔

ماہر القادری اگرچہ کسی کالج یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہ تھے لیکن انھوں نے ذاتی طور پر کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا جس میں ہر علم اور ہر فن کی کتابیں شامل تھیں۔ وہ اس قدر صاحبِ مطالعہ تھے کہ ایک طرح کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ فارسی کے علاوہ ماہر القادری نے عربی ادب کا بھی سبقاً" سبقاً" مطالعہ کیا۔

۱۹۲۸ء میں ماہر القادری حیدر آباد دکن چلے گئے، وہاں مہاراجا کشن پرشاد نے ان کی طبیعت کے جوہر کو پہچان کر ان کی علمی و ادبی سرپرستی کی اور وہ حکومتِ دکن کے مختلف محکموں میں ملازمت بھی کرتے رہے۔ دکن چھوڑ کر کچھ عرصہ بجنور (یو۔پی) میں گزارا اور پھر حیدر آباد دکن آ گئے اور وہاں تقریباً دس برس تک رہے۔

اس زمانے کے حالات کے مطابق یہاں ان کو قومی شاعری کا بھی موقع ملا۔ انھی دنوں نواب بہادر یار جنگ نے ایک موقع پر حیدر آباد کے گیسٹ ہاؤس میں قائدِ اعظمؒ سے ماہر القادری کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا:

"میری تقریروں اور ان (ماہر القادری) کی نظموں نے مسلمانانِ دکن میں بیداری پیدا کی۔"

پاکستان کے قیام کے بعد ماہر القادری کراچی آ گئے اور یہاں سے ماہنامہ "فاران" نکالا جو ان کی وفات کے بعد بھی آج تک جاری ہے اور ادب کی برابر خدمت کر رہا ہے۔

۱۹۷۸ء میں ماہر القادری حج کرنے گئے ہوئے تھے کہ مکہ میں منعقدہ ایک مشاعرے میں اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ آج وہ مکہ کے مشہور قبرستان جنّتُ المَعلیٰ میں مدفون ہیں۔

شعر و شاعری

اگرچہ ماہر القادری نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں کچھ نہ کچھ کہا ہے جس میں غزل، گیت، قومی نظمیں وغیرہ سب کچھ شامل ہے لیکن وہ اس اعتبار سے خوش نصیب تھے کہ ان کی شہرت خاص طور پر نعت گوئی میں زیادہ ہے۔ ان کا وہ سلام بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہے جس کا پہلا شعر ہے کہ:

سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

تصانیف و تالیفات

ماہر القادری نے نظم اور نثر دونوں میں قابلِ قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی نثری کتابوں میں "روزنامچے"، "انگڑائی"، "طلسمِ حیات" (افسانوں کے مجموعے) "کاروانِ حجاز" (سفر نامہ) حضورؐ کی نعت اور سیرت کے موضوع پر "آخری رسول" "درِّ یتیم"، "قولِ فیصل"، "خدا اور کائنات اور "نقشِ توحید" اہم ہیں اور نظم میں "محسوساتِ ماہر" "نغماتِ ماہر" "جذباتِ ماہر" اور "ذکرِ جمیل" نعت و منقبت کے مجموعے مقبول ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

ماہر القادری کی شاعری میں آسانی، سادگی، بے تکلفی، فصاحت، بلاغت، سلاست وغیرہ تقریباً سب اوصاف موجود ہیں۔

نعت

نبی دوسرے پیشوا بن کے آئے
محمدؐ مگر مصطفٰی[1] بن کے آئے

کبھی عرش کے کنگروں کو سنوارا
کبھی شمعِ غارِ حرا[2] بن کے آئے

1۔ برگزیدہ، چُنے ہوئے
2۔ مکہ معظمہ میں جبل النور کا مشہور غار۔

وہ مکّہ کی سختی ، وہ طائف کا منظر
محمدؐ خدا کی رضا بن کے آئے

امیروں کو راز اخوّت بتایا
غریبوں کے حاجت روا بن کے آئے

نجاشی [1] بھی خادم ، ابوذرؓ [2] بھی خادم
وہ سلطانِ شاہ و گدا بن کے آئے

انہی کی محبت ہے ایمانِ ماہرؔ
جو کونین کا مدعا بن کے آئے

سوالات

۱۔ جناب ماہر القادری نے کب اور کہاں وفات پائی اور وہ کس جگہ مدفون ہیں؟

۲۔ ایک نعت گو شاعر کے طور پر ماہر القادری کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟

۳۔ اس نعت میں غارِ حرا اور طائف کی تلمیحات کن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

۴۔ نجاشی اور ابوذرؓ دونوں کو خادم کیوں کہا گیا ہے؟

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے۔

خدا کی رضا۔ حاجت روا ۔ سلطانِ شاہ و گدا ۔ کونین کا مدعا۔

— ○○○ —

۱۔ حبش یا حبشہ کا حکمران جس کے زمانے میں مسلمان ہجرت کر کے وہاں گئے۔

۲۔ نامور صحابیؓ
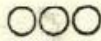
محسن کاکوروی

(۱۸۲۷ء - ۱۹۰۵ء)

نام محمد محسن اور محسن ہی تخلص تھا۔ کاکوری میں پیدا ہونے کی وجہ سے محسن کاکوروی مشہور ہیں۔ ان کے آباء و اجداد ارضِ مقدس حجاز کے باشندے تھے۔ ان کے خاندان نے بعض اور جگہوں سے ہوتے ہوئے آخر میں ضلع لکھنؤ کے قصبہ کاکوری میں بود و باش اختیار کر لی۔ محسن یہیں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی حسن بخش ایک ممتاز عالم دین تھے۔ انھوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں حضرت آدمؑ سے سرورِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے مفصل حالات درج ہیں۔

روایت ہے کہ محسن نو سال کے تھے کہ انھیں خواب میں سید الانبیاو المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس خواب کا حال انھوں نے خود ایک جگہ فارسی زبان میں قلم بند کیا ہے۔ بعد میں انھوں نے یہ خواب فارسی میں نظم بھی کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی سب سے پہلی نظم بھی وہی تھی جو اس خواب پر اظہار مسرت کے لیے لکھی گئی تھی۔

محسن کاکوروی کی شاعری میں خاص طور پر نعتیہ کلام زیادہ ملتا ہے۔ ان کی وجہ شہرت بھی ان کا یہی نعتیہ کلام ہی ہے جس میں خاص طور پر ان کی نعتیہ مثنویوں کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے بیٹوں مولوی محمد نور الحسن اور مولوی محمد انوار الحسن نے ان کا کلام جمع کر کے محفوظ کر لیا تھا جو "کلیاتِ نعتِ محسن" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ نعتوں کے علاوہ ان کے مجموعہ کلیات میں صحابہ کرامؓ کے مناقب بھی موجود ہیں اور بعض دیگر اصناف پر بھی اشعار ملتے ہیں جن میں تاریخ گوئی بھی شامل ہے۔

خصوصیاتِ کلام

جہاں تک محسن کاکوروی کے کلام کی خصوصیات کا تعلق ہے، ان کی شاعری مجموعی طور پر زبان دانی کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ہندی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں لیکن وہ ہندی الفاظ اس طرح صفائی اور مہارت سے بندھے ہیں کہ وہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔

وہ اپنے نعتیہ قصائد کی تشبیب میں برِ صغیر کا ماحول پیدا کر کے پھر گریز کی طرف آتے اور اسے اسلامی ماحول میں تبدیل کر دیتے ہیں، اس طرح اسلامی ماحول اور اسلامی فضا مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ دیگر خوبیوں میں بلاغت، فصاحت، سلاست، روانی وغیرہ بھی موجود ہیں۔ محسن اول و آخر نعت گو شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں دیگر موضوعات پر زیادہ کچھ شامل نہیں۔ وہ خود ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

آل و اصحابِ خیرُ الانام

(منقبت)

تقدس مآبان اوجِ حضور
بلند اخترانِ کرامت ظہور !

ابوبکرؓ — لاثانیِ روزگار
کہ تھا ثانی [1] اثنینِ یارانِ غار

عمرؓ — نام و ناموسِ نام آوری
معمائے اَسرارِ پیغمبری

سخا جلوہ عثمانِؓ عالی مقام
انیسِ پیمبر علیہ السلام

علیؓ — شیرِ یزدان و عالی وقار
یدُ اللہ اور قبضے میں ذوالفقار

مُلک رتبہ خاتونِ جنت بتولؓ [2]
مہِ اوجِ تنزیہ، بنتِ رسولؐ

حُسنؓ — خاتمِ خاتمُ المرسلین
سیادت کا الماسِ زیرِ نگین

1۔ دو میں سے دوسرا مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ
2۔ حضرت فاطمہؓ مراد ہیں۔

شہادت کا لختِ جگر، نورِ عین
نیامِ شجاعت کا خنجر حسینؓ

تمام آل و اصحابِ خیرالانام[۱]
اس امت کا ہر پیشوا و امام

(کلیاتِ نعتِ محسن)

سوالات

۱۔ منقبت سے کیا مراد ہے؟

۲۔ حمد، نعت اور منقبت کا فرق واضح کیجیے۔

۳۔ حسب ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے۔

اوجِ حضور، یارانِ غار، شیرِ یزداں، زیرِ نگیں، نورِ عین۔

۴۔ ہر شعر میں ایک شخصیت کا ایک ایک خاص لقب یا وصف بیان ہوا ہے۔ اپنے الفاظ میں ان کی تشریح لکھیے۔

——— ○○○ ———

۱۔ مخلوق میں سے بہترین مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

غزل

ناقدینِ شعرو سخن کی اکثریت نے آج تک غزل کی تعریف کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے' اس کے مطابق غزل کا معنٰی ہے :

عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ تعریف یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ غزال (ہرن) شکاری کے تیر یا شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر مایوسی کے عالم میں جو دردناک آواز نکالتا ہے' وہ غزل ہے۔

غزل کا لفظ عربی زبان کا ایک مصدر ہے جس کا معنٰی "کاتنا" ہے۔ اسی سے "مِغزَل" ماخوذ ہے جو چرخے یا تکلے کو کہتے ہیں۔

ادب کی بعض اصطلاحات مثلاً شعر اور نظم کے معانی بھی قابلِ غور ہیں۔ شعر کا معنٰی "گوندھنا" اور نظم کا مطلب "پرونا" ہے۔ اس اعتبار سے غزل' شعر اور نظم ایسے الفاظ ہیں جو ایک خاص قسم کے ضبط' ترتیب اور سلیقے کا اظہار کرتے ہیں۔

ان تعریفوں کے پس منظر میں جو حقائق یا مسلمات آشکار ہوتے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

- غزل کی زبان' اس کا لہجہ اور اندازِ بیان اسی طرح شائستہ' نرم اور لطیف ہونا چاہیے جس طرح ایک مہذب معاشرے میں عورتوں سے گفتگو کے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔
- غزل کے استعارات' تشبیہات' کنایات' علامات وغیرہ دنیائے حُسن و عشق سے حاصل کیے جائیں تاکہ بیان میں لطافت اور دلبری قائم رہے۔
- مجموعی طور پر غزل میں سوز و گداز اس کا ایک لازمہ ہے۔

یہ تعریفات اور حقائق آج بھی متفق علیہ ہیں اور بہت حد تک اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ لیکن غزل کی جامعیت اور ہمہ گیری ان "حدود" کو اکثر پھاند گئی ہے تاہم اس نے اپنے مزاج کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب غزل میں عشق و محبت کے جذبات کے علاوہ اخلاق' تصوف' فلسفہ بلکہ دین و سیاست تک کے موضوعات سامنے آئے ہیں تو بھی غزل کا شعر غزل ہی کا شعر محسوس ہوا ہے اور نظم سے بالکل الگ اور نمایاں نظر آیا ہے۔

جہاں تک غزل کی ہیئت یا صورت کا تعلق ہے' اگرچہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک اردو غزل نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے لیکن آج بھی اس کا قالب یا سانچہ وہی ہے جو روزِ اول اس کے لیے تیار ہو گیا تھا البتہ معنوی طور پر غزل بہت حد تک بدل سکتی ہے اور وہ بدل چکی ہے۔ اس طرح اس نے اپنے دامن کو بہت زیادہ کشادہ کر لیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ غالب جیسے عظیم

اور منفرد شاعر کو غزل کی تنگ دامانی کی شکایت تھی اور اس نے کہا تھا کہ :

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

آج یہ زمانہ ہے کہ غزل میں ہر قسم کے افکار و خیالات اور مشاہدات و تجربات کو سمونے اور سمانے کی گنجائش موجود ہے۔ یہ گنجائش اور کشادہ دامانی بجا لیکن جہاں غزل کا مزاج نظر انداز کر دیا جائے، وہاں یہ چیز کچھ غیر مانوس صورت ضرور پیدا کر دیتی ہے۔

غزل آج ایک بالکل جدا اور الگ صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ لیکن ایک زمانے میں وہ قصیدے کا ایک حصہ تھی۔ اس رائے یا خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ قصیدے اور غزل دونوں کا مزاج اور ہیئت ایک سی ہے۔

قصیدے کا پہلا شعر بالکل غزل کی طرح ہوتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں قافیوں اور ردیف کا اہتمام۔ اور غزل غیر مردف ہو تو دونوں مصرعوں میں قافیوں کا اہتمام پھر بھی ضروری ہو گا۔ غزل کے اس پہلے شعر کو "مَطلع" کہا جاتا ہے اور غزل کے آخری شعر، جس میں شاعر عام طور پر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، اسے "مَقطع" کہتے ہیں۔

باقی اشعار میں قصیدہ اور غزل آپس میں بالکل ملتے جلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ مطلب کا حامل ہوتا ہے اور قصیدے میں حصہ وار مدح، تخلص یا گریز، طلب، دعا یا مذمت وغیرہ ہوتے ہیں۔

جس طرح قصیدے کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں، اسی طرح غزل کے اشعار کی تعداد پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ غزل کے اشعار کی تعداد قصیدے کے مقابلے میں کافی کم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود غزل کے اشعار پانچ سے لے کر ڈیڑھ سو تک بھی دیکھے گئے ہیں۔

غزل شروع شروع میں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، الگ صنفِ سخن نہیں تھی اور نیز اس کے اشعار معنوی اعتبار سے کسی ایک مربوط موضوع پر نہیں ہوتے، اس لیے اس کی اس "پریشان خیالی" کے باعث اس پر اعتراضات بھی بہت کیے گئے لیکن دیکھا جائے تو یہی "پریشان خیالی" غزل کی انفرادیت اور خوبی بھی ہے کہ اس طرح اس کا ہر شعر خیال یا تخیل کی اپنی ایک الگ دنیا میں لے جاتا ہے۔

مختلف زمانوں میں غزل پر بہت سخت وار کیے گئے اور اس کا وجود مٹا دینے کے لیے زور لگایا گیا لیکن یہ اس قدر سخت جان صنف ثابت ہو چکی ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت میں نہ صرف یہ کہ کوئی فرق نہیں آیا بلکہ یہ روز بروز شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرتی جا رہی ہے۔

غزل کا بہترین دَور میر اور غالب کا دَور تھا۔ اس دَور میں اور بھی بہت سے ممتاز غزل گو پیدا

ہوئے۔ حالی کا زمانہ آیا تو غزل کا مزاج ہی بدل گیا اُس مزاج کے زیر نظر اقبال کی غزل بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ ہاں البتہ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو مر مر کر جی اٹھتی ہے۔ اس نے اقبال کے بعد بھی آج تک بے شمار غزل گو پیدا کیے ہیں۔ نامور غزل گو شعرا میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، غلام ہمدانی مصحفی، خواجہ حیدر علی آتش، میر انشاء اللہ خاں انشا، میرزا اسد اللہ غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم مومن خان مومن، الطاف حسین حالی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، اقبال اور ان کے بعد کے متعدد غزل گو شعرا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

— ○○○ —
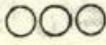
وَلی دکنی

(۱۶۶۸ء - ۱۷۰۷ء)

اردو کے عظیم شاعر، جنھیں اردو غزل کا "باوا آدم" بھی کہا گیا ہے، ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے نام میں اگرچہ مؤرخین نے اختلاف کیا ہے، تاہم اکثریت کا خیال ہے کہ محمد ولی یا شاہ ولی اللہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ تخلص ولی مگر ولی دکنی کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے وطن اورنگ آباد میں بیس برس تک تحصیلِ علوم کرتے رہے۔ پھر احمد آباد چلے گئے۔ احمد آباد اس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ یہاں شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسے میں داخل ہو گئے جہاں دور دراز کے مقامات سے لوگ تحصیلِ علوم کے لیے آتے تھے۔ بعد ازاں اپنے وطن واپس آ گئے اور شعر گوئی میں منہمک ہو گئے اور اتنی مشق بہم پہنچائی کہ بہت کم مدت میں مشہور ہو گئے۔

تصوف سے فطری لگاؤ کے سبب صوفیوں اور درویشوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اور ان کی صحبت سے روح کا سکون حاصل کرتے تھے۔ اسی جستجو میں انھوں نے دلی کا دو بار سفر اختیار کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں میاں سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے انھیں بہت متاثر کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب شاہ صاحب سے ذرا بے تکلفی ہو گئی تو ولی نے انھیں اپنا کلام سنایا۔ شاہ صاحب خود بھی فارسی کے مشاق شاعر تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس شاعر میں شعر گوئی کی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں مگر اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے جو زبان اس نے اختیار کی ہے، وہ ایک محدود علاقے تک موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مضامین میں بھی جو مناسبت ہے، وہ اس کے کلام کو مقامی حیثیت سے آگے نہ بڑھنے دے گی، تب شاہ صاحب نے ولی کو مشورہ دیا کہ

> "یہ سب مضامین جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں، ان کو ریختہ میں شاہ جہان آباد کے محاورے کے مطابق کام میں لاؤ، تم سے کون محاسبہ کرے گا۔"

شاہ صاحب کا یہ مشورہ ولی کے دل کو لگا اور انھوں نے شعر گوئی کی نہج ہی بدل دی۔ دوسری مرتبہ جب محمد شاہ کے عہد میں دلی کا سفر کیا تو ریختہ کا دیوان تیار کر چکے تھے۔ جب یہ دیوان دلی پہنچا تو اس کو اتنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی کہ شاید ہی کسی شاعر کے کلام کو نصیب ہوئی ہو گی۔ ولی کا کلام تقریباً بھی اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مستزاد، ترجیع بند وغیرہ

ولی صوفی، صاف باطن تھے۔ بادشاہوں اور امیروں کے دربار سے ہمیشہ لاتعلق رہے۔ لہذا کسی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ نہیں لکھا۔ البتہ اپنے دوستوں اور بزرگوں کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔

غزل سے ان کے مزاج کو بہت قریبی تعلق تھا۔ گوشت پوست کی زندگی ان کی غزل کی بنیاد ہے۔ ان کے کلام میں کسی مرحلے پر یاس و ناامیدی کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کی زبان بہت سادہ ہے۔

ان کے کلام میں موسیقی ایسی رچی بسی ہوئی ہے کہ ہر لفظ بلا تامل روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلیات خاصا ضخیم ہے اور متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

ولی نے ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں احمد آباد میں انتقال کیا اور وہ وہیں دفن ہوئے۔

(۱)

وہ صنم جب سوں[۱] بسا دیدۂ حیران میں آ
آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گلگشتِ چمن
اے چمن زارِ حیا ! دل کے گلستان میں آ

یاد آتا ہے مجھے جب وہ گلِ باغِ حیا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ دامان میں آ

نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں
دفترِ درد بسا عشق کے دیوان میں آ

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں
درد کہتی ہے رمرا ' زلف ترے کان میں آ

غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حالِ ولی
ظلم کو چھوڑ سجن ' شیوۂ احسان میں آ

۱۔ جب سے۔ اب متروک ہو چکا ہے۔

(۲)

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں [1] سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین، غزالاں سوں کہوں گا

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی
یو کشورِ ایراں میں سلیماں [2] سوں کہوں گا

مجھ پر نہ کرو ظلم تم اَے لیلیٰ [3] خوباں!
مجنوں ہوں ترے غم کوں بیاباں سوں کہوں گا

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی!
اس خواب کو جا یوسفِ کنعاں سوں کہوں گا

قربان پری مکھ پہ ہوئی چوب سی جل کر
یہ بات عجائب مہِ تاباں سوں کہوں گا

بے صبر نہ ہو اَے ولی! اس درد سوں ہرگز
جلتا ہوں ترے درد میں، درماں سوں کہوں گا

سوالات

۱۔ ولی دکنی کی غزلوں میں استعمال شدہ مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے:
دیدۂ حیران، آتشِ عشق، گلِ باغِ حیا، دفترِ درد، پردۂ تجرید، لعلِ بدخشاں۔

۲۔ علم بیان کی اصطلاح میں کسی مشہور واقعے، قصے یا روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔

۱۔ ایک شہر جو ہیروں اور جواہرات کے لیے مشہور ہے۔
۲۔ نامور پیغمبر جو حکمران بھی تھے۔
۳۔ قصہ لیلیٰ مجنوں کی نامور محبوبہ۔

مثلاً ۔ "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" میں حضرت ابراہیمؑ کے کمالِ ایمان اور عشقِ الٰہی میں پختگی اور نمرود کے ایک خاص اہتمام سے آپ کو آگ میں پھینکنے کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ زیرِ نظر غزل نمبر ۲ میں تلمیحات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تفصیل لکھیے۔

۳۔ ولی دکنی کے اشعار میں سوں، کوں وغیرہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ آج ان کی ترقی یافتہ صورت کیا ہے؟

۴۔ غزل کے پہلے شعر کو جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں (ردیف کا ہونا ضروری نہیں) "مطلع" کہتے ہیں مثلاً میر تقی میر کی غزل کا مطلع ہے:

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

آخری شعر میں شاعر بالعموم اپنا تخلص لاتا ہے، اسے مقطع کہتے ہیں۔ مثلاً:

سرہانے میؔر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ولی کی دونوں غزلوں کے مَطلع اور مَقطع کی نشاندہی کیجیے۔

—— ○○○ ——
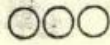
خواجہ میر درد

(۱۷۱۹ء - ۱۸۸۵ء)

نام خواجہ میر اور تخلص درد تھا۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب کا ذہنی میلان بھی شعرو شاعری کی طرف تھا۔ ان کا دیوان "نالہ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے۔ خواجہ میر درد کے آباء و اجداد بخارا سے ہجرت کر کے برصغیر میں آئے تھے۔ درد کے والد شاہی منصب دار تھے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد سب کچھ چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ درد کی تربیت میں ایک تو ان کے والد کا بھی بہت حصہ تھا' دوسرے انھوں نے اپنے زمانے کے صوفیا سے بھی کسب فیض کیا۔ درد نے صرف گیارہ برس کی عمر میں قرآن اور حدیث کے علاوہ فقہ اور تصوف کی بھی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے دَورِ شباب میں سپاہیانہ زندگی اختیار کی لیکن طبیعت تصوف کی طرف مائل ہونے کے باعث کچھ ہی دیر بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ان کا خاندان دہلی میں پیری مریدی کے لیے مشہور تھا۔ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہو گئے۔ انھیں اپنے ذاتی اوصاف نیکی اور پرہیز گاری کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور آئے دن کی خانہ جنگی اور لوٹ مار سے تنگ آکر جب اکثر شعرا دہلی کو چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف چلے گئے تو ان حالات میں صرف درد وہ شاعر تھے جو ہر حال میں وہاں موجود رہے اور زندگی کے آخری لمحات تک دہلی ہی میں گزارے۔

جہاں تک درد کی شاعری کا تعلق ہے تو ان کے دیوان کو ایک طرح "انتخاب" ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں کم درجہ اشعار بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ درد کی شاعری ان کی حقیقی زندگی کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے جذبات' سلوک و معرفت کے حقائق کے ساتھ اس طرح مل جل گئے ہیں کہ شاعری میں ایک نئی روایت قائم ہو گئی ہے۔ درد کے بہت سے اشعار حقیقی اور مجازی دونوں طرح ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ درد کے اشعار میں بے ساختگی اور روانی نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں عام بول چال کا انداز بھی جھلکتا ہے۔ درد چونکہ ایک درویش منش شاعر تھے' اس لیے بھی ان کے اشعار پیشہ ور شاعروں کے مقابلے میں بہت حد تک مختلف ہیں۔ درد موسیقی کے اسرار و رموز سے بھی باخبر تھے' اس لیے ان کے اشعار میں جذبات محبت کے ساتھ موسیقیت کا بھی حسین امتزاج ہے۔

درد کی شاعری کے موضوعات میں اللہ تعالیٰ کی معرفت' اللہ کے قرب کا حصول' انسانی زندگی کا مقصد' نیکی کا صحیح تصور وغیرہ نمایاں ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کا کوئی شعر بھی حکمت سے خالی نظر نہیں آئے گا۔ وہ تصوف کے بعض خشک مسائل کو بھی عمدہ شاعرانہ زبان میں ادا کرنے پر قادر تھے۔ ان کی غزل میں دہلی کے دیگر نمایاں شاعروں کی طرح رچاؤ اور گھلاوٹ عام ہے۔

خصوصیاتِ کلام

درد کی شاعری کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں :

صوفیانہ انداز، سادگی اور روانی، تغزل، ناصحانہ انداز، وحدت الوجود، عشقِ مجازی، احساسِ عظمتِ انسانی، سوز و گداز، نغمگی اور موسیقیت، نشاطیہ لب و لہجہ وغیرہ۔ اردو شاعری میں صوفیانہ جذبات و خیالات اور افکار و محسوسات درد سے پہلے بھی موجود تھے لیکن مجموعی طور پر سب سے پہلا صوفی شاعر درد ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ درد کی اپنی ذات اور شخصیت میں جو اوصاف اور خوبیاں موجود تھیں، وہ ان کی شاعری میں بھی بہت حد تک عکس کی صورت میں سامنے آگئی ہیں۔ درد کا دیوان خاصا مختصر ہے لیکن اس کے باوجود وہ اردو شاعری میں ایک خاص امتیاز اور انفرادیت کا حامل ہے۔

(ا)

اب کی ترے دَر سے گر گئے ہم
پھر یہ ہی سمجھ کہ مَر گئے ہم

جوں نورِ نظر، ترا تصوّر!
تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم

جز اہلِ صفا بتا تو جوں عکس
اے آئنہ! کس کے گھر گئے ہم

کس نے یہ ہمیں بھُلا دیا ہے
معلوم نہیں کدھر گئے ہم

تھا عالمِ جبر، کیا بتاویں
کس طَور سے زیست کر گئے ہم

جس طرح ہوا، اسی طرح سے
پیمانۂ عمر بھر گئے ہم

افسوس کہ دردؔ ! اس کو جب تک
ہووے ہے خبر، گزر گئے ہم

(۲)

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خَلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ ! چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

اے گُل ! تو رخت باندھ، اٹھاؤں مَیں آشیاں
گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے، باغباں مجھے

رہتی ہے کوئی بِن کہے میرے تئیں تمام
جوں شمع چھوڑنے کی نہیں یہ زباں مجھے

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل
سنگِ گراں ہوئی ہے یہ خوابِ گراں مجھے

کچھ اور کنجِ غم کے سوا سوجھتا نہیں
آتا ہے یاد جب کہ وہ کنجِ دہاں مجھے

جاتا ہوں خوش دماغ جو سن کر اسے کبھو
بدلے ہے وہیں نظریں، جو دیکھا وہاں مجھے

جاتا ہوں بسکہ دم بدم اب خاک میں ملا
ہے خضرِ[1] راہ دردؔ ! یہ ریگِ رواں مجھے

---

[1] نامور راہنما بزرگ جو حضرت موسیٰ کے قصے میں مشہور ہیں۔

سوالات

۱۔ خواجہ میر درد صوفیانہ شاعری کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی غزلوں میں صوفیانہ خیالات کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ درد کی غزلیات میں ان تراکیب کی تشریح کیجیے:
نورِ نظر، اہلِ صفا، عالمِ جبر، پیمانہ عمر، ریگِ رواں۔

۳۔ درد کے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

تھا عالمِ جبر، کیا بتاویں
کس طور سے زیست کر گئے ہم

۴۔ تشبیہ کے معانی کسی خاص لحاظ سے ایک شے کو دوسری شے جیسا ظاہر کرنا ہے۔ مثلاً میر کا شعر ہے:

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے سخت دل تنگ یوسفؑ جاں ہے

اس میں گھر کو زنداں اور جان کو یوسفؑ کہنا تشبیہ ہے۔ گھر اور زنداں میں وجہ شبہ تاریکی ہے اور جان کو یوسفؑ سے تشبیہ کی وجہ قید میں دل تنگی ہے۔ اس تعریف کی روشنی میں درد کی پہلی غزل میں دوسرے اور تیسرے شعر میں تشبیہات کی نشاندہی کرتے ہوئے، ان کی وضاحت کیجیے۔

— ○○○ —
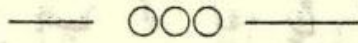
میر تقی میر

(۱۷۲۴ء - ۱۸۱۰ء)

اصلی نام محمد تقی اور تخلص میر تھا۔ میر تقی میر کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے لیکن زندگی کے مختلف حالات کے باعث آخر دہلی آ گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ طبیعت میں شعرو شاعری کا ذوق فطری تھا جو سراج الدین علی خان آرزو کے پاس رہ کر اور نکھر گیا۔ خان آرزو اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے اور میر کے سوتیلے ماموں تھے۔ میر نے کچھ عرصہ اپنے اسی ماموں کے پاس گزارا تھا۔

میر نے اپنی تصنیفات "نکات الشعرا" اور "ذکرِ میر" میں خود اپنے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ اکبر آباد (آگرے) کے رہنے والے تھے۔ برِّصغیر میں وارد ہونے سے پہلے ان کے آباء و اجداد حجاز کے باشندے تھے۔ میر کے والد کا نام محمد علی تھا جو اپنی پرہیز گاری اور صوفی منشی کے باعث علی متقی کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ میر بڑے ہوئے تو ان پر بھی رفتہ رفتہ صوفیانہ رنگ چھا گیا۔ میر کے بعض اشعار میں بھی یہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔

میر کے کلام میں غزلیات کے علاوہ مثنویاں وغیرہ بھی شامل ہیں لیکن ان کی وجہِ شہرت زیادہ تر غزل اور صرف غزل ہے۔ غزل میں بلا مبالغہ میر کو امام و پیشوا کا مقام حاصل ہے اور اس کا اعتراف ان کے ممتاز ہم عصروں نے بھی کیا ہے مثلاً سودا ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں :

سوداؔ! تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

ناسخ کہتے ہیں :

شبہ ناسخؔ ! نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب کہتے ہیں :

غالبؔ ! اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

ذوق نے کہا:

نہ ہُوا پر نہ ہُوا میر کا انداز نصیب
ذوقؔ ! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ہمارے دَور کے حسرت موہانی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ :

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرتؔ !
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

میر کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا جائے گا۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں کہ :

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سُنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

اور ایک جگہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ :

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہُوا

"میرا فرمایا ہوا" کے الفاظ میر کی زبان سے برے نہیں لگتے بلکہ ان کی سچائی کا ثبوت معلوم ہوتے ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

میر کے کلام میں جو خصوصیات نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں، ان میں ان کی غم پرستی، درد مندی، سوز و گداز، آدابِ محبت، واقعیت پسندی، تغزل، زندگی کی بے ثباتی کا احساس، کہیں کہیں تکرار الفاظ، تصوف، تشبیہات، مترنم بحریں اور اشعار میں گفتگو کا انداز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غالب سے پہلے میر غالباً اردو کے سب سے بڑے غزل گو تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر ہی نہ تھے بلکہ کہنے والوں نے انھیں خدائے سخن بھی کہا ہے۔

تصانیف

۱۔ نکاتُ الشعراء

اس کتاب کو میر کی تصانیف میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ دراصل میر کا لکھا ہوا تذکرۂ شعراء ہے جس سے خود میر کے شعری میلانات اور پسند وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ ذکرِ میر

اس کتاب کا موضوع اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب میر کے حالاتِ زندگی معلوم

کرنے کے لیے ایک مستند اور معتبر کتاب ہے۔

۳۔ کلیاتِ میر

اس میں میر کا ہر قسم کا کلام مثلاً غزلیات، قصائد، مثنویاں وغیرہ سب کچھ یکجا ہو گیا ہے۔

(۱)

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو باس کیا

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ — ایک عالَم کا روشناس کیا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن — شوق نے ہم کو بے حواس کیا

عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے — قَیس[۱] کی آبرو کا پاس کیا

صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی — کیا پتنگے نے اِلتماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں!
میر کو تم عَبَث اداس کیا

(۲)

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں — ایک خانہ خراب ہیں دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک — پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

تن کے معمورہ میں یہی دل و چشم — گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں

ایک سب آگ، ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

پاؤں میں وہ نشہ طلب کا نہیں — اب تو سرمستِ خواب ہیں دونوں

۱۔ بنو عامر کا نامور عاشق مراد مجنوں۔

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ!
اب جو دیکھو، سراب ہیں دونوں

(۳)

اِدھر سے ابر اٹھ کر جو گیا ہے
ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے

مقامر خانۂ[1] آفاق وہ ہے
کہ جو آیا یہاں کچھ کھو گیا ہے

سرھانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

(۴)

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بُکا کرے ہے، گاہے دُعا کرے ہے

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو مَلا کرے ہے

کیا کہیے داغِ دل ہے، ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

---

[1] دنیا کا جوا خانہ مراد دنیا

بیٹھے ہے یار آ کر جس جا پہ ایک ساعت
ہنگامۂ قیامت واں سے اٹھا کرے ہے

سوالات

۱۔ میر کی غزلیات میں ان تراکیب کی تشریح کیجیے :

مثالِ آئینہ ، لعلِ لب ، سرمستِ خواب۔ مقامر خانۂ آفاق

۲۔ میر کی غزلیات سے ان کے تغزل کی کیا خصوصیات سامنے آتی ہیں ؟

۳۔ میر کے مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ
ایک عالم سے روشناس کیا

☆

ایک سب آگ ، ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

۴۔ میر کے اس شعر میں کس تلمیح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے
قیس کی آبرو کا پاس کیا

۵۔ استعارہ کا لغوی معنٰی عاریتاً" طلب کرنا ہے۔ مگر اصطلاح میں اس لفظ کو ' جو غیر وضعی معنی میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو' استعارہ کہتے ہیں۔ اس کے درج ذیل تین ارکان ہوتے ہیں :

۱۔ مستعار لہٗ (یعنی مانگا ہوا اس کے واسطے)

۲۔ مستعار منہٗ (یعنی مانگا ہوا اس سے)

۳۔ استعارہ میں وجہ شبہ کو وجہِ جامع کہتے ہیں۔

مثلاً جیسے بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول ؐ میں۔ میں حضرت علی اکبرؓ کو "بلبل" اور مجمع اہلِ بیتؓ کو "ریاضِ رسولؐ" (باغ) سے استعارہ کیا ہے۔ ارکانِ استعارہ حسبِ ذیل ہوں گے :

ا) مستعارلہٗ = حضرت علی اکبرؓ، مستعار منہٗ = بلبل اور وجہ جامع = خوش آوازی و کشش۔

۶۔ اسی غزل کے دوسرے شعر کی تشبیہ کے حوالے سے تشریح کریں۔

۷۔ لغت میں "لف" کے معنی لپیٹنا اور "نشر" کے معنی پھیلانا کے ہیں مگر علم بدیع میں صنعت لف و نشر یہ ہے کہ کلام میں پہلے کئی چیزیں بیان کریں، اس کے بعد ہر ایک کے منسوبات اور متعلقات کا ذکر بغیرِ تعین کریں۔ تعین کی ضرورت اس لیے نہیں کہ سامع ان منسوبات کو خود ہی سمجھ لے گا کہ کس کس سے متعلق ہیں۔ اگر یہ منسوبات اسی ترتیب سے بیان ہوں جس طرح کہ وہ چیزیں، جن سے یہ متعلق ہیں، بیان ہوئی ہیں تو لف و نشر مرتب ہے، ورنہ غیر مرتب کہلائے گا۔ اگر لف کی ترتیب کو نشر میں الٹ دیں تو اسے لف و نشر معکوس الترتیب کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا تعریف و وضاحت کی روشنی میں مثالیں دیکھیے :

لَف و نشرِ مرتب :

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و نم و رم و آرام

لَف و نشرِ غیر مرتب :

شرمندہ ہے زلف و رخ و قامت سے چمن میں
گلبرگِ تر و سرو سہی، سنبلِ سیراب

شاملِ کتاب میر کی دوسری غزل کے چوتھے شعر میں نشاندہی کیجیے کہ یہاں صنعتِ لف و نشر کی کون سی حالت استعمال کی گئی ہے۔

——— ○○○ ———

مصحفی

(۱۷۵۰ء - ۱۸۲۵ء)

نام شیخ غلام ہمدانی اور تخلص مصحفی تھا۔ ان کے والد شیخ ولی محمد تھے۔ مصحفی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے شاعرانہ خیالات و کمالات کے باعث کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ کچھ عرصہ سلطنت اودھ کے صدر مقام فیض آباد میں بھی گزار چکے تھے۔

جن دنوں وہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت میں تھے' وہاں کچھ دنوں بعد سید انشاء اللہ خاں انشا دہلوی بھی آ گئے اور انھوں نے آتے ہی مرزا سلیمان شکوہ کے مزاج میں بہت حد تک دخل حاصل کر لیا۔ انشا کے آنے کے بعد مرزا سلیمان شکوہ نے مصحفی کی تنخواہ کم کر دی اور انشا سے اصلاح لینے لگے۔ مصحفی یہ کچھ دیکھ کر اور بد دل ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ اس دور میں انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ہوتے رہے۔ دونوں جانب ہجو و استہزا کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ انشا کو ایک تو رؤسا کی سرپرستی حاصل تھی اور دوسرے انھیں طبعاً" ظرافت بلکہ مسخرگی کا ملکہ حاصل تھا' اس لیے مصحفی اس حد تک ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انشا اور مصحفی کا وہ دَور اہلِ علم کی قدر دانی کا دور نہ تھا۔ اس دَور کے نواب اور امرا میراثیوں گویوں اور مسخروں کے زیادہ دلدادہ تھے۔

مصحفی کو فطرت نے غیر معمولی اہلیت و صلاحیت سے نوازا تھا لیکن مقدر یاور نہ تھا' اس لیے عمر کا بیشتر حصہ افکار اور پریشانیوں میں گزرا۔ مصحفی کے بعض اشعار پر میر تقی میر نے بھی داد دی ہے۔ مصحفی نے بعض قصائد بھی لکھے ہیں لیکن ان کے کلام کا زیادہ حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ غزل میں مصحفی کا جو نام اور مقام ہے' اسے نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ فراموش۔ اردو میں مصحفی کے آٹھ دیوان موجود ہیں جن میں غزلیات کے علاوہ قطعات' قصائد اور مثنویاں شامل ہیں۔ ایک فارسی دیوان بھی مصحفی کی یادگار ہے۔ دیگر تصنیفات میں "مثنوی بحر المحبت"' "تذکرہ ہندی گویاں" جو اردو شاعروں کا تذکرہ ہے اور "رسالہ علمِ عروض" اور "مجمع الفوائد" کے نام لیے جا سکتے ہیں

مصحفی کے کلام کی نمایاں خصوصیات میں غنائیت' لطافت' جمال پسندی' نفاست' دھیما پن' لہجے کی گرمی' کلام کی شیرینی' خوبصورت ردیف اور قوافی شامل ہیں۔

(۱)

خواب تھا یا خیال تھا' کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا' کیا تھا

بجلی چمکی تھی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا ' کیا تھا

شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا ' کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا ' کیا تھا

مصحفیؔ ! شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا ' کیا تھا

(۲)

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر

طرفہ سوجھی یہ جنوں کی ترے دیوانے کو
راہ میں پھینک دیے خارِ مغیلاں لے کر

ابر کی طرح سے کر دیں گے زمانے کو نہال
ہم جدھر جائیں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
خبر آمدِ ایامِ بہاراں لے کر

مصحفیؔ ! گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث تختِ سلیماںؑ [1] لے کر

---

[1] حضرت سلیمان کا تخت جو پیغمبر ہونے کے علاوہ حکمران بھی تھے۔

سوالات

۱۔ مصحفی کے مختصر حالات زندگی لکھیے۔

۲۔ مصحفی کے کلام کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

۳۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مطلب تحریر کیجیے:

روزِ ہجر، دشتِ جنوں، خارِ مغیلاں، دیدۂ گریاں، اسیرانِ قفس، گوشۂ عزلت، تختِ سلیمان

۴۔ اس شعر کا مطلب تحریر کیجیے:

مصحفی! گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عَبَث تختِ سلیماںؑ لے کر

۵۔ پہلی غزل میں استعارات کی نشاندہی کریں۔

۶۔ دوسری غزل کے دوسرے شعر میں صنعت کا استعمال ہوا ہے، نشاندہی کریں۔

۷۔ دوسری غزل کے آخری شعر میں تلمیح کی نشاندہی کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کیجیے۔

——— ○○○ ———
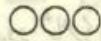
انشاؔ

(۱۷۵۶ء - ۱۸۱۷ء)

سید انشاء اللہ خاں نام اور انشا تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام میر ماشاء اللہ خاں تھا' جو ایک ماہر طبیب ہونے کے علاوہ شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ انشا عہدِ طفولیت ہی سے نہایت ذہین تھے۔ انھیں شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنا کلام اصلاح کی غرض سے کسی کو نہیں دکھایا۔ ابتدا میں یہ راہنمائی انھیں ان کے والد ہی سے مل گئی جو ان کے لیے کافی تھی۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے زمانے میں انشا کے والد دہلی چھوڑ کر مرشد آباد چلے گئے۔ وہ ایک خوشحال آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو لاڈ پیار سے پالا اور ضروری حد تک علوم و فنون سکھائے۔ سید انشا کچھ عرصہ مرشد آباد میں گزارنے کے بعد پھر دہلی آ گئے۔ یہاں ان دنوں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت تھی جو خود شاعر تھے۔ انھوں نے سید انشا کی اہلیت و صلاحیت دیکھ کر انھیں اپنے اہلِ دربار میں شامل کر لیا۔ یہاں وہ بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل ہو گئے۔

سید انشا فارغ التحصیل ہو کر ایک عالی دماغ شخصیت کے طور پر سامنے آئے لیکن ان کی طبیعت میں ایک قسم کا چلبلا پن بھی تھا۔ تنوع پسندی کی وجہ سے وہ کسی ایک فن کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے' البتہ شاعری ان کا مستقل شوق اور مشغلہ تھا۔

سید انشا کے ہم عصروں میں خواجہ میر درد' مرزا عظیم بیگ' مصحفی' آتش وغیرہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ مصحفی کے ساتھ ان کا شعری معرکہ اردو شاعری میں خاص طور پر مشہور ہے۔ مصحفی نسبتاً" سنجیدہ آدمی تھے۔ ذہنی طور پر کسی ادبی چشمک کے لیے تیار نہ تھے۔ مجبوراً کچھ عرصہ مقابلہ کرتے رہے لیکن انشا حدود سے گزر جانے والے شخص تھے' اس لیے بظاہر انشا جیت گئے۔

انشا کی زندگی کا آخری دَور پریشانی میں گزرا۔ لیکن اس زمانے کے عام حالات اور خصوصاً" درباری ماحول نے ان کے مزاج میں مسخرگی سی پیدا کر دی تھی جو آخری عمر میں ان کے لیے وبال جان بن گئی۔

مولانا محمد حسین آزاد ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیفات کا ذخیرہ بہت کچھ ہو گا مگر جو کچھ میری نظر سے گزرا ہے' ان میں سے ایک کلیات ہے۔ اس میں اردو غزلوں کا دیوان' دیوان ریختی' قصائد اردو' فارسی غزلوں کا دیوان' فارسی مثنویاں وغیرہ ہیں۔"

عربی قواعد پر ان کی ایک فارسی مثنوی اور اردو قواعد پر "دریائے لطافت" خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

خصوصیاتِ کلام میں شوخی' معاملہ بندی' طنز و طعن' مشکل بحریں اور سنگلاخ زمینیں شامل ہیں۔

(۱)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری ! راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کس کو ، آہ ! ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو !
جسے پوچھو ، یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بَھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا !
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۲)

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے ، کہو اور سنو !
بات میں تم تو خفا ہو گئے ، لو اور سنو !
تم کہو گے جسے کچھ ، کیوں نہ کہے گا تم کو
چھوڑ دے گا وہ بَھلا ، دیکھیے تو اور سنو !
یہ بھی انصاف ہے کچھ ، سوچو تو اپنے دل میں
تم تو سو کہہ لو ، مری اِک نہ سنو ، اور سنو !
اب تو کچھ اتنے خفا ہو کہ کہو ہو مجھ سے
ہے قسم تم کو ، مرا نام نہ لو اور سنو !

بات میری جو نہیں سنتے اکیلے مل کے
ایسے ہی ڈھب سے سناؤں کہ سنو اور سنو !
شکوہ مند آپ سے انشا ہو، سو اس کا کیا دخل
تم نہ مانو تو کہیں چپکے چھپو اور سنو !

سوالات

۱۔ انشا کے مختصر حالات زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ انشا کی غزلیات میں خاص طور پر کیا خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

۳۔ حسب ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے :
نکہتِ بادِ بہاری، نقشِ پائے راہرواں، کوئے تمنا۔

۴۔ اس شعر کا مطلب تحریر کیجیے :
کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

۵۔ تمام مظاہرِ قدرت کی کچھ نہ کچھ علت ہوتی ہے جن کی وجہ سے وہ ظہور میں آتے ہیں لیکن صنعتِ حسنِ تعلیل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صحیح سبب اور ہر معلول کی صحیح علت بیان کی جائے بلکہ کسی چیز کی ایک ایسی علت فرض کر لی جاتی ہے جو دراصل اس کی علت ہوتی نہیں۔ یہ صنعت کم و بیش ہر شاعر کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً :

۔ پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

اس میں فرات کی موجوں کا ساحل سے سر پٹکنا اس وجہ سے تھا کہ سپاہِ خدا یعنی حضرت حسینؓ کے جاں نثار ساتھی تین رات سے پیاسے تھے۔ انشا کی شاملِ کتاب پہلی غزل کے چوتھے شعر کی تشریح اس وضاحت کی روشنی میں کریں۔

—— OOO ——

آتش

(۱۷۶۴ء - ۱۸۴۶ء)

نام خواجہ حیدر علی اور تخلص آتش تھا۔ وہ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ آتش کے بزرگوں کا اصلی وطن بغداد تھا لیکن تذکرہ "ریاض الفصحا" کے مطابق ان کے اجداد ترک وطن کر کے شاہجہان آباد آ گئے اور پرانے قلعے میں مقیم ہو گئے تھے۔

آتش کے والد نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد آئے۔ آتش ابھی بچپن ہی گزار رہے تھے کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست نہ ہو سکا۔ آتش کا خاندان بزرگوں کا خاندان تھا۔ جس میں فقیری کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی موجود تھا۔ اس کے نتیجے میں آتش کے مزاج پر فقر و استغناء کا رنگ غالب تھا۔ آتش کا ذریعۂ معاش کوئی خاص نہ تھا۔ ان کو گزر اوقات کے لیے نواب اودھ کی طرف سے کچھ وظیفہ ملتا تھا اور وہ اسی میں قناعت کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ آتش کے شاگردوں میں نواب مرزا شوق، پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی اور محمد خاں رند وغیرہ مشہور ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

جہاں تک آتش کی شاعری کا تعلق ہے تو وہ اول و آخر لکھنؤ کے دبستان شاعری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے اشعار میں ان کی طبعی آزاد خیالی اور قلندری کا رنگ بھی موجود ہے۔ خاندانی فقر و درویشی کی وجہ سے فقر و غنا اور توکل کے مضامین بھی ان کے اشعار میں ملتے ہیں۔ لکھنوی دبستان کا رنگ موجود ہونے کے باوجود آتش کی غزلوں میں مجموعی طور پر تکلف اور تصنع کا اثر نسبتاً کم ہے۔ وہ شاعری کو مرصع کاری سمجھتے تھے۔ آتش کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات و محسوسات کو نہایت دلکش الفاظ اور مؤثر انداز سے ادا کرتے ہیں۔

نواب غلام مصطفیٰ شیفتہ کی نظر میں آتش کا مرتبہ شاعری ناسخ سے بلند تر ہے۔ آتش کو جذبات محبت لکھنوی انداز میں بیان کرنے کا فن خوب آتا تھا۔ ان کے کلام میں رعایت لفظی اور دیگر صنائع و بدائع بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں سادگی، روانی اور سلاست کی مثالیں بھی عام ہیں۔ آتش کے کلام میں لکھنوی شاعری کا ابتذال اور رکاکت کم سے کم ہے۔ آتش کے کلام کی خوبیوں میں زبان کی شستگی، لکھنوی انداز، رندانہ مضامین، تغزل، قلندرانہ انداز، تشبیہات و استعارات، صوفیانہ مضامین، امید افزائی، عشقیہ مضامین اور آتش بیانی کے پہلو خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

آتش کی تصانیف کے سلسلے میں ان کا دیوان ہی اہم ہے جس میں ان کا وہ سب کلام موجود ہے جو مختلف اصنافِ سخن کی صورت میں موجود ہے۔

(۱)

آئنہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرۂ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

عالمِ حسن خدا دادِ بتاں ہے کہ جو تھا
ناز و اندازِ بلائے دل و جاں ہے کہ جو تھا

راہ میں تیری شب و روز بسر کرتا ہوں
وہی میں اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

روز کرتے ہیں شبِ ہجر کو بیداری میں
اپنی آنکھوں میں سبک خوابِ گراں ہے کہ جو تھا

اثر منزلِ مقصود نہیں دنیا میں !
راہ میں قافلۂ ریگِ رواں ہے کہ جو تھا

کون سے دن نئی قبریں نہیں اس میں بنتیں
یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

دین و دنیا کا طلب گار ہنوز آتشؔ ہے
یہ گدا سائلِ نقدِ دو جہاں ہے کہ جو تھا

(۲)

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے ۔۔۔ کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے
زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا ۔۔۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن ۔۔۔ لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر[۱]، نہ ہے قبرِ دارا[۱] ۔۔۔ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

۱۔ دونوں نامور حکمران تھے۔ اور ان دونوں میں جنگ ہوئی تھی۔

تمھارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے ۔ دل و دیدہ اہلِ عالم میں گھر ہے

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے ۔ غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں

کرے جس قدر شکرِ نعمت ، وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

سوالات

۱۔ آتش کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ آتش کے کلام میں کیا خصوصیات نمایاں ہیں۔

۳۔ حسب ذیل تراکیب کا مطلب بیان کیجیے :

سینۂ صاحب نظراں ، چہرہ شاہدِ مقصود ، قافلۂ ریگِ رواں ، سائل نقد دو جہاں۔

۴۔ اس شعر میں کس تلمیح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نہ گورِ سکندر ، نہ ہے قبرِ دارا

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

۵۔ اگر کلام میں دو ایسے لفظ لائے جائیں کہ ایک کے معنیٰ دوسرے سے متضاد ہوں تو علم بدیع کی اصطلاح میں اسے "صنعتِ تضاد" کہتے ہیں۔ یہ دو لفظ اسم بھی ہو سکتے ہیں ، فعل بھی اور صرف حرف بھی۔ جیسے عالم و جاہل ، چلنا اور بیٹھنا ، "سے" اور "تک" متضاد ہیں مثلاً اس شعر میں لفظ "زمین" اور "آسمان" استعمال ہوئے ہیں ۔

مری قدر کر اے زمینِ سخن

کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

اس تعریف کی روشنی میں زیرِ نظر آتش کی غزلوں میں یہ صنعت کس غزل کے کس کس شعر میں استعمال ہوئی ہے۔ نشاندہی کیجیے اور وضاحت کیجیے۔

۶۔ آتش کی دونوں غزلوں میں جس جس شعر میں استعارے ، تشبیہ اور تلمیح کا استعمال ہوا ہے ، ان کی وضاحت کیجیے۔

— ○○○ —

بہادُر شاہ ظفؔر

(۱۷۷۵ء - ۱۸۶۲ء)

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ تھے۔ وہ جب تخت پر بیٹھے تو ان کی عمر تقریباً" تریسٹھ برس تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بظاہر ناکام جنگِ آزادی کے واقعے کے بعد انگریزوں نے ان کو گرفتار کر کے برما کے دارالحکومت رنگون بھیج دیا جہاں طرح طرح کے آلام و مصائب جھیل کر وہ ایک روز کس مپرسی کی حالت میں دیارِ غیر ہی میں انتقال کر گئے۔

بہادر شاہ ظفر کا مزاج اس دَور کے مطابق کچھ تو شروع سے شاعرانہ تھا اور کچھ ان کے ماحول سے مزید شاعرانہ ہو گیا۔ وہ ابتدا میں استاد ابراہیم ذوق کے شاگرد رہے اور پھر ذوق کے انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہو گئے۔ لیکن مجموعی طور پر ان کے کلام پر ذوق کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی شاعری زیادہ تر قدیم انداز کی شاعری ہے۔ وہ اپنے خیالات کو مشکل زمینوں میں ڈھال کر اشعار کہتے تھے۔ جہاں کہیں انھوں نے اس روایت سے ہٹ کر ذاتی حوالے سے شعر کہے ہیں ' وہ نسبتاً" اثر سے زیادہ لبریز ہیں اور ان کی دلی اور ذہنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ خصوصاً" قید و بند اور نظر بندی کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر کا ذاتی مشغلہ صرف شعر و شاعری ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مجموعہ کلیات خاصا ضخیم ہے۔ ان کی عمر کا کافی حصہ آلام و مصائب اور مشکلات میں گزرنے کی وجہ سے ان کے کلام میں اداسی ' افسردگی اور آزردگی کی مثالیں عام ہیں۔

ظفر کے کلام میں سلاست اور روانی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں لیکن زیادہ تر ان کے کلام میں سنگلاخ زمینوں اور مشکل قوافی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر اگرچہ شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن بہت پہلے سے حکومت کے حالات دگرگوں ہو جانے کی وجہ سے ان کی زندگی ایک مجبور اور بیکس شخص کی زندگی نظر آتی ہے جس کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔

کلیاتِ ظفر

بہادر شاہ ظفر کا مجموعۂ کلیات خاصا ضخیم ہے جو چار دواوین پر مشتمل ہے۔ ظفر کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں ' جن کو پڑھ کر اس دَور کے بعض سیاسی حالات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ظفر کی کلیات میں اردو کے علاوہ بعض دیگر زبانوں مثلاً پنجابی اور پوربی کے اشعار بھی ملتے ہیں۔

(۱)

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں ' نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے ' میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

مرا رنگ روپ بگڑ گیا ' مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا ' میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں

پۓ فاتحہ کوئی آئے کیوں ، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا ، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا ، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

(۲)

وقتِ غفلت اور ہے ، ہنگامِ ہشیاری ہے اور
خواب کی سیر اور ہے اور سیرِ بیداری ہے اور
درد مندانِ محبت کا ، طبیبوں سے علاج
کس طرح سے ہو سکے ، یارو ! یہ بیماری ہے اور
پھڑکے کب پابندِ الفت کی طرح محبوس دام
وہ اسیری اور ہے اور یہ گرفتاری ہے اور
دل کو نظروں ہی میں لے لینا ، نہ کرنا منہ سے بات
سیکھی ان آنکھوں نے اب یہ مردم آزاری ہے اور
زخمِ تیغِ عشق کھانے میں ہیں کیا کیا لذتیں
اور نمک پاشی بھی ہو تو پھر مزہ داری ہے اور
دیکھ کر تاثیر اپنے نالہ ہائے زار کی !
ہم نے جانا اے ظفرؔ ! یہ آہ اور زاری ہے اور

سوالات

۱۔ بہادر شاہ ظفر کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔
۲۔ بہادر شاہ ظفر کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔
۳۔ بہادر شاہ ظفر کے اس شعر کی تشریح کیجیے :

پۓ فاتحہ کوئی آئے کیوں ، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں

غالبؔ

(۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

میرزا اسد اللہ بیگ نام اور غالب تخلص تھا۔ وہ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میرزا عبداللہ بیگ تھا۔ ان کا تعلق ترکوں کے اس خاندان سے تھا جو سمرقند سے ہجرت کر کے برصغیر پاک و ہند میں آباد ہو گیا تھا۔

غالب ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد راج گڑھ کی جنگ میں گولی لگنے سے فوت ہو گئے۔ اس کے بعد غالب کی پرورش کا بوجھ ان کے چچا میرزا نصراللہ بیگ کے کندھوں پر آ پڑا۔ اس کے چار سال بعد غالب کے چچا بھی ہاتھی سے گر کر وفات پا گئے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے نانا نے اپنے ذمے لے لی۔ یہاں انھیں ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔

غالب ابھی تیرہ سال کے تھے کہ ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے کر دی گئی۔ غالب کی شادی دہلی میں ہوئی تھی، اس لیے وہ اس کے بعد دہلی ہی میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ غالب اپنی زندگی میں معاشی طور پر کبھی آسودہ حال نہیں رہے کیونکہ ان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ ایک دور میں چچا کی پنشن پر گزارہ تھا، وہ بند ہو گئی تو غالب کے معاشی حالات مزید خراب ہو گئے۔ غالب کا مزاج شاہانہ تھا۔ وہ آمدنی نہ ہونے کے باوجود اپنی شاہ خرچیوں کو روک نہیں سکتے تھے اور اس قسم کی صورت حال میں مختلف لوگوں سے قرض لینے پر مجبور تھے۔ غالب کی زندگی کا بہت سا حصہ پنشن واگزار کرانے کی کوششوں میں بسر ہو گیا۔ ذوق کی وفات کے بعد غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد ہو گئے اور اس طرح ان کی معاشی حالت کچھ عرصے کے لیے کسی حد تک بہتر ہو گئی۔

غالب اردو اور فارسی کے نابغۂ روزگار تھے۔ ان کے اردو کلام کو جو شہرت اور پذیرائی حاصل ہے، وہ ادب کے عام قاری کو بھی معلوم ہے۔ غالب اپنے اردو کلام کو فارسی کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

فارسی بیں تا بہبینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

غالب کی ادبی اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا جانے لگا تھا اور آج وہ بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ علامہ اقبال نے غالب کے بارے میں جو لکھا ہے، اس سے بڑھ کر کوئی اور کیا کہہ سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی، تا کجا!

غالب کے مزاج میں خود پسندی بہت زیادہ تھی۔ اس کا اثر ان کے کلام پر بھی واضح ہے۔ غالب

انسانی نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے ' اس لیے ان کے کلام میں انسانی جذبات و محسوسات کی عکاسی خوب سے خوب تر صورت میں نمایاں ہے۔

شاعری میں غالب کی یادگار خاص طور پر اردو اور فارسی کے دیوان ہیں۔ غالب نے اپنے احباب وغیرہ کو وقتاً" فوقتاً" جو خطوط لکھے ' وہ اگرچہ اس وقت ذاتی حیثیت سے لکھے گئے تھے لیکن آج ان کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ ایسے خطوط کے مجموعوں میں "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" خاص طور پر مشہور اور مقبول ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

اگر غالب کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو وہ حسب ذیل ہوں گی :

مشکل پسندی ' نادر تشبیہات ' تمثیل اور کنائے کا انداز ' اختصار و ایجاز ' شوخی و ظرافت ' پہلو داری ' سہل ممتنع ' تصوف ' سوز و گداز ' فلسفیانہ نقطہ نظر وغیرہ۔

غالب نے ۱۸۶۹ء میں دہلی ہی میں وفات پائی اور وہیں جامع مسجد کے نزدیک ان کا مزار ہے۔

(۱)

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری ' بندہ پرور ! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے ' کیا

حضرت ناصح گر آئیں ' دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عُذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید ' اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں ، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا ، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ !
ہم نے یہ مانا کہ دلی[1] میں رہیں ، کھائیں گے کیا

(۲)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے　　ذوقِ نظارہ جمال کہاں !

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا　　شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے　　اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا　　دل میں طاقت ، جگر میں حال کہاں

فکرِ دنیا میں سَر کھپاتا ہوں　　میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ !
وہ عناصر میں اِعتدال کہاں

(۳)

کسی کو دے کے دل ، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

---

[1] مشہور شہر دلی جو آج کل بھارت کا دارالحکومت ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل ! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفَس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم !
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے ، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالؔب !
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

سوالات

۱۔ غالب کے مختصر حالات زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ غالب کے کلام میں کیا خصوصیات نمایاں ہیں ؟

۳۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مطلب تحریر کیجیے :

فرشِ راہ ، خانہ زادِ زلف ، قحطِ غمِ الفت ، فرصتِ کاروبارِ شوق ، ذوقِ نظارۂ جمال ، سودائے خط و خال ، نوا سنجِ فغاں۔

۴۔ اس شعر کا مطلب بیان کیجیے :

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

۵۔ نصاب میں شامل غالب کی پہلی اور دوسری غزل میں صنعتِ تضاد کے استعمال کی نشاندہی کرتے ہوئے ان اشعار کی تشریح کریں۔

۶۔ غالب کی غزلوں میں سے اس کے کلام کی خصوصیات یعنی مشکل پسندی، نازک خیالی، اختصار، شوخی و ظرافت کی مثالیں پیش کیجیے اور ان کے ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

—— ○○○ ——
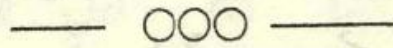
مومن

(۱۸۰۰ء - ۱۸۵۱ء)

نام مومن خان اور تخلص بھی مومن تھا۔ ان کے والد کا نام غلام نبی خان تھا۔ مومن خان کا تعلق دہلی کے شاہی طبیبوں کے خاندان سے تھا جس کے عوض بادشاہ سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔ ان کے والد کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے خاص ارادت تھی۔ شاہ صاحب ہی نے ان کا نام مومن خان رکھا تھا۔

مومن کا گھرانا دہلی کا ایک متمول اور خوشحال گھرانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ مروجہ علوم سیکھے۔ ان کے کلام میں طب' نجوم' ریاضی' موسیقی وغیرہ کی اصطلاحات سے ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شطرنج بہت عمدہ کھیلتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ مومن خود بھی طبیب تھے۔ طبابت اور بزرگوں کی پنشن سے جو کچھ ملتا' اس میں بسر اوقات بآسانی ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی علم و فن کو پیشہ نہیں بنایا۔ ان کے یہاں اہلِ اقتدار کے قصیدے نہیں ملتے۔ دلی سے پانچ مرتبہ باہر گئے لیکن وطن کی محبت نے ہر بار اپنی طرف کھینچ لیا۔ ۱۸۵۱ء میں مکان کی چھت سے گرے۔ اپنے دست و بازو ٹوٹنے کی تاریخ خود کہی جو ان کی تاریخِ وفات بھی ثابت ہوئی۔ مومن کی یادگار ان کا ایک دیوان اور چھ (۶) مثنویاں ہیں۔

مومن عاشقانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کا جوانی کا کلام اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یوں تو مومن نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک میں اپنا مخصوص رنگ پیدا کیا' مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں بھرپور تغزل ملتا ہے کیونکہ انھوں نے اس کو صرف حسن و عشق کے معاملات تک محدود کر لیا تھا۔ یہ خصوصیت شاعری میں "معاملہ بندی" کہلاتی ہے۔ اس سے اگر ایک طرف ان کے یہاں یکسانیت اور یک رنگی پیدا ہوئی تو دوسری طرف ایک محدود دائرے میں رہ کر شعر کہنے سے ان کی قدرتِ کلام اور ان کے تخیل کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر یہ معاملات ان کی ذاتی زندگی میں بھی موجود تھے' اس لیے ان میں ایک صداقت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی بات کو براہِ راست بیان نہیں کرتے بلکہ ایک پیچ دے کر بیان کرتے ہیں جس سے ان کے یہاں اکثر ابہام کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال نے اس کیفیت کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ ان کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں یہ پیچیدگی نہیں۔ معنی آفرینی اور جدت بیان کے اعتبار سے بہت کم شاعر اردو میں مومن کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔ بات سے بات نکالنا اور چند لفظوں میں وسیع معنی اور گہرے مطالب ادا کر جانا مومن کے تغزل کا امتیازی وصف ہے۔ اپنی غزلوں کے مقطعوں میں تخلص کی مناسبت سے ذہنوں میں خاص معنویت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ غرض فنی لحاظ سے مومن کی غزل ایک دل آویزی اور دل کشی رکھتی ہے۔ بعض ناقدین کے خیال کے مطابق مومن کے بعض اشعار میں ابہام اور پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔

غالب نے ایک بار مومن کے ایک شعر سے متاثر ہو کر یہ کہا تھا کہ کاش مومن خان مومن میرا سارا دیوان لے لیتا لیکن یہ شعر مجھے دے دیتا۔ اگر یہ وقتی اور جذباتی بات بھی ہو تو بھی غالب ایسے نابغۂ روزگار کی طرف سے مومن کی شاعری کو یہ بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

خصوصیاتِ کلام

مومن کے کلام میں جو خصوصیات نمایاں ہیں ان میں سے حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

نزاکتِ تخیل' معاملہ بندی' شاعرانہ مکر' محاکات' ابہام' ندرت وغیرہ

(۱)

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز' دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز ! دیکھنا
اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنامِ یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس ! نزاکتِ آواز دیکھنا
کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح[۱]
کرنا سمجھ کے دعوئِ اعجاز' دیکھنا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم[۲] سے
مومن ! غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

(۲)

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے' کئی بے جاں ہوں گے
تابِ نظارہ نہیں' آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
تو کہاں جائے گی' کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

۱۔ مسیح۔ حضرت عیسیٰ ابن مریم کا لقب
۲۔ دوزخ کے مختلف ناموں میں سے ایک نام۔

ناصحا ! دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

داغِ دل نکلیں گے تُربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومن !
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

سوالات

۱۔ مومن خاں مومن دہلوی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ مومن کی غزلیات کے ذریعے سے ان کے کلام کی کیا خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں؟

۳۔ حسبِ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے:

تابِ نظارہ، خوابِ عدم، غمزۂ غماز، مرغِ پَرشکستہ، طبعِ حزیں، دعویٰ اعجاز۔

۴۔ حسبِ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

داغِ دل نکلیں گے تُربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

☆ ☆ ☆

کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز، دیکھنا

۵۔ مومن کی دونوں غزلوں میں تلمیح، تشبیہ اور صنعتِ تضاد کا استعمال ہوا ہے، نشاندہی کریں۔

—— ○○○ ——

داغ

(۱۸۳۱ء - ۱۹۰۵ء)

نام نواب میرزا اور تخلص داغ تھا۔ دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے' اس لیے عام طور پر داغ دہلوی کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ وہ ذوق کے شاگرد تھے اور اردو زبان کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہے۔

داغ کے والد نواب شمس الدین خان کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں پھانسی دے دی تھی۔ وہ اس واقعے کے بعد ہی رامپور چلے گئے تھے اور وہاں نواب کلب علی خان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں کچھ عرصہ گزار کر وہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے جہاں ان کو نظام حیدر آباد کے استاد کا منصب حاصل ہو گیا۔ حیدر آباد میں داغ کو پہلے ایک ہزار روپے مشاہرہ ملتا تھا جو بعد میں ڈیڑھ ہزار ہو گیا۔ یہ رقم اس زمانے میں کچھ کم نہ تھی۔ اس کے نتیجے میں داغ مالی اعتبار سے فارغ البال تھے۔ بلکہ دولت کی اس فراوانی نے ان کو کم از کم کوئی معاشی پریشانی نہیں ہونے دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بھی کسی قسم کی کوئی افسردگی' آزردگی' درد مندی یا سوز و گداز وغیرہ نہیں ہے جو غزل کے اصلی محرکات ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کے کلام میں شوخی' شرارت' چھیڑ چھاڑ' طنز و طعن' رشک اور بدگمانی کے مضامین عام ہیں اور یہ سب پہلو ان کے کلام کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ مجموعی طور پر داغ نے سلاست و روانی کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں قابلِ ذکر اور قابلِ قدر اضافہ بھی کیا ہے۔ ذوق کی طرح ان کا کلام بھی دلی کی اردو زبان کے سلسلے کی سند ہے۔ دنیا کے اعتبار سے داغ کا سا وقار اور اعتبار کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی شہرت و مقبولیت پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور ان کی شاعری کا ڈنکا ہر طرف بجنے لگا تھا۔ علامہ اقبال بھی ابتدا میں داغ کے شاگرد رہے تھے اور ان کی موت پر اقبال نے ایک پُرتاثیر مرثیہ لکھا تھا جس میں داغ کی شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

اردو غزل کی تاریخ میں داغ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ داغ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ان کے بیان کی شوخی اور دل فریبی ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں بھی ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ داغ کی شہرت ایک غزل گو شاعر کے طور پر ہے لیکن انھوں نے کچھ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ داغ نے اپنے شاعرانہ کلام کی صورت میں اپنے پیچھے جو دیوان چھوڑا ہے' وہ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

داغ کے کلام کی مزید قابلِ ذکر خصوصیات میں ان کا نشاطیہ رنگ' زندہ دلی' ظرافت' ڈرامائی لہجہ' زبان کی بے تکلفی' معاملہ بندی' بے لاگ اظہارِ محبت وغیرہ شامل ہیں۔

(۱)

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا　　جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں　　سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو، مہمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذِلتیں ہوئیں　　لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

گو نامہ بر سے خوش نہ ہُوا، پر ہزار شُکر　　مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغؔ ! جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

(۲)

پوچھتا جا مرے مرقد پہ گزرنے والے !

کیا گزرتی ہے تری جان پہ، مرنے والے !

مرحبا ! اے دل و دیں لے کے مکرنے والے !

ہاتھ کانوں پہ مرے نام سے دھرنے والے !

داغِ دل، داغِ جگر، نقشِ جفا، نقشِ وفا

نہ مٹانے سے مٹیں گے، یہ ابھرنے والے !

آپ محشر[۱] میں بنیں قول کے سچے، کیا خوب

انگلیاں اٹھیں گی، وہ آئے مکرنے والے !

داغؔ کہتے ہیں جنھیں، دیکھیے وہ بیٹھے ہیں
آپ کی جان سے دور، آپ پہ مرنے والے !

۱۔ حشر کا میدان جہاں قیامت کے بعد لوگ اکٹھے ہوں گے۔

سوالات

۱۔ داغ کی غزلیات پڑھ کر اس کا کیا رنگ سامنے آتا ہے۔ داغ کے کلام کی خصوصیات کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کیجیے۔

۲۔ داغ کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معانی لکھیے :

دلِ بے آرزو ' افشائے راز۔

۴۔ حسبِ ذیل اشعار کا مطلب بیان کیجیے :

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ ! جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں ' سامان تو گیا !

☆ ☆ ☆

داغِ دل ' داغِ جگر ' نقشِ جفا ' نقشِ وفا
نہ مٹانے سے مٹیں گے ' یہ ابھرنے والے !

—— OOO ——

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۵ء)

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کے ہم عصر تھے۔ ۱۸۳۷ء میں پنجاب کے ایک مشہور قصبے پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں ۱۷ سال کی عمر میں دلی چلے گئے جہاں تحصیل علم اور مشقِ سخن میں مشغول ہوئے۔ یہیں مرزا غالب سے فنِ شعر میں اصلاح لی اور مشہور ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں ملازم بھی رہے اور ان سے فیض بھی پایا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد تک قدیم رنگ میں غزلیں کہتے تھے۔ ۱۸۷۵ء کے بعد پنجاب پہنچے اور سرکاری بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں آزاد بھی لاہور میں تھے۔ یہاں حالی اور آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لیے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اس زمانے میں حالی نے بے شمار چھوٹی بڑی مذہبی، نیچرل، اخلاقی اور قومی نظمیں لکھیں، جن میں برکھارت، نشاطِ امید، حبِ وطن، مناظرۂ رحم و انصاف بہت مشہور ہوئیں۔ ان نظموں کی بڑی خوبی زبان اور بیان کی سادگی ہے۔

مولانا حالی اور آزاد دونوں کی مشترکہ کوشش سے اردو شاعری کا مزاج بہت حد تک تبدیل ہو گیا اور اردو شاعری میں پہلی بار مشرقی خیالات کے ساتھ ساتھ مغربی خیالات بھی سامنے آئے۔

سرسید کے ساتھ حالی قومی تحریک میں شامل تھے۔ حالی کی قومی نظمیں اس تحریک کے زمانے کی یادگار ہیں جن میں مشہور و معروف نظم "مد و جزرِ اسلام" معروف بہ "مسدّسِ حالی" ہے۔ حالی کی یہ طویل ترین نظم ہے۔ اس کا موضوع مسلمانوں کے شاندار ماضی کا ذکر اور حال کی بے حالی اور مستقبل کے لیے فکر و عمل کی تحریک ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو حالی نے سرسید کی ترغیب و تحریک پر لکھی اور جس کے بارے میں سرسید احمد خان نے کہا تھا کہ اگر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ تم دنیا میں کیا کچھ کر کے آئے ہو تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا کر آیا ہوں۔

غزل میں حالی نے جدید رنگ کا اضافہ کیا۔ روایت کی بے جا تقلید کی بجائے تازگیِ بیان کی طرف توجہ دی اور مبالغے کی جگہ حقیقت کو مدنظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس طرح حالی کو اردو ادب میں بہت سے پہلوؤں کے لحاظ سے امتیاز اور انفرادیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے وہ اردو کے پہلے جدید شاعر ہیں اور اسی طرح پہلے نقاد بھی ہیں۔ مزید برآں اردو کے پہلے سوانح نگار کے طور پر بھی انہی کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس امتیاز و انفرادیت کے باوصف حالی صرف نظم گو شاعر نہ تھے بلکہ غزل میں بھی وہ اس دَور کے کسی اردو شاعر سے کم نہیں ہیں۔ اس دور میں ان کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔ آج غزل میں جو تنوع اور وسعت پذیری نظر آتی ہے اس میں حالی کا حصہ فراموش نہیں کیا جا سکتا ورنہ اس سے پہلے غزل صرف گل و بلبل، شمع و پروانہ، اور عشق و عاشقی اور زلف و رخسار ہی کی داستان تھی۔

شاعری میں مسدّس حالی کے علاوہ دیوانِ حالی بھی ان کا شعری کارنامہ ہے۔ حالی کی دیگر نظمیں اور

مثنویاں الگ بھی چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ نثر نگاری میں بھی حالی کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں اس سلسلے میں ان کی کتابوں کا مختصر تعارف حسبِ ذیل ہے:

۱۔ مقدمۂ شعر و شاعری

یہ کتاب شعر و شاعری کے محاسن و معائب اور اس کے دیگر مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہے۔ یہ شروع میں دیوانِ حالی کے مقدمے کے طور پر وجود میں آئی لیکن اب ایک مستقل تصنیف کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

۲۔ حیاتِ سعدیؒ

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، فارسی کے نامور شاعر شیخ مصلح الدین سعدیؒ کے حالاتِ زندگی اور شاعرانہ خدمات کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

۳۔ یادگارِ غالب

یہ کتاب بھی اپنے نام کے مطابق اردو اور فارسی کے ممتاز ترین شاعر مرزا غالب کی شاعری اور حالاتِ زندگی کے بارے میں ہے۔

۴۔ حیاتِ جاوید

یہ سرسید کے حالاتِ زندگی پر حالی کی ضخیم کتاب ہے جس میں سرسید کی شخصیت اور ان کے علمی، ادبی اور تعلیمی کارناموں کا مفصّل بیان ہے۔

حالی کی وفات کے سلسلے میں عام طور پر سالِ وفات ۱۹۱۴ء لکھا جاتا ہے لیکن وہ ۳۱ دسمبر کی رات کو اڑھائی بجے فوت ہوئے یعنی یکم جنوری شروع ہو چکا تھا، اس لیے ان کا صحیح سالِ وفات ۱۹۱۵ء ہے۔

(۱)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اِس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے باتِ ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دُعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں

(۲)

کل مدّعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

دَیر و حَرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جَرسِ کارواں رہے

پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے، جتنے گراں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالؔی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر بلا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

سوالات

۱۔ حالی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ حالی کے کلام میں کیا نمایاں خصوصیات موجود ہیں؟

۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کا مطلب بیان کیجیے:

نیشِ عشق، لذتِ زخمِ جگر، یارانِ تیز گام، نالۂ جرسِ کارواں، پاسِ وضع۔

۴۔ ان شعروں کا مطلب تحریر کیجیے:

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

دَیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے، ہم جہاں رہے

—— ○○○ ——
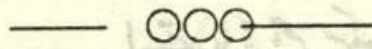
شاد عظیم آبادی

(۱۸۴۶ء - ۱۹۲۷ء)

نام سید علی محمد اور تخلص شاد تھا۔ عظیم آباد (پٹنہ) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید اظہار حسین عرف عباس مرزا تھا۔ شاد نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علوم و فنون اور اردو کے علاوہ عربی و فارسی ادبیات کی تحصیل و تکمیل میں گزارا۔ تعلیمی زندگی کے مختلف مراحل میں انھوں نے متعدد اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ شاد عظیم آبادی میں شعر گوئی کا ذوق فطری تھا۔ وہ ایک خوشحال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس کے علاوہ بیوی کے ترکے سے بھی ہزاروں روپے سالانہ کی آمدن تھی۔ تاہم انتظامی صلاحیت کی کمی، مطالعے کے حد سے زیادہ شوق اور شعر و سخن میں مشغولیت کے باعث وہ اپنی جائداد سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس وجہ سے عمر کا آخری حصہ معاشی الجھنوں میں گزرا۔

اپنے عہد کے مشاہیر ادبا و شعرا اور علما و مصنّفین سے ان کے گہرے روابط تھے۔ خصوصاً سر سید، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، اقبال، امیر مینائی، داغ، سید سلیمان ندوی، حسرت موہانی وغیرہ سے ان کے تعلقات ایک وسیع علمی سلسلے کے حامل تھے۔

یوں تو شاد کے کلام میں مختلف اصناف موجود ہیں لیکن ان کا اصلی میدان غزل ہے۔ ان کے کمالِ شعر گوئی کا جوہر اس میدان میں پوری آب و تاب سے کھلتا ہے۔ شاد کا تعلق اردو غزل گوئی کی تاریخ ارتقا کے اس عہد سے ہے جس میں غزل کے روایتی انداز اور فرسودہ مضامین و موضوعات اور اس کی محدود فضا میں تبدیلی اور توسیع کا عام رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ بحث و نظر اور تنقید و تبصرہ کے نئے نئے پیمانے وجود میں آتے رہتے تھے۔ وسعت بیان کی اہمیت و ضرورت کا احساس روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور مجموعی حیثیت سے ایسا ماحول پیدا ہو چلا تھا جس میں لکیر کا فقیر بنے رہنے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

شاد کے کلام میں وہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک عمدہ اور کامیاب غزل گو شاعر کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی مضامین و موضوعات کے پہلو بہ پہلو غزل کا ایک نیا انداز و اسلوب بھی ملتا ہے۔ شاد کو خود بھی اپنے شاعرانہ کمالات اور اسلوب بیان کی اہمیت کا احساس تھا۔

شاد کے کلام کی خصوصیات میں اسلوبِ بیان کی ندرت اور تازگی موجود ہے۔ اس کی جانب خود ان کے بعض اشعار ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔

شاد کا مجموعۂ کلیات چھپ چکا ہے۔ جس میں "ظہورِ رحمت" کے نام سے ان کا ایک نعتیہ مسدّس بھی شامل ہے۔

(۱)

اسیرِ چشم ہوں میعادِ قید نا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے، خدا معلوم

تری گلی بھی مجھے یوں تو کھینچتی ہے بہت
دراصل ہے مری مٹی کہاں کی، کیا معلوم

دعا کروں نہ کروں، سوچ ہے یہی کہ تجھے
دعا سے قبل مرے دل کا مدّعا معلوم

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے شادؔ!
ہمیں تو آپ نہیں اپنا مدّعا معلوم

(۲)

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے درد! پتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمّا حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے: آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ! یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

سوالات

۱۔ شاد عظیم آبادی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ شاد عظیم آبادی کے کلام کی نمایاں خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

۳۔ شاد عظیم آبادی کے ان اشعار کا مطلب قلم بند کیجیے :

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے ' نہ انتہا معلوم

اے درد ! پتا کچھ تو ہی بتا ' اب تک یہ معمّا حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا ' خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے : آ کچھ بھی نہیں ' پایاب ہیں ہم

۴۔ صنعتِ تضاد کے استعمال کے حوالے سے پہلی غزل کے چوتھے شعر کی تشریح کیجیے۔

——— ○○○ ———
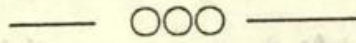
علامہ اقبالؔ ؒ

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

محمد اقبال نام اور تخلص بھی اقبال ہی ہے۔ ان کا مقام پیدائش ہونے کا شرف پنجاب کے شہر سیالکوٹ کو حاصل ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بھی سیالکوٹ ہی میں پائی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور اور اس کے بعد انگلستان میں مقیم رہے۔

علامہ اقبال کا نام ملک خداداد پاکستان کے تخیل کے خالق کے طور پر بھی مشہور ہے۔ اس اعتبار سے وہ صرف ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ قومی راہنما بھی تھے۔ ان کی قومی راہنمائی کا حصہ اس قدر غالب اور نمایاں ہے کہ بعض اوقات ان کی شاعرانہ حیثیت ثانوی معلوم ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ان کی شاعری بھی دراصل ان کی قومی راہنمائی کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر اقبال کو برِصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا علمبردار قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔

اقبال غزل کے مقابلے میں نظم کے شاعر ہیں اور انھوں نے غزل کی ہیئت میں جو اشعار کہے ہیں، وہ غزل کی عام روایت سے بہت مختلف ہیں یا یہ کہہ لیجیے کہ انھوں نے غزل کو مزید نئے راستے دکھائے ہیں اور اس میں محض فرضی محبت سے ہٹ کر اس میں حقیقی، سیاسی اور تہذیبی موضوعات کو بھی شامل کیا ہے۔

اقبال اردو شاعری میں اس قدر بلند نام ہے کہ شاید صدیوں تک کوئی اتنا بڑا قد آور شاعر پیدا نہ ہو سکے۔ اقبال نے شاعری کی شکل میں اپنے افکار و نظریات اور جذبات و محسوسات کا جو سرمایہ چھوڑا ہے، وہ بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔

۱۔ بانگِ درا

یہ مجموعہ اقبال کی بیشتر نظموں اور چند غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں چند ظریفانہ انداز کی نظمیں بھی ہیں۔ شمع و شاعر، شکوہ، جواب شکوہ، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام وغیرہ مشہور نظمیں اسی مجموعے میں شامل ہیں۔

۲۔ بالِ جبریل

اس مجموعے میں زیادہ تر اقبال کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ غزلیات معنوی اعتبار سے غزل کے جدید ترین رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۳۔ ضربِ کلیم

اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں ہیں جو مختلف ضروری موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ اقبال کی دیگر کتابوں میں پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز، اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، سب کی سب مشہور و مقبول ہیں۔

نثر میں اقبال کی کتابوں میں "تشکیلِ جدیدِ الٰہیات" اور "علم الاقتصاد" مشہور ہیں۔ اقبال کی خصوصیات کلام میں عشقِ رسول ؐ، مقصدیت، شاعرانہ مصوری، ندرتِ تشبیہات، اثر آفرینی، تغزل، نادر تراکیب، خودی، عشق و عقل، مردِ مومن اور سوز و گداز شامل ہیں۔

(۱)

تجھے یاد کیا نہیں ہے، مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ

یہ بُتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ [۱]

نہیں اس کُھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس نہ آشیانہ

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

میرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے، یہ نوائے عاشقانہ

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

(۲)

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تُو بیباک نہیں ہے

۱۔ آزر۔ حضرت ابراہیمؑ کا والد جو بت تراش تھا۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مِری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ اُفلاک نہیں ہے

بجلی ہُوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

عالَم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لَولاک [1] نہیں ہے۔

(۳)

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تُو نہیں جہاں کے لیے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
یہ خار و خس کے لیے ہے، یہ نیستاں کے لیے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے، نہ آشیاں کے لیے

---

[1] صاحب لولاک سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے بارے میں حدیث قدسی ہے کہ لَولاکَ لَمَا خَلَقتُ الاَفلاکَ کہ اگر تُو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک

ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

نگہ بلند ' سخن دل نواز ' جاں پُرسوز

یہی ہے رختِ سفر ' میرِ کارواں کے لیے

مرے گلو میں ہے اِک نغمہ جبرئیل[1] آشوب

سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے

سوالات

۱۔ علامہ اقبال کو مفکر شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

۲۔ ان تراکیب کی وضاحت کیجیے:

سرمۂ افرنگ ' صاحبِ لولاک ' بتانِ عصرِ حاضر ' تراشِ آزرانہ ' رختِ سفر ' ادب گہِ محبت ' تب و تابِ جاودانہ ' صاحبِ ادراک ' بحرِ بیکراں۔

۳۔ ان غزلوں میں جو تلمیحات آئی ہیں ' ان کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ نگہ بلند ' سخن دل نواز ' جاں پُرسوز

یہی ہے رختِ سفر ' میرِ کارواں کے لیے

اس شعر کی روشنی میں بتائیے کہ ایک راہنما میں کون کون سی خصوصیات ہونی چاہئیں۔

۵۔ علامہ اقبال کی غزلیں دوسرے غزل گو شعرا کے مقابلے میں کن پہلوؤں سے مختلف ہیں؟

OOO

۱۔ جبرئیل ' نامور فرشتہ جو پیغمبروں کے پاس وحی لایا کرتا تھا۔
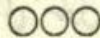
حسرت موہانی

(۱۸۷۸ء - ۱۹۵۱ء)

نام سید فضل الحسن اور تخلص حسرت تھا۔ ان کا مقام ولادت اودھ کا مشہور قصبہ موہان ہے جس کی نسبت سے وہ حسرت موہانی مشہور ہو گئے۔ حسرت موہانی امام علی موسیٰ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام سید از ہر حسن تھا۔ حسرت کے دادا سید محمود نیشا پور سے موہان آئے تھے۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم پرانی طرز پر عمل میں آئی۔ قرآن حکیم اور اردو فارسی کی مروجہ کتابیں اپنے علاقے کے علماء سے پڑھیں۔ اس کے بعد موہان مڈل سکول میں داخل ہو گئے۔

حسرت کے والد کی کچھ جائداد فتح پور میں تھی، جس کے انتظام کے لیے ان کا قیام فتح پور میں رہتا تھا۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے والد کے پاس چلے گئے اور گورنمنٹ ہائی سکول فتح پور سے انھوں نے ہائی سکول کا امتحان خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا جس پر سرکاری وظیفہ بھی ملا۔ یہیں سے انھوں نے عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ یہاں کی آب و ہوا حسرت کی ادبی تعلیم کے لیے بہت راس آئی۔ کچھ عرصہ بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ ڈاکٹر ضیاء الدین (مرحوم) کی دعوت پر علی گڑھ پہنچے۔ یہاں ان کے ہم جماعتوں میں مولانا محمد علی جوہر کے بھائی مولانا شوکت علی اور سید سجاد حیدر یلدرم جیسے نامور سیاست دان اور ادیب بھی شامل تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے حسرت نے عربی اور ریاضی کے اختیاری مضامین کے ساتھ بی۔ اے کر لیا۔

علی گڑھ کے علمی اور ادبی ماحول نے حسرت کی اہلیت و صلاحیت کو مزید جلا بخشی اور خاص طور پر ان کی ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے دور دور ان کے ادبی اور سیاسی رجحان کا شہرہ ہو گیا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے انھوں نے "اردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اس پرچے میں ادبی مضامین کے علاوہ مذہبی اور سیاسی معاملات کے بارے میں بھی مضامین چھپتے تھے۔ یہ رسالہ ادبی اور سیاسی اعتبار سے اس قدر وقیع تھا کہ مولانا شبلی جیسے لوگ اسے باقاعدہ نہ صرف پڑھتے تھے بلکہ اس کے مضامین کی داد دیتے تھے۔

بیک وقت ادب اور سیاست سے لگاؤ کی وجہ سے ان کا نام شاعروں کے علاوہ قومی راہنماؤں میں بھی شامل ہو گیا۔ وہ سیاست میں عملاً حصہ لیتے تھے۔ وہ پہلے کانگریس اور پھر مسلم لیگ میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ وہ انگریزی سیاست کے شدید ترین مخالفوں میں شامل تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں انگریزی حکومت پر تنقید اور قیدِ فرنگ میں بسر کردہ دنوں کا ذکر موجود ہے۔

حسرت موہانی اردو غزل کے ایسے شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے اردو غزل کی کشادہ دامانی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ غزل گو شاعروں میں وہ رئیس المتغزلین کہلاتے ہیں حسرت کی خصوصیاتِ کلام میں غزل کی تمام خوبیاں مثلاً فصاحت، بلاغت، سلاست، روانی، سادگی، بے تکلفی، معاملہ بندی، روز مرہ و محاورہ کی بیشتر مثالیں موجود ہیں۔ حسرت کا مجموعۂ کلیات کئی بار چھپ کر مقبول ہو چکا ہے۔

(۱)

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے

ہشیار کہ اس پُرسشِ پیہم کی نوازش عُشّاقِ ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے

راضی برضا ہم ہیں بہرحال مگر ہاں ڈر ہے کہ یہ خُو تم کو ستم گار نہ کر دے

ہم جَور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے

آگاہ نہیں ہیں جو ابھی ذوقِ ستم سے بیتابیِ دل ان کو خبردار نہ کر دے

ہوتا ہے برا لذّتِ آزار کا لپکا مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے

کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرتؔ!
یہ کشمکشِ غم تجھے بیکار نہ کر دے

(۲)

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے
بندہ پرور! جایئے، اچھا، خفا ہو جایئے

میری تحریرِ ندامت کا نہ کچھ دیجے جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جایئے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جایئے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال
آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جایئے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جایئے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جایئے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ! جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا[1] ہو جایئے

سوالات

۱۔ حسرت موہانی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ حسرت موہانی کے کلام کی چیدہ چیدہ خصوصیات کیا ہیں؟

۳۔ مندرجہ ذیل تراکیب کا مطلب بیان کیجیے:

آرزوئے شوق، پرسشِ پیہم، لذتِ آزار، عہدِ کرم، مہمانِ قضا۔

۴۔ ان اشعار کا مطلب واضح کیجیے:

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا — یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے

ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا لپکا — مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے

———— ○○○ ————

۱۔ موت کے مہمان۔

فانیؔ بدایونی

(۱۸۷۹ء - ۱۹۴۱ء)

نام شوکت علی خاں اور تخلص فانی تھا۔ بدایوں (یو۔پی) کے رہنے والے تھے، اس لیے بدایونی مشہور ہیں۔ ان کے پر نانا صوبہ بدایوں کے ناظم تھے اور ان کی جاگیر سیکڑوں موضعوں پر پھیلی ہوئی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد یہ جاگیر سمٹ کر صرف ۲۰۰ روپے ماہوار تک رہ گئی اور وہ بھی بے انتظامی کے باعث رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔

فانی تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ مدت ایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے لیکن ان کا اصل پیشہ وکالت تھا۔ فانی کی زندگی مصائب اور ناکامیوں کا مجموعہ تھی۔ ان کا دل ہمیشہ غموں سے نڈھال رہتا تھا، اسی لیے ان کے کلام میں آزردگی، افسردگی، مایوسی اور ناامیدی کے مضامین کثرت سے ہیں۔ کچھ اس لیے بھی کہ فانی کے زمانے میں لکھنؤ کی خارجی شاعری کا دور ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ مرثیے نے لے لی تھی۔ لکھنوی شاعری پر بالعموم رنج و غم اور حزن و ملال کا رنگ غالب آگیا تھا۔ اس دور کی غزل پر بھی "مرثیت" کے اثرات نمایاں تھے۔ فانی بھی اپنے دور کے رجحانات سے متاثر ہوئے۔ ان کی فطری افسردگی اور اس ماحول نے ان کی شاعری کو حزن و ملال کی شاعری بنا دیا۔ ان کے کلام میں عالم نزع، موت، میت، کفن، قبر کے مناظر نظر آتے ہیں۔ ان کا تخلص فانی بھی انہی جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ فانی کو ابتدا سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی لیکن ان کے والد انھیں اس شوق سے روکتے تھے۔ فانی کی شاعری کا چرچا ان کے والد کی وفات کے بعد ہو سکا۔

فانی کے زمانے میں لکھنؤ کی خارجی اور فرضی شاعری کو زوال آگیا تھا اور مرثیہ گوئی کے فروغ کی وجہ سے غزل گو شاعروں کو بھی رنج و غم، حزن و ملال اور گریہ و زاری کے سوا کچھ سوجھتا نہ تھا۔ فانی اپنے فطری مزاج کے ساتھ ساتھ اس ماحول سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ بہر حال اردو غزل کے مختلف رنگوں کا ذکر ہو تو فانی کے رنگِ غزل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فانی کی غزل کے اشعار کی صورت میں ان کے دل کے ٹکڑے یہاں اور وہاں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کلام کی خصوصیات

فانی کے کلام کی خصوصیت وہی طبعی رنج و غم، حزن و ملال، افسردگی و آزردگی، مایوسی و ناامیدی وغیرہ کے عام مضامین ہیں۔ اس قسم کے جذبات و محسوسات غزل کے اشعار میں تاثیر و تاثر کا جو رنگ بھر دیتے ہیں، اس سے فانی کی غزلیات ممتاز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فانی کی غزلوں میں سوز و گداز اور رقتِ جذبات کی بھی کمی نہیں۔

فانی کا مجموعہ "دیوانِ فانی" کے نام سے چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے اور ایک طبقے میں خاصا مشہور و مقبول ہے۔

(۱)

زندگی کا ہے کو ہے ‘خواب ہے دیوانے کا	اک معمّا ہے ‘ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

ایک گوشہ ہے یہ دنیا اِسی ویرانے کا	خَلق کہتی ہے جسے دل ،ترے دیوانے کا

رازِ کونَین[۱] خلاصہ ہے اس افسانے کا	مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں

ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ ،مرے مرجانے کا	زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے

سلسلہ شیشے سے ،ملتا تو ہے پیمانے کا	دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں

کہیں پایا .نہ ٹھکانا ،ترے دیوانے کا	ہم نے چھانی ہیں بہت دَیر و حرم کی گلیاں

زندگی نام ہے مَر مَر کے جیے جانے کا	ہر نفَس عمرِ گزشتہ کی ہے مَیّتْ فانؔی !

(۲)

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی ‘ دیکھتے جاؤ
بَھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی ‘ دیکھتے جاؤ

چلے بھی آؤ ‘ وہ ہے قبرِ فانی ‘ دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے ‘ کسی دن خوں رلائے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

۱۔ کونَین۔ کون کا تثنیہ۔ مراد دو جہاں۔

بہار زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم، آخری دیدارِ میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی، دیکھتے جاؤ

سوالات

۱۔ فانی بدایونی کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کیجیے۔

۲۔ فانی بدایونی کے کلام کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

۳۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مطلب واضح کیجیے:
مآلِ سوز، زبانِ حال، عیشِ مرگ۔

۴۔ ان اشعار کا مطلب تحریر کیجیے۔

ہر نفَس عمرِ گزشتہ کی ہے مَیّت فانی!
زندگی نام ہے مَر مَر کے جیے جانے کا

چلے بھی آؤ، وہ ہے قبرِ فانی، دیکھتے جاؤ
تو اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

۵۔ فانی کی غزلوں میں صنعتِ تضاد اور حُسنِ تعلیل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان اشعار کی تشریح بھی کیجیے۔

—— ○○○ ——

اصغر گونڈوی

(۱۸۸۴ء - ۱۹۳۶ء)

اصغر حسین نام اور اصغر ہی تخلص تھا۔ ان کے اجداد کا وطن گورکھپور تھا لیکن اصغر کے والد گونڈہ (بھارت) میں مقیم ہو گئے تھے۔ اصغر اسی نسبت سے گونڈوی کہلاتے ہیں۔ اصغر باقاعدگی سے تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے کی بنیاد پر اپنی علمی اور ادبی قابلیت میں کافی اضافہ کر لیا تھا۔ اصغر گونڈوی شروع میں تجارت کرتے تھے۔ گونڈہ میں ان کا ایک کارخانہ تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔ اصغر دارالمصنفین کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اصغر گونڈوی ابتدا میں وجد بلگرامی اور پھر منشی امیر اللہ تسلیم سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔

وہ حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے مکتبۂ سخن سے وابستہ تھے۔ انھوں نے اپنے اولیں دور کا کلام شائع نہیں کرایا۔ آج ان کے دو شعری مجموعے "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" ہمارے سامنے ہیں اور یہ دونوں ان کی پختہ عمری کے زمانے کی یادگار ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر ان کی غزلیات کے زیادہ تر اشعار میں "دل" کی بجائے "دماغ" کی کارفرمائی ہے۔ ان کے دونوں مذکورہ بالا مجموعوں میں صرف غزلیات شامل ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ صرف غزل ہی کہتے تھے۔

زہد و تقویٰ کے باوجود ان کے کلام میں کہیں کہیں کیف و مستی اور رنگینی کے اوصاف موجود ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے مجموعۂ کلام "سرود زندگی" پر تقریظ لکھتے ہوئے یہ رائے دی ہے:

> "محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے۔ اصغر صاحب کے کلام میں حسن و خوبی پائی۔ میرا فرض تھا کہ اس کی شہادت دوں۔"

وہ لاہور آکر اردو مرکز کے مہتمم بھی رہے ہیں۔

اصغر گونڈی کے تلامذہ میں جگر مراد آبادی کا نام کافی مشہور ہے۔

خصوصیاتِ کلام

اصغر گونڈوی کا کلام عام طور پر عام فہم نہیں ہے۔ اس میں تصوف اور فلسفے کے مضامین ذرا غور طلب ہوتے ہیں۔ اردو کے بہت سے شاعروں کے مقابلے میں اصغر گونڈوی کی زبان عالمانہ و منطقیانہ ہونے کے باوجود صاف، سلیس اور فصیح ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے اعتبار سے وہ بہت حد تک ممتاز اور منفرد ہیں۔

(۱)

شکوہ نہ چاہیے کہ تقاضا نہ چاہیے
جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیے

کیا کم ہیں ذوقِ دید کی جلوہ طرازیاں
آنکھوں کو انتظارِ تماشا نہ چاہیے

وہ بارگاہِ حسن، ادب کا مقام ہے
جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاہیے

تیغِ ادا میں اس کے ہے اِک روحِ زندگی
ہم کشتگانِ شوق کو مرنا نہ چاہیے

(۲)

وہ سراپا حُسن ہے یا نغمۂ بے ساز ہے
چشمِ حیرت ہے کہ اِک فریادِ بے آواز ہے

تو بہت سمجھا تو کہ گزرا فریبِ رنگ و بُو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا
اب قفس بھی ہم اسیروں کو پَرِ پرواز ہے

سننے والا گوشِ بلبل کے سوا کوئی نہیں
ریشہ ریشہ ان گلوں کا اک صدائے راز ہے

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجمُ باز ہے

ختم کر اصغرؔ ! یہ آشفتہ نوائی ختم کر
کون سنتا ہے اسے، یہ درد کی آواز ہے

سوالات

۱۔ اصغر گونڈوی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ اصغر گونڈوی کے کلام کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔

۳۔ ان تراکیب کے مطالب قلم بند کیجیے :

ذوقِ دید، کشتگانِ شوق، تیغِ ادا، فریادِ بے آواز، فریبِ رنگ و بو، صدائے راز، جلوہ طرازیاں، نغمۂ بے ساز، بارگاہِ حسن۔

۴۔ مندرجہ ذیل شعر کا مطلب بیان کیجیے :

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

——— ○○○ ———

جگرؔ

(۱۸۹۰ء - ۱۹۶۰ء)

نام علی سکندر اور تخلص جگر تھا، مراد آباد میں پیدا ہوئے، اس لیے جگر مراد آبادی کے نام سے شہرت پائی۔ شاعری میں وہ اصغر گونڈوی کے شاگرد تھے۔

جگر ایک طرح پیدائشی شاعر تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ ان کے والد اور دادا دونوں کو غزل سے لگاؤ تھا۔ یہ وہ دور تھا، جب ملک میں داغ کی عاشقانہ غزلوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جگر کا مزاج بھی عاشقانہ تھا۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی غزل کی صورت میں قافیہ پیمائی شروع کر دی۔

جگر اول و آخر ایک شاعر تھے۔ انھوں نے اور سب مشاغل کے مقابلے میں اگر کوئی کام نمایاں طور پر کیا ہے تو وہ صرف شعر و شاعری ہے اور اس میں سے غزل گوئی ہے۔ جدید دَور کے غزل گو شاعروں میں جگر کا نام بہت نمایاں ہے۔

جگر صرف اور صرف غزل کے شاعر تھے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کا دار و مدار صرف ان کی غزل گوئی پر ہے۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے لوگوں نے حسرت موہانی کی طرح ان کو بھی رئیس المتغزلین قرار دیا ہے۔ یقیناً یہ امتیاز ان کے قبولِ عام کا ایک ثبوت ہے۔

جگر اردو کے ان مقبول شاعروں میں شامل ہیں جن کو پڑھا بھی گیا اور سنا بھی گیا۔ وہ مشاعروں کے شاعر تھے۔ وہ جب کسی مشاعرے میں شامل ہوتے تو کچھ اپنے کلام کی خوبیوں اور کچھ اپنے دل آویز ترنم کے باعث چھا جاتے تھے اور لوگ ان کے اشعار اور اندازِ ترنم سے مسحور ہو ہو جاتے تھے۔

جگر کے جو شعری مجموعے چھپ چکے ہیں، ان میں حسبِ ذیل خاص طور پر مشہور ہیں:

شعلۂ طُور، جذباتِ جگر، تجلیاتِ جگر، نغماتِ جگر، دردِ جگر اور آتشِ گل

ان کے سارے مجموعے مقبولِ عام ہوئے۔ جگر کے قبولِ عام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی شاعری زیادہ عام فہم، ہیجان پرور، زود اثر، رنگین اور حسین تھی۔ اسی لیے ان کی غزلوں سے لطف اندوز ہونا اور استفادہ کرنا آسان تھا۔ پھر جگر کے پڑھنے کا انداز ایسا ساحرانہ تھا کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ان کی محفل سے جو اٹھتا، وہ شعر و موسیقی کا ایسا تاثر لے کر اٹھتا کہ مدتوں جگر اور ان کے کلام کو یاد رکھتا۔

جگر کے استاد اصغر گونڈوی کی شاعری کا رنگ متصوفانہ تھا لیکن جگر پر اپنے اس استاد کے رنگ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ اصغر کی صحبتوں سے جگر کا دل نہیں البتہ ذہن بہت حد تک بدل گیا۔ اس کے نتیجے میں جگر کے کلام پر فکری اعتبار سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑا۔ اس طرح پہلے جو باتیں جگر کے صرف دل سے نکلتی تھیں، اب ان میں ایک حد تک دماغ بھی شامل ہو گیا۔ اس دور کی شاعری میں جگر

کے یہاں قومی جذبات اور سیاسی محسوسات بھی نظر آتے ہیں۔

خصوصیاتِ کلام کے اعتبار سے جگر کی شاعری میں تغزل کے تمام اوصاف موجود ہیں۔

(۱)

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا ! دل کچھ اس صورت سے تڑپا، اس کو پیار آ ہی گیا

جب نگاہیں اٹھ گئیں، اللہ رے معراجِ شوق دیکھتا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

ہائے یہ حُسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بو میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

ہاں سزا دے اے خدائے عشق ! اے توفیقِ غم پھر زبانِ بے اَدب پر ذکرِ یار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ مَیں در حقیقت مجھ کو جیسے اِعتبار آ ہی گیا

ہائے کافر دل کی یہ کافر جُنوں انگیزیاں تم کو پیار آئے نہ آئے، مجھ کو پیار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

(۲)

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گل سے پریشانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حُسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

محبت میں اِک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی

جگؔر! وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

سوالات

۱۔ جگر مراد آبادی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔
۲۔ جگر مراد آبادی کے کلام کی خصوصیات کیا کیا ہیں؟
۳۔ جگر کے ان اشعار کی وضاحت کیجیے:

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی

مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح لکھیے:
معراجِ شوق، حسنِ تصور، توفیقِ غم۔

—— ००० ——

ناصر کاظمی

(۱۹۲۵ء - ۱۹۷۲ء)

نام سید ناصر رضا اور تخلص ناصر تھا۔ وہ پورے نام کی بجائے ناصر کاظمی کے نام سے مشہور تھے۔ کیونکہ ان کا خاندانی تعلق امام موسیٰ کاظم سے تھا۔

ناصر کاظمی انبالہ ضلع پنجاب میں پیدا ہوئے۔ وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے قدیم طلبہ میں شامل تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ ہجرت کر کے لاہور آ گئے جہاں انھوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ محکمۂ امدادِ باہمی کے رسالے "ہم لوگ" اور معروف ادبی رسالے "ہمایوں" کے ایڈیٹر رہے۔ زندگی کے آخری چند برس ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۷۲ء میں معدے کے سرطان کی وجہ سے انتقال کر گئے۔

ناصر کاظمی کا کلام زیادہ تر غزلیات ہی کی صورت میں موجود ہے۔ جن میں سے "برگِ نَے"، "خشک چشمے کے کنارے"، "دیوان" اور "پہلی بارش" شامل ہیں۔ اب ان کا تمام کلام "کلیاتِ ناصر" کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا ہے۔

ناصر کاظمی کی غزل میں، قدیم رنگ غزل میں جدید رومانی رویّوں کا امتزاج ملتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور قیام پاکستان کی درمیانی مدت میں جب نظم گوئی کا میلان اور ترویج زوروں پر تھی، ناصر کاظمی نے عین اس زمانے میں غزل کا پرچم بلند کیا اور اس صنف کی ساکھ کو از سرِ نو قائم کیا۔

ناصر کاظمی کی غزل میں اردو غزل کی روایت کا پورا شعور ملتا ہے لیکن ملک کی تقسیم کے تجربے نے ناصر کو میر کی روایت سے نزدیک تر کر دیا ہے۔ ناصر کے کلام میں میر کے طرزِ ادا کے ساتھ ساتھ میر کا طرزِ احساس بھی ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اداسی، تنہائی، محرومی و ناکامی کا احساس اور قدروں کی شکست کا ماتم بھی ہے۔ معاشرے کی منفی قدروں پر طنز اور تلخی کا اظہار بھی ناصر کی غزل میں ملتا ہے۔ انھیں الفاظ کی قوت کا صحیح ادراک بھی ہے۔ موضوعات کے تنوع اور لہجوں کی مختلف سطحوں کے اعتبار سے ناصر کاظمی اپنے کئی ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

ناصر کے کلام کی رسائی ہلکے اور مترنم لہجوں سے لے کر تند و تیز خطیبانہ لہجے تک ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی غزل میں نئے رویے ناصر کاظمی کی جدتِ فکر سے پیدا ہوئے۔

ناصر کاظمی آج کے اس دور میں صرف اور صرف غزل کے نمائندے تھے۔ ان کا شعری سرمایہ بھی زیادہ تر غزل ہی کی صورت میں موجود ہے۔ ناصر کاظمی کو دیکھنے اور سننے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ از سرتاپا ایک شعری بلکہ غزل کا پیکر تھے۔ ناصر کاظمی کی بعض غزلیں پڑھ کر بے اختیار ذہن آپ سے آپ میر اور فانی کی طرف چلا جاتا ہے۔

(۱)

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں　　آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر　　سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو　　تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی　　گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق ! تجھے گھر ہی لے چلیں

(۲)

گئے دنوں کا سراغ لے کر ، کدھر سے آیا ، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا ، مجھے تو حیران کر گیا وہ

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم ، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہردم
وہ بوئے گُل تھا کہ نغمۂ جاں ، مرے تو دل میں اتر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی ، بدل چلا رنگِ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ، ٹل گئی ہے ، جو دن کڑا تھا ، گزر گیا وہ

ہوس کی بنیاد پر نہ ٹھہرا ، کسی بھی امید کا گھروندا
چلی ذرا سی ہوا مخالف ، غبار بن کر بکھر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تُو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکا کر گزر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ ، وہ ہم نفس ، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا ، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصرؔ
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

سوالات

۱۔ ناصر کاظمی کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

۲۔ ناصر کاظمی کے کلام کی خصوصیات پر تبصرہ کیجیے۔

۳۔ ان تراکیب کی وضاحت کیجیے:

شہرِ ستمگر، خیالِ یار، شہرِ بے چراغ، نغمۂ جاں، بے نوا مسافر۔

۴۔ ان اشعار کی وضاحت کیجیے:

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق! تجھے گھر ہی لے چلیں

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

۵۔ دوسری غزل میں صنعتِ تضاد کے استعمال کی نشاندہی کے ساتھ ان اشعار کی تشریح کریں۔

——— ○○○ ———

قصیدہ

لفظ قصیدہ کا مصدر "قصد" ہے اور قصد کا مطلب ارادہ ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہے کہ قصیدہ وہ صنف سخن ہے جو ارادی طور پر وجود میں آئے۔ اس کے مقابلے میں یہ ممکن ہے کہ غزل کا کوئی شعر بلکہ بعض اوقات پوری غزل بھی غیر ارادی طور پر یعنی "آمد" کی صورت میں وجود میں آ جائے لیکن قصیدہ وہ نظم ہے جو غیر ارادی طور پر وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ یہ "آمد" کے مقابلے میں "آورد" ہی کی مرہونِ منت ہو سکتی ہے۔

قصیدے کے وجود میں آنے کا باعث کسی کی مدح بھی ہو سکتی ہے اور ہجو بھی۔ اسی طرح خوشی کا کوئی موقع مثلاً بہار کا موسم یا کسی کی شادی وغیرہ بھی قصیدے کے وجود میں آنے کی وجہ بن سکتی ہے۔

قصیدہ بہت پرانی صنفِ سخن ہے۔ یہ عربی شاعری کے علاوہ فارسی شاعری میں بھی بہت پہلے سے موجود ہے۔ اردو میں اس کا وجود عربی اور فارسی شاعری کے زیرِ اثر ہی سامنے آیا۔ ہیئت کے اعتبار سے قصیدے اور غزل میں کوئی فرق نہیں بلکہ غزل کے بارے میں یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ وہ قصیدے ہی کا ایک حصہ تھی اور ہیئت میں آج بھی قصیدے کی ہم شکل و ہم صورت ہے۔ وہی مطلع و مقطع اور وہی آغاز سے آخر تک قوافی اور ردیف کا اہتمام۔

قصیدے اور غزل میں کچھ فرق بھی ہے۔ مثلاً غزل میں ایک سے زائد مطلعے آ سکتے ہیں جب کہ قصیدے میں عام طور پر ایک ہی مطلع ہوتا ہے۔ غزل کی زبان نرم، ملائم اور پرسوز ہوتی ہے لیکن قصیدہ زور دار اور پُرجوش ہوتا ہے۔ غزل کی تمام خوبی اس کا خلوص اور سچائی ہے جب کہ قصیدے میں مبالغہ آرائی کے بغیر زور پیدا نہیں ہوتا۔ مبالغہ غزل میں ہو تو اسے بے کیف بنا دیتا ہے لیکن یہی مبالغہ قصیدے کی جان ہے۔

قصیدے کو آج تک کچھ اجزا میں منقسم کیا جاتا رہا ہے۔ شاید آئندہ بھی کچھ عرصہ روایت کی یہ پابندی برقرار رہے۔ ترکیب و ترتیب کے اعتبار سے قصیدے کو جن حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

تشبیب یا نسیب، تخلص یا گریز، مدح، طلب، دعا

ا۔ تشبیب یا نسیب

اس حصے کو قصیدے کی تمہید کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے، تشبیب کا مطلب ذکر شباب ہے جو عام طور پر عشق و محبت کے جذبات پر مبنی ہوتا ہے۔ نسیب عربی زبان میں "غزل" کے معنی میں آتا ہے۔ اس حصے میں شاعر عام طور پر اپنے جذباتِ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ تشبیب یا نسیب کے حصے میں ہمیشہ شباب کا ذکر ضروری نہیں، یہ گردشِ زمانہ سے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے "شہر آشوب" کہا جائے گا۔ اگر اس حصے میں شاعر اپنی تعریف کرے تو اس کو فخر و مباہات کہا جاتا ہے۔

۲۔ تخلص یا گریز

یہ حصہ قصیدے کا مختصر ترین حصہ ہوتا ہے۔ جس میں شاعر تشبیب یا نسیب کے حصے سے دامن چھڑا کر مدح کی طرف آنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی شعر یہ مقصد پورا کر دیتا ہے۔

۳۔ مدح

یہ حصہ قصیدے کا اصلی حصہ ہوتا ہے جس کی خاطر قصیدہ لکھا جاتا ہے۔ اس حصے میں شاعر عام طور پر اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین و آسمان کا قلابہ ملا دیتا ہے اور اپنی فصاحت ' بلاغت ' سلاست ' روانی ' فنی مہارت اور چرب زبانی تک کا پورا پورا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہاں اس کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو خیال انگیز پیرایے میں بیان کرے۔ اگر اس کا ممدوح کوئی بادشاہ ہو تو شاعر اس کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ کو دنیا جہان کے بڑے بڑوں سے بڑھا کر ظاہر بلکہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ممدوح کوئی دینی شخصیت ہو تو اس کے گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی زیادہ سے زیادہ تعریف کی جاتی ہے۔ اگر قصیدہ مدحیہ کی بجائے ہجویہ ہو تو اس حصے میں اپنے "مغضوب و معتوب" کی زیادہ سے زیادہ مذمت کی جاتی ہے۔

۴۔ طلب

اگر قصیدہ مدحیہ ہو اور کسی بادشاہ کے بارے میں ہو تو اس حصے میں شاعر اپنی خواہش کے مطابق دولت یا جاگیر یا منصب وغیرہ طلب کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر قصیدے کی اصلی غرض و غایت اسی حصے میں مذکور ہوتی ہے۔

۵۔ دعا

یہ حصہ قصیدے کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ اس میں ممدوح کی درازی عمر' قیام سلطنت' بلند اقبالی اور درجات میں ترقی کے لیے دعا کی جاتی ہے اور ممدوح کے دشمنوں کے لیے موت وغیرہ کی بد دعا کی جاتی ہے۔ اگر قصیدہ ہجویہ ہو تو دعا کا یہ حصہ بد دعا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اردو قصیدہ گوئی کا سنہری دَور سوؔدا اور ذوؔق کا زمانہ تھا۔ قصیدہ نگاروں میں ان دونوں شاعروں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غالب اور مومن نے بھی بعض قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے غالب کے قصیدے ضرورتاً" لکھے گئے جب کہ مومن کے قصیدے عام طور پر نعتیہ تھے اور ان کے ساتھ کوئی مالی غرض وابستہ نہ تھی۔

میرزا محمد رفیع سودؔا

(۱۷۱۶ء - ۱۷۸۱ء)

نام میرزا محمد رفیع اور تخلص سودؔا تھا۔ ان کے آباء و اجداد کابل (افغانستان) کے رہنے والے تھے جو تجارت کے سلسلے میں برّصغیر پاک و ہند میں آئے اور یہاں کے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے آخر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ سودا یہیں دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ دَور دہلی میں خوشحالی کا دَور تھا' چنانچہ مرزا سودا کے والد مرزا محمد شفیع دہلی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ مرزا سودا نے دہلی ہی میں آنکھ کھولی اور یہیں پروان چڑھے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔

ایک طویل مدت تک دہلی میں اردو شاعری کا میلان عام نہ تھا لیکن جب ولی دکنی کا اردو دیوان وہاں پہنچا تو دوسرے لوگ اور خاص طور پر شاعر اس زبان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

سودا کو بھی ماحول اور حالات کے مطابق پہلے فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد میر تقی میر کے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں کی ترغیب پر وہ اردو شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے اور کچھ ہی عرصے میں اس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی کہ وہ آسمانِ ادب کے درخشندہ ستاروں میں شامل ہو گئے۔

مرزا سودا اور میر تقی میر کا زمانہ ایک ہے اور دونوں کا میدانِ شاعری اگرچہ ایک حد تک مختلف ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اپنے میدان میں دونوں کا مرتبہ یکساں بلند ہے۔ میر کا طبعی میدان غزل اور سودا کا رجحان قصیدے کی طرف تھا۔ محمد حسین آزاد نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات کہی ہے کہ میر کا کلام مجموعی طور پر "آہ" ہے تو سودا کا "واہ"۔

جس زمانے میں سودا نے شعر و شاعری کے کوچے میں قدم رکھا' اس زمانے کے شاعروں میں شاہ حاتم' شاہ مبارک آبرو' شرف الدین مضمون' مرزا مظہر جانِ جاناں' شیخ احسن اللہ بیان' شاکر ناجی وغیرہ خاص طور پر مشہور تھے۔ مرزا سودا نے شاگردی اختیار کرنے کے لیے شاہ حاتم کو چنا اور ان سے اصلاح لینے لگے۔

سودا نے بہت جلد اردو شاعری میں نام پیدا کر لیا اور رفتہ رفتہ ان کی شاعری کا شہرہ شاہ عالم بادشاہ تک پہنچ گیا۔ شاہ عالم خود بھی شاعر تھے۔ انھوں نے سودا کا کلام سنا تو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ ان کے شاگرد ہو گئے لیکن یہ استادی اور شاگردی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اُدھر بادشاہ کسی بات پر بگڑے تو اِدھر سودا بھی بگڑ گئے اور دربار سے قطعِ تعلق کر لیا۔ سودا کے شاگردوں نے اس کمی کو بالکل محسوس نہ ہونے دیا اور اپنے استاد کی ہر طرح خدمت بجالاتے رہے۔

سودا اپنے زمانے کے بہت سے شاعروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن میر کو استاد مانتے تھے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :

سوؔدا ! تُو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

سودا طبعاً غزل کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے اور ان کے جوہر قصیدے میں کھل کر سامنے آئے۔ اگرچہ وہ غزل گو ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

جو یہ کہتے ہیں کہ سوؔدا کا قصیدہ ہے خوب
اُن کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

لیکن اس کے باوجود عام لوگوں نے ان کی قصیدہ نگاری کے مقابلے میں ان کی غزل گوئی کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر وہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتے تو وہ یقیناً میر کے پائے کے غزل گو بھی ہو سکتے تھے۔

سودا کے کلام کی خصوصیات میں شکوہِ الفاظ، خارجیت و داخلیت کی آمیزش، مقامی اثر، فارسی تراکیب، سنگلاخ زمینیں، سوز و گداز کی کمی اور قدرتِ بیان نمایاں ہیں۔

قصیدۂ نعتیہ

عَجب ناداں ہیں وہ، جن کو ہے عُجبِ تاجِ سلطانی
فلک بالِ ہما[1] کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
نہیں معلوم اُن نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا
کہ چشمِ نقشِ پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی
ہماری آہ دل تیرا نہ نرما دے تو یا قسمت
وگرنہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہو گئے پانی
تری زلفوں سے اپنی رُوسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیّتِ خاطر مجھے ان کی پریشانی
زمانہ میں نہیں کھلتا ہے کارِ بستہ، حیراں ہوں
گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر باسانی

---

[1] ہما ایک مبارک پرندہ جس کے بالوں سے پنکھا بنتا ہے۔

سمجھ اے نا قباحت فہم ! کب تک یہ بیاں ہو گا

ادائے چینِ پیشانی و لطفِ زلف طولانی

زہے دینِ محمدؐ [1] پیروی میں اس کی جو ہوویں

رہے خاکِ قدم سے ان کے چشمِ عرش نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدمؑ خاکی کو، گر اس کی

امانت دارِ نورِ احمدیؐ ہوتی نہ پیشانی !

موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب و آتش کو

تو کوئی سنگ سے بندھتی تھی شکلِ لعلِ رمّانی

پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا !

شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہبانی

جہاں انصاف سے ہرگاہ اب معمور ہے اتنا

تو اس سے آگے ہو گی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس ! اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں

وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے

بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسفؑ ثانی [2]

معاذ اللہ ! یہ کیا لفظ بے موقع ہوا سرزد

جو اس کو پھر کہوں تو ہوؤں مردودِ مسلمانی

۱۔ محمد مصطفیٰؐ کے دین سے مراد دین اسلام ہے۔

۲۔ حضرت یوسف علیہ السلام جن کا حسن زبان زد عام ہے۔

کدھر اب فہمِ ناقص لے گیا مجھ کو، نہ یہ سمجھا

کہ وہ سرّ الوہیّت ہے، یہ ہے ماہِ کنعانی [1]

بس آگے مت چل اے سودا! میں دیکھا فہم کو تیرے

کر استغفار اب اس منہ سے جس سے کی ثنا خوانی

سوالات

۱۔ اردو شاعری میں صنفِ قصیدہ کا رواج کب اور کیسے ہوا؟

۲۔ قصیدہ سے کیا مراد ہے۔ اس صنفِ شاعری پر مفصل نوٹ لکھیے۔

۳۔ اردو قصیدہ نگاری میں سودا کا مقام و مرتبہ بیان کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے:

عجب تاجِ سلطانی، بالِ ہما، چشمِ نقشِ پا، جمعیتِ خاطر، کاربستہ، لعلِ رمانی، مردودِ مسلمانی۔

۵۔ کلام میں ایسے دو لفظوں کا لانا جو شکل یا تلفظ میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں مگر وہ معانی میں مختلف ہوں، صنعتِ تجنیس کہلاتا ہے مثلاً:

برس، برس کے دن، اے ابرِ نو بہار برس — بہ پاسِ خاطرِ رندانِ بادہ خوار، برس

یا

حسرت یہ رہی جی ہی کی جی میں، گئے مر، ہم — قاتل نے لگایا نہ مرے زخم پہ مرہم

ایسے دونوں الفاظ "متجانس" کہلاتے ہیں۔ اس قصیدے میں اس صنعت کے استعمال کی نشاندہی کرتے ہوئے متجانس الفاظ درج کیجیے۔

۶۔ اِس قصیدہ کے اشعار میں کئی تلمیحات آئی ہیں۔ نشاندہی کرتے ہوئے ان کی وضاحت کیجیے۔

— ○○○ —

۱۔ کنعان کا چاند مراد حضرت یوسف۔

محمد ابراہیم ذوق
(۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء)

نام محمد ابراہیم اور تخلص ذوق تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو برِ صغیر کے دارالحکومت دہلی کے کابلی دروازے کے نزدیک رہتے تھے۔ جہاں ذوق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔

محمد ابراہیم ذوق کی عمر پانچ چھے برس تھی کہ محلے کی مسجد کے ایک مدرس حافظ غلام رسول سے ابتدائی تعلیم پائی۔ حافظ صاحب موصوف عربی اور فارسی کے عالم ہونے کے علاوہ اردو کے شاعر بھی تھے اور شوق تخلص کرتے تھے۔ حافظ صاحب کے پاس ان کے شاعر دوستوں کا آنا جانا بھی تھا۔ دیکھا دیکھی ذوق بھی ان ادبی محفلوں میں دلچسپی سے شامل ہونے لگے اور جب ایک حد تک عربی' فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کر لی تو اس ماحول میں طبیعت آپ ہی آپ شاعری کی طرف مائل ہو گئی۔ ایک روز اچانک انھوں نے دو شعر کہے اور اپنے استاد حافظ غلام رسول شوق کو دکھائے۔ حافظ صاحب وہ شعر سن کر خوش ہوئے اور شاگرد کا دل بڑھایا۔

ذوق دہلی کے جس محلے میں رہتے تھے' وہیں ان کا ایک ہم سبق بھی رہتا تھا۔ اتفاق سے اسے بھی شعر و شاعری کا شوق تھا ایک روز اس ہم سبق نے اپنا کلام سنایا جو ذوق کو پہلے سے بہتر محسوس ہوا۔ ذوق نے حیران ہو کر اس ہم سبق سے پوچھا کہ اس کی شاعری میں یہ نمایاں فرق کیسے عمل میں آیا تو اس نے بتایا کہ وہ اس دور کے نامور شاعر شاہ نصیر کا شاگرد ہو گیا ہے۔ ذوق اس بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔

اگرچہ ذوق غزل کے بھی شاعر تھے لیکن انھوں نے ساتھ ہی ساتھ قصیدے میں بھی بہت نام پیدا کیا لیکن حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی ذوق کی طبیعت کی دلچسپی تھی لیکن قصیدہ گوئی ان کی مجبوری تھی۔

ذوق غزل کے کمزور شاعر نہ تھے۔ سوئے اتفاق نے ان کو غالب ایسے دیو قامت شاعر سے ٹکرا دیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں نے ذوق کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا اور اسے بہرحال ملنا چاہیے تھا۔ ذوق کی شاعری غالب کے مقابلے میں کمزور سہی لیکن یہاں یہ کہنا مناسب اور بہتر ہو گا کہ غالب کے ساتھ ذوق کا مقابلہ اور موازنہ تھا ہی غلط کیونکہ ہر شاعر کا اپنا مزاج اور اپنا رنگ ہوتا ہے بہرحال ذوق نے اردو شاعری کو جو زبان دی ہے' وہ اردو پر ان کا احسان ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دیوانِ ذوق

ذوق نے اپنے پیچھے جو ادبی سرمایہ چھوڑا' اس میں خاص طور پر ان کا دیوان ہی قابل ذکر ہے' جس میں ردیف وار غزلوں کے علاوہ قصائد شامل ہیں۔ یہ قصیدے زیادہ تر بہادر شاہ ظفر کی مدح و ستائش میں کہے گئے ہیں۔ اگر ذوق کی غزلیات کا انتخاب کیا جائے تو بہت سے عمدہ اشعار نکالے جا سکتے ہیں۔ ذوق مجموعی طور پر پرانی روشنی کے شاعر تھے' ان کے کلام میں غالب کی سی جدت تلاش کرنا ویسے ہی درست نہیں ہے۔

قصیدہ

(در مدحِ شہنشاہ ابو المظفر بہادر شاہ ظفر)

ساون میں دیا پھر مہِ شوّال دکھائی
برسات میں عید آئی، قدح کش کی بَن آئی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیز کرۂ ناری[1] و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے ہے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزمِ عمّاں پہ لبِ جُو متبسّم
تالاب ، سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جوز میں پائی

عالَم یہ ہَوا کا ہے کہ تاثیرِ ہَوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کرتی ہے صبا آ کے کبھی مُشک فشانی
کرتی ہے نسیم آ کے کبھی لخلخہ سائی

تھا سوزنیِ خار کا صحرا میں جہاں فرش
سبزے نے وہاں مخملِ خوش رنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کے لیے جامۂ رنگیں
زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پر جمائی

ابرو پہ کرے قوسِ قزح وسمہ تو خورشید
سرخیِ شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالَم
جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی[2]

1۔ نار، آگ اور ماء پانی

2۔ خطا ایک علاقے کا نام جہاں کے ترک یعنی محبوب بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔

نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی ! کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد مہیا

ہر خار کی ہے نوکِ زباں شعر نوائی اعجاز نوا سنجیِ مطرب سے چمن میں

ہر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر

شاہا ! ترے جلوے سے ہے یہ عید کی رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی !

سوالات

۱۔ اردو قصیدہ نگاری میں شیخ محمد ابراہم ذوق کا کیا مرتبہ ہے ؟

۲۔ ذوق کو دلی کی زبان کی سند قرار دیا جاتا ہے۔ ذوق کی غزلیات کے علاوہ یہ بات ان کے قصائد کے بارے میں کہاں تک درست ہے ؟

۳۔ پانچویں شعر کے بعد بڑی کثرت سے ایک صنعتِ کلام کا استعمال ہوا ہے۔ اس صنعت کی نشاندہی کرتے ہوئے کم ازکم چار اشعار کی تشریح کیجیے۔

—— ○○○ ——

مثنوی

مثنوی کا لفظ "مثنیٰ" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی "دو دو" ہے۔ یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ قصیدے اور غزل کے برعکس اس میں ہر شعر کے بعد قافیہ یا قافیہ اور ردیف بدل جاتی ہے۔

مثنوی عام طور پر طویل قصوں، داستانوں اور جنگوں کے واقعات وغیرہ کو منظوم صورت میں پیش کرنے کے کام آتی ہے۔ اس میں اپنی کشادہ دامانی کے باعث ہر قسم کے مضامین کو اپنے اندر سمانے اور سمونے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کے لیے بحریں مخصوص اور عام طور پر مختصر ہوتی ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح بعض دیگر اصنافِ سخن کا آغاز دکن میں ہوا، اسی طرح سب سے پہلی مثنوی بھی دکن کی سرزمین میں لکھی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ہر طرف تصوف کا رنگ عام تھا۔ اکثر شعرا، صوفیانہ اور اخلاقی مضامین و موضوعات کے اظہار کے لیے مثنوی کی صنف اختیار کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس دور میں جو مثنویاں وجود میں آئیں، ان میں سنسکرت اور فارسی کے تراجم عام تھے۔ اس سلسلے میں نظامی بیدری کو سب سے پہلا مثنوی نگار قرار دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے دو سال کی مدت میں اپنی مثنوی "پدم راؤ" لکھی تھی۔ پھر اس کے بعد دکن میں کئی مثنوی نگار پیدا ہو گئے۔

دکن کے بعد برصغیر پاک و ہند کے شمالی علاقے میں بھی مثنوی نگار سامنے آئے۔ ان شاعروں کی مثنویوں میں زیادہ تر طبع زاد ہیں۔ ان مثنوی نگاروں میں میر تقی میر، خواجہ اثر، جرأت، مصحفی، میر حسن، نسیم لکھنوی، مومن، واجد علی شاہ اور مرزا شوق کے نام خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ان شاعروں میں سے اکثر کی مثنویاں زیادہ طویل نہیں ہیں۔ لیکن ان شاعروں کے اساتذۂ فن ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر مثنویوں کو بہت شہرت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں میر تقی میر کی مثنویوں میں سے "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" کے علاوہ خواجہ اثر کی مثنوی "خواب و خیال" کا ذکر ضروری ہے۔ ان مثنویوں کی سب سے زیادہ نمایاں خوبی زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی ہے۔ لیکن اس صنفِ سخن کے سلسلے میں جو شہرت میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور نسیم لکھنوی کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کو حاصل ہے، وہ دوسروں کے حصے میں کم آئی ہے۔ البتہ اس دور میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں زہرِ عشق، بہارِ عشق اور فریب عشق کی شہرت و مقبولیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بعد کے دور میں مولانا حالی اور مولانا آزاد نے بھی بعض معاشرتی مسائل اور مناظر فطرت پر مثنویاں لکھیں جن کو قبول عامہ کی سند ملی۔ اس سلسلے میں حالی کی مثنویاں "مناجاتِ بیوہ" اور "نشاطِ امید" اور آزاد کی "صبحِ امید" اور "زمستاں" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ شعرا کے علاوہ اردو میں اور جن لوگوں نے مثنویاں لکھی ہیں، ان میں حفیظ جالندھری کی مثنوی "شاہنامۂ اسلام" بہت طویل ہے اور اس کا موضوع تاریخِ اسلام ہے۔ چونکہ طویل مثنوی لکھنے اور پڑھنے کے لیے فرصت درکار ہے جو موجودہ سائنسی دور میں بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے، اس لیے عام طور پر طویل مثنویوں کا مستقبل محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

بعض دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا قصہ یا موضوع مربوط اور مسلسل ہوتا ہے۔ اس کا مضمون یا موضوع غیر فطری نہ ہو اور مبالغہ آمیزی سے بھی پاک ہو تو یہ صنف بھی کسی طرح دیگر اصنافِ سخن سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ آج کل اردو شاعری میں مثنوی نگاری کا رواج پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو چکا ہے۔

——— ○○○ ———
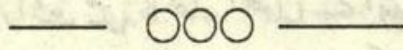
میر حسنؔ

(۱۷۳۶ء - ۱۷۸۶ء)

نام میر غلام حسن اور حسن ہی تخلص ہے۔ وہ نامور ہجو گو میر ضاحک کے بیٹے ' میر خلیق کے والد اور مشہور مرثیہ نگار میر انیس کے دادا تھے۔ ان کے جدِ امجد امامی ہَروی ہرات سے آکر دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ جہاں میر حسن محلہ سید واڑا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ دہلی کا شہر جو کئی بار اجڑا ' ان کے زمانے میں بھی ویران ہو گیا تو وہ اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے جو اس زمانے میں اودھ کا دار المقام تھا۔ یہاں وہ نواب سالار جنگ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ پھر ان کے بیٹے نواب نوازش علی خاں کی مصاحبت اختیار کر لی۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دار المقام فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔

شعر و شاعری کا ملکہ ان کو وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنے والد میر ضاحک سے اصلاح لی۔ کچھ عرصہ میر درد کو بھی اپنا کلام دکھاتے رہے مگر جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہو گئے۔ میر تقی میر نے ان کو سودا کا شاگرد لکھا ہے اور مصحفی انھیں درد کا شاگرد بتاتے تھے۔ لیکن وہ خود اپنے آپ کو ضیاء الدین ضیاء کا شاگرد ظاہر کرتے ہیں۔

میر حسن کا کلام باقاعدہ ایک دیوان کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ وہ روحانی طور پر خواجہ میر درد ' سودا اور میر تقی میر کے بہت نزدیک ہیں۔ دیوان کے علاوہ ان کے نام سے مثنویوں کا ایک مجموعہ بھی موجود ہے جو تین مثنویوں پر مشتمل ہے اور "سحر البیان" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قصہ اگرچہ بظاہر ایک داستانِ عشق ہے لیکن یہ مثنوی زبان و بیان کی ایک کرامت ہے۔ ایک تذکرۂ شعرا بھی میر حسن سے یادگار ہے۔ غزلوں ' مثنویوں اور تذکرہ شعرا کے علاوہ کچھ قصائد بھی ان کے نام سے ملتے ہیں۔

مثنوی سحر البیان

میر حسن اگرچہ ایک صاحب دیوان شاعر تھے لیکن ان کی وجہِ شہرت غزلیات یا قصائد نہیں بلکہ مثنویاں ہیں اور ان مثنویوں میں سے بھی ایک مثنوی یعنی "سحر البیان" ہے۔ جس میں واقعی نام کے مطابق زبان و بیان کا جادو ہے۔ یہ مثنوی ایک منظوم داستان ہے جس میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدرِ منیر کا افسانۂ عشق بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے یا کہانی کا خاکہ قدیم داستانوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے مختلف حصوں اور قصوں کو میر حسن نے اپنے کمالِ فن سے ہُو بہ ہُو واقعیت و حقیقت کا رنگ دے دیا ہے۔ جس کے باعث یہ مثنوی واقعہ نگاری ' کردار نگاری اور منظر کشی کی کامیاب ترین کوشش کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی معاشرتی زندگی کی بھی آئینہ دار بن گئی ہے۔ اس مثنوی سے اس زمانے کے رسم و رواج اور تمدن کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ عورتوں کی گفتگو ' شادی کی رسوم ' راگ رنگ کی محافل ' دربار کی شان و شوکت غرض اس وقت کی معاشرت کا ہر پہلو اس

خوبی سے منظوم صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہر پہلو کی تصویر کھنچ کر دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اس مثنوی کا اندازِ بیان روانی اور بے ساختگی میں بے مثال ہے۔ زبان اس قدر صاف، تر و تازہ، سادہ، آسان اور رواں ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو معلوم ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر اندازِ بیان اس قدر دلکش ہے کہ یہ مثنوی آج تک شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔

خصوصیاتِ مثنوی

یہ مثنوی اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے ممتاز و منفرد ہے۔ یہ خصوصیات مختصر طور پر یہ ہیں:

روانی و بے ساختگی، ربط و تسلسل، داستانوی رنگ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، حسنِ ترتیب، شگفتگی، دلچسپی وغیرہ۔

یہ مثنوی قدیم شاعروں کے انداز کے مطابق حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔ حمد اور نعت کے چند اشعار سے اس مثنوی کی زبان و بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے مثلاً:

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم — جھکا جس کے سجدے کو اوّل قلم

سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں — کہا: دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا — ہُوا حرف زن یوں کہ ربّ العلا

نہیں کوئی تیرا نہ ہو گا شریک
تری ذات ہے وحدہٗ لا شریک

☆ ☆ ☆

نبیؐ۔ کون یعنی رسولِ کریمؐ — نبوّت کے دریا کا دُرِّ یتیمؐ

ہُوا گو کہ ظاہر میں اُمّی لقب — پہ علمِ لَدُنّی کھُلا دل پہ سب

بغیر از لکھے اور کیے بے رقم
چلے حکم پر اس کے لوح و قلم

سحرالبیان

(داستان تیاری میں باغ کی)

دیا شہ نے ترتیب اِک خانہ باغ ۔۔۔ ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی ' دروں کی وہ شان ۔۔۔ لگے جس میں زر بفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زر نگار ۔۔۔ دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

وہ مقیّش کی ڈوریاں سر بسر ۔۔۔ کہ مہ کا بندھا جس میں تارِ نظر

چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال ۔۔۔ نگہ کو وہاں سے گزرنا محال

دیے ہر طرف آئنے جو لگا ۔۔۔ گیا چوگنا لطف اس میں سما

وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس ۔۔۔ بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

رہیں لخلخے اس میں روشن مدام ۔۔۔ معطّر شب و روز جس سے مشام

چھپر کھٹ مرصّع کا دالان میں ۔۔۔ چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں

زمیں پر تھی اِس طَور اُس کی جھمک ۔۔۔ ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

بنی سنگِ مَرمَر کی ' چوپڑ کی نہر ۔۔۔ گئی چار سُو اس کے پانی کی لہر

ہوائے بہاری سے گُل لہلہے ۔۔۔ چمن سارے شاداب تھے اور ہرے

زمرّد کی مانند سبزے کا رنگ ۔۔۔ روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار ۔۔۔ گل اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ ، گُل سے چمن — کہیں نرگس و گُل ، کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کے داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار — ہر اک گل سفیدی میں مہتاب دار

کہیں زرد نسریں ، کہیں نسترن — عجب رنگ کے زعفرانی چمن !

پڑی آبِ جُو ہر طرف کو بہے — کریں قمریاں سرو پر چہچہے

گُلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالَم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالَم گلستان پر

کہیں تخم پاشی کریں گود کر — پنیری جماویں کہیں کھود کر

خراماں صبا صحن میں چار سُو — دماغوں کو دیتی ہر اک گُل کی بو

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے — لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے

صدا قرقروں کی ، بطوں کا وہ شور — درختوں پہ بگلے، منڈیروں پہ مور

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا — ہَوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

درختوں نے برگوں کے کھولے وَرَق — کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سَبَق

سماں قمریاں دیکھ اس آن کا | پڑھیں باب پنجم [1] گلستان کا
خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم | محل کی وہ چہلیں وہ عشرت کی دھوم
تکلّف کے پہنے پھریں سب لباس | رہیں رات دن شاہزادے کے پاس
کنیزانِ مہ رُو کی ہر سمت ریل | چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
رنگیلی کوئی اور کوئی شام رُوپ | کوئی چت لگن اور کوئی کام رُوپ
کوئی کیتکی اور کوئی گلاب | کوئی مہ رُتن اور کوئی ماہتاب
کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی | کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی
کہیں اپنے پٹّے سنوارے کوئی | "اری او رسیلی!" پکارے کوئی
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے | کہیں "واہ وا" اور کہیں "واچھڑے"
دکھاوے کوئی گوکھرو موڑ موڑ | کہیں سوت بوئے، کہیں تاڑ توڑ
کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے | کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے
کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر | کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر
کوئی آرسی اپنے آگے دھرے | ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے
مقابہ کوئی کھول، مسّی لگائے | لبوں پر دھڑی کوئی اپنے جمائے
ہُوا ان گلوں سے دو بالا سماں | اسی باغ میں تھا وہ سروِ رواں

---

[1] شیخ سعدیؒ کی تصنیف "گلستان" کا باب پنجم جو عشق و عاشقی کے موضوع پر ہے۔

غرض لوگ تھے یہ جو ہر کام کے
یہ سب واسطے اس کے آرام کے

پلا جب وہ اس ناز و نعمت کے ساتھ
پدر اور مادر کی شفقت کے ساتھ

ہوئی اس کے مکتب کی شادی عیاں
ہوا پھر انہی شادیوں کا سماں

معلّم ، اتالیق ، منشی ، ادیب
ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب

کیا قاعدے سے شروعِ کلام
پڑھانے لگے علم اس کو تمام

معانی و منطق ، بیان و ادب
پڑھا اس نے معقول و منقول سب

لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم
زمیں آسماں میں پڑی اس کی دھوم

کیے علم نوکِ زباں حرف حرف
اسی نَحو سے اس نے کی عمر صَرف

عطارد کو آنے لگی اس کی رِیس
ہُوا سادہ لوحی میں وہ خوش نویس

لیا ہاتھ جب خامۂ مُشک بار
لکھا نسخ [1] و ریحان [2] و خطِ غبار [3]

عروس الخطوط اور ثُلث [4] ، و رقاع [5]
خفی اور جلی مثلِ خطِّ شعاع [6]

شکستہ لکھا اور تعلیق جب
رہے دیکھ حیراں اتالیق سب

کیا خطِّ گلزار سے جب فراغ
ہوا صفحۂ قطعہ ، گلزارِ باغ

کمال کے جو درپے ہوا بے نظیر
لیا کھینچ چلّے میں سب فنِّ تیر

رکھا موسیقی پر جو کچھ کچھ خیال
کیے قید سب اس نے ہاتھوں میں تال

۱۔ کتابت کے مختلف رسم الخط۔

طبیعت گئی کچھ جو تصویر پر	رکھے رنگ سب اس کے مدِّ نظر

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال	مروّت کی خُو، آدمیّت کی چال

گیا نام پر اپنے وہ دل پزیر
ہر اک فن میں سچ مچ ہُوا "بے نظیر"

سوالات

۱۔ اردو مثنوی نگاری پر مفصّل نوٹ لکھیے۔

۲۔ اردو مثنویوں میں میر حسن کی "سحر البیان" کا کیا مقام ہے؟

۳۔ اس نظم میں مذکورہ کنیزوں اور پھولوں کے ناموں کی الگ الگ فہرست مرتب کریں۔

۴۔ اس نظم کے کس کس شعر میں صنعتِ تعلیل اور صنعتِ تضاد کا استعمال ہوا ہے۔ نشان دہی کیجیے۔

—— ○○○ ——
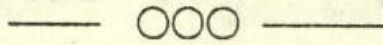
نسیم لکھنوی

(۱۸۱۲ء - ۱۸۴۴ء)

اصلی نام دیا شنکر اور تخلص نسیم تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہونے کے باعث وہ دیا شنکر نسیم لکھنوی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ اصلاً" کشمیر کے کول پنڈتوں میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔

نسیم لکھنوی کا خاندان شعر و ادب سے لگاؤ رکھتا تھا۔ نسیم اردو زبان و ادب کے مطالعے اور ماحول کی اثر پزیری کے باعث مسلمانوں کے تمدن سے بہت نزدیک تھے۔ اردو اور فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر فوج میں ملازم ہو گئے۔ یہ دَور نواب امجد علی شاہ کا تھا۔

نسیم بہت ذہین اور طبّاع تھے۔ ان میں بہت زیادہ ادبی اور شاعرانہ صلاحیت تھی لیکن ان کی عمر نے ساتھ نہ دیا اور وہ صرف ۳۲ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی کو چھوڑ گئے۔

ان کی شخصیت میں شعر و سخن کا ذوق اور ملکہ فطری تھا۔ وہ حاضر جواب بھی تھے اور بذلہ سنج بھی۔ نسیم کو شعر و شاعری کا جو زمانہ ملا، اس وقت ناسخ اور آتش کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ نسیم آتش کے شاگرد ہو گئے۔

نسیم لکھنوی کا سب سے بڑا کارنامہ یا شاہکار ان کی مثنوی "گلزارِ نسیم" ہے۔ اگر اس مثنوی کا موازنہ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" سے کیا جائے تو اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے وہ بھی ادب میں ایک یادگار ہے۔ اس کا اپنا ایک رنگ ہے اور اپنے اس رنگ میں یہ ایک عجیب چیز ہے۔ اس میں لکھنؤ کا رنگ اپنے عروج پر ہے۔ فصاحت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں اختصار اور بلاغت کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

نسیم نے یقیناً" اس مثنوی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہو گا کیونکہ اس زمانے میں اور بہت کچھ کہنے کے ساتھ ساتھ مثنوی نگاری کا بھی رواج تھا لیکن افسوس ہے کہ نسیم کے نام سے اس مثنوی کے علاوہ ان کے دیگر کارنامے نامعلوم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسی مثنوی پر اپنی ساری توانائی صرف کر دی ہو کیونکہ روایت ہے کہ نسیم نے اس مثنوی پر اس قدر محنت کی کہ سخت علیل ہو گئے اور آخر جان ہار گئے۔

اگرچہ "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" کا موازنہ نہیں کرنا چاہیے لیکن دونوں کی خصوصیات کا جائزہ ادبی اعتبار سے دلچسپی سے خالی بھی نہیں۔ مختصر طور پر سحر البیان کو اگر "آمد" قرار دیا جا سکتا ہے تو گلزارِ نسیم "آورد" ہے۔ بہرحال اس کی دلچسپی اور رنگینی اپنی جگہ پر دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ دونوں مثنویاں الگ الگ علاقوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اگر ایک طرف میر حسن کی سحر البیان دہلی کے دبستانِ شاعری کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف گلزارِ نسیم لکھنوی رنگ و انداز کی عکاس ہے۔ گلزارِ نسیم کی شاعری میں پختگی کا اپنا انداز ہے جس میں صنائع و بدائع کے استعمال نے مزید حسن و دلکشی پیدا کر دی ہے۔ مختصر طور پر نسیم لکھنوی کی اس مثنوی "گلزارِ نسیم" میں صنعت گری سے ایسا حسن پیدا ہو گیا ہے جو جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خصوصیاتِ مثنوی

ناقدین نے "گلزارِ نسیم" کے مطالعے اور دوسری مثنویوں کے ساتھ اس کے موازنے کے بعد اس کی جو خصوصیات گنوائی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں :

اسلامی اثرات، زبان کا بانکپن، ربطِ داستان، جذبات نگاری، استعمال محاورات، رعایتِ لفظی، حُسنِ تشبیہات، اختصار، مبالغہ آرائی، منظر نگاری، سادگیِ بیان، جامعیت وغیرہ۔

گلزارِ نسیم

(پابزنجیر ہونا بکاؤلی کا سودائے فراقِ تاج الملوک میں)

سودائے اَلَم ہے اب جو تحریر — حرفوں سے قلم ہے پا بہ زنجیر

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

یک چند جو گزرے بے خور و خواب — زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب

صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوسِ خیال بن گیا گھر

پریاں وہ جو اس کی پاسباں تھیں — دانا و عقیل و خوش بیاں تھیں

سمجھانے لگیں کہ مرتی ہے کیوں — ترکِ خور و خواب کرتی ہے کیوں

ثابت کچھ اثر ستارے کا ہے — اس چاند کو کیا گہن لگا ہے

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر — منہ دیکھ تو آئنہ منگا کر

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار — اب مان نہ مان تو ہے مختار

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے — دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

جھنجلائی بکاؤلی کہ بس بس　　اب ایک کہو گی تم ، تو مَیں دس

رنجورؔ جو ہوں تو مَیں ، تمہیں کیا　　مجبور جو ہوں تو مَیں ، تمہیں کیا

مانا مِری حالت اب ردی ہے　　بہتر ہے وہ جو کچھ بدی ہے

بلبل اس رشکِ گل کی ہوں میں　　تم کیا ہو ہزار میں کہوں مَیں

سوچیں وہ کہ یہ نہیں سمجھتی　　ہے بلکہ برنگِ زلف الجھتی

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجے　　سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

بیماریِ عشق لا دوا ہے　　اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ　　ایسا نہ ہو ' لائے اور کچھ رنگ

دیوانے کی مطلق العنانی !　　ہے باعث مرگِ ناگہانی !!

تدبیر کا حوصلہ نکالا　　زنجیر کا سلسلہ نکالا

جب وحشتِ عشق ہو زیادہ　　زنجیر ہے پیشِ پا فتادہ

شوریدہ بکاؤلی غضب تھی
زنجیروں میں بھی وہ بند کب تھی

سوالات

۱۔ اردو مثنویوں میں "گلزارِ نسیم" کی خصوصیات پر مفصل نوٹ لکھیے۔
۲۔ سحرالبیان اور گلزارِ نسیم دونوں مثنویوں کا موازنہ کیجیے۔
۳۔ نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔
۴۔ اس نظم میں استعارے اور تلمیح کے استعمال کی نشاندہی کیجیے۔

—— ○○○ ——

مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ "رثاء" سے نکلا ہے جس کا معنی ماتم ہے لیکن اصطلاح میں مرثیہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس کے اشعار میں ممدوح کے اوصاف بیان کر کے اس کی موت پر ماتم کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں عام طور پر شہدائے کربلا کے مناقب اور مصائب کا بیان ہوتا ہے۔

مرثیے کے مختلف حصے حسبِ ذیل ہوتے ہیں :

١۔ ابتدا یا تمہید

مرثیے کی ابتدا یا تمہید کو چہرہ کہتے ہیں۔ اس میں شاعر حمد، نعت یا منظر کشی کے مضامین باندھتا ہے۔

۲۔ سراپا

اس میں شاعر اپنے ممدوح کا تعارف کراتا ہے اور اس کے مختلف اوصاف و صفات بیان کرتا ہے۔

۳۔ رخصت

اس حصے میں شاعر میدانِ جنگ کی طرف ممدوح کی روانگی کا منظر پیش کرتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے عزیز و اقارب اور ساتھیوں سے رخصت ہو کر جنگ کے میدان کی طرف جاتا ہے۔

۴۔ آمد

اس میں شاعر میدانِ جنگ میں اپنے ممدوح کی آمد کا سماں پیش کرتا ہے۔

۵۔ رَجز

اس حصے میں شاعر کا ممدوح میدانِ جنگ میں پہنچ کر اپنے دشمن کے سامنے اپنی عظمت، مقصد کی صداقت اور خاندانی وقار و بلندی وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور انھیں راہِ حق اختیار کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

٦۔ جنگ

اس حصے میں شاعر اُس جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے جو شاعر کے ممدوح اور اُس ممدوح کے دشمن کے درمیان ہوتی ہے۔ اس حصے میں ممدوح کے گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف بھی آجاتی ہے۔

۷۔ شہادت

اگر شاعر کا ممدوح شہید ہو جائے تو اس حصے میں اس کی شجاعت کے ذکر کے ساتھ اس کی شہادت کے واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ شہادت کے واقعات عام طور پر نہایت جذباتی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں کیونکہ یہ

مسئلہ ہی انسانی جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔

۸۔ دعا

اس حصے میں شاعر خاص طور پر شہداء اور پھر امت اسلامیہ کے تمام افراد کے لیے بلند درجات کی دعا کرتا ہے اور عام طور پر اس دعا پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے۔

مرثیہ گوئی میں انیس اور دبیر کا زمانہ اس صنفِ سخن کا سنہری دَور تھا۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سے مرثیہ نگار پیدا ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی انیس اور دبیر سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آج بھی ان دونوں کے مقابلے کا کوئی شاعر نہیں ہے۔

—— ○○○ ——
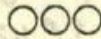
میر انیسؔ

(۱۸۰۲ء - ۱۸۷۴ء)

اصل نام ببر علی اور تخلص انیسؔ تھا۔ ان کا مقام پیدائش فیض آباد کا شہر تھا۔ ان کے والد میر خلیق بھی شاعر تھے۔ دادا نامور مثنوی نگار میر حسن اور پردادا مشہور ہجو گو میر ضاحک تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ پانچویں پشت تک جا پہنچتا ہے۔ انیس اس بات پر فخر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں کہ :

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

پانچویں پشت ہے شبیرؔ کی مداحی میں

انیس کا خاندان زبان کی صحت و صفائی اور شیرینی کی طرف خاص طور پر توجہ دیتا تھا۔ انیس کو ایک زمانے میں فنونِ سپہ گری سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ لکھنؤ آنے کے بعد لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے بہت متاثر ہوئے اور شعر کہنے لگے۔ ان کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا لیکن اپنے والد کے کہنے پر وہ اپنی خاندانی صنفِ مرثیہ گوئی پر مائل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انیس نے اس صنفِ سخن میں اس قدر مشق بہم پہنچائی کہ ان کی فصاحت و بلاغت کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ آج ان کی ہر نظم موتیوں کا ہار معلوم ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی متغزلانہ فضا، غزل ہی کے ماحول اور عیش پسندی کے باوجود مرثیہ نگاری کو اوجِ کمال تک پہنچانا انیس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

انیس جب فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو اس وقت وہاں شاعرانہ ماحول عروج پر تھا۔ دیگر کئی شہروں کے سخن ور وہاں جمع ہو رہے تھے۔ میر انیس نے اس ماحول میں رہ کر خاص طور پر مرثیہ کی طرف توجہ دی اور رفتہ رفتہ اس صنف میں وہ شہرت، مقبولیت اور ہردل عزیزی حاصل کر لی کہ وہ مرثیے کے ممتاز ترین شاعر قرار دیے جانے لگے۔

میر انیس ایک خوش الحان شاعر تھے۔ ان کا مرثیہ پڑھنے کا انداز سامعین پر ایک خاص وجد سا طاری کر دیتا تھا اور ان کے دلوں اور ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑتا تھا۔ میر انیس صاحبِ مطالعہ آدمی تھے۔ وہ عربی اور فارسی میں خاصی استعداد حاصل کر چکے تھے۔ ان کو قرآن و حدیث کے مطالعے سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ذاتی اعتبار سے وہ ایک وضع دار اور ملنسار شخص تھے۔ ان کی ذاتی اور شاعرانہ خوبیوں نے انیس کو بہت جلد بہت زیادہ مقبول بنا دیا۔

خصوصیات

میر انیس کے مرثیوں میں جو خوبیاں موجود ہیں، ان میں یہ پہلو خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں :

فصاحت و بلاغت، کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری، استعارات و تشبیہات، صنائع و بدائع، روزمرہ و محاورہ وغیرہ

میر انیس کے مرثیے متعدد جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔

صبحِ شہادت

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں، وہ سحر
دم بہ دم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرّد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

بلبلوں کی وہ صدائیں، وہ گلوں کی خوشبو
دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پُر خم گیسو
فاختہ کہتی تھی شمشاد پہ "یاہُو، یاہُو"
سرو سے آتی تھی قمری کی صدا "کُو، کُو، کُو"

وقت تسبیح کا تھا، عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دو جہاں
اس طرف طبل بجا، یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مُصلّی[1] کہ زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازیں کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں

زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

1۔ نماز پڑھنے والا۔ نمازی۔

اللہ اللہ عجب فوج، عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل، عجب تازی تھے
لائقِ مدح و سزاوارِ سرافرازی تھے
گو بہت کم تھے پر آمادۂ جانبازی تھے

پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زُہد میں حضرت سلمانؓ[1] کے برابر تھا کوئی
دولتِ فقر و قناعت میں ابوذرؓ[2] تھا کوئی
صدقِ گفتار میں عمارؓ[3] کا ہمسر تھا کوئی
حمزہؓ[4] عصر کوئی، مالک اُشتر[5] تھا کوئی

ہوں گے ایسے ہی، محمدؐ کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاد ایسا نہ ہو گا" نہ وہ پیدا ہوں گے

سوالات

۱۔ اردو مرثیہ نگاری کا مفصل جائزہ تحریر کیجیے۔

۲۔ اردو مرثیہ نگاری میں میرانیس کی مرثیہ نگاری پر نوٹ لکھیے۔

۳۔ آخری بند کی تشریح کیجیے اور اس میں مستعمل تلمیحات کی نشاندہی کیجیے۔

۴۔ صبحِ شہادت کے دوسرے بند میں کس صنعتِ کلام کا استعمال ہوا ہے؟

— ○○○ —

۱۔ حضرت سلمانؓ (فارسی) ۲۔ حضرت ابوذر غفاریؓ ۳۔ حضرت عمارؓ۔
۴۔ حضرت حمزہؓ نامور صحابیِ رسولؐ کا نام ۵۔ حضرت علیؓ کے ایک ساتھی کا نام۔

میرزا دبیرؔ
(۱۸۰۳ء - ۱۸۷۹ء)

نام میرزا سلامت علی اور تخلص دبیر تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن ان کے والد مرزا غلام حسن اس زمانے کی دلی کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ میں منتقل ہو گئے جہاں کے معاشی حالات بہتر تھے۔ میرزا دبیر کی عمر اس وقت صرف سات برس تھی۔ انھوں نے شروع شروع میں کچھ مروجہ تعلیم اپنے گھر ہی پر پائی، پھر مختلف مدارس میں تحصیلِ علم کے لیے کوشاں رہے۔

میرزا دبیر بڑے ہوئے تو لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا رواج زوروں پر تھا۔ انھوں نے اس طرف توجہ دی تو جلد ہی ایک ممتاز اور عظیم مرثیہ گو کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کے نواب اور دیگر امراء ان کے قدر دانوں میں شامل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ آخری عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تو اودھ کے آخری تاجدار نے جو خود کلکتہ میں نظربند تھے، ان کو کلکتہ بلا لیا اور ان کا علاج کرایا۔

میرزا دبیر کی زندگی کا زیادہ حصہ لکھنؤ ہی میں گزرا اور وہ فوت بھی وہیں ہوئے۔ اگرچہ میرزا دبیر کی تقریباً ساری زندگی لکھنؤ میں گزری لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں دلی کے دبستانِ شاعری کا رنگ غالب رہا۔ مرزا دبیر ابتدا ہی سے بہت ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھیں بھی میر انیس کی طرح عربی اور فارسی پر کافی دسترس حاصل تھی۔ ان کے مزاج میں متانت کا عنصر نمایاں تھا۔ پھر ہجرت کی وجہ سے وہ کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں ان کے ابتدائی کلام میں مرثیہ نگاری کے آثار نمایاں ہیں۔

میرزا دبیر نے جب مرثیہ گوئی کا آغاز کیا تو ابتدا میں اس دَور کے عظیم مرثیہ گو میر ضمیر سے اصلاح لیتے رہے اور جلد ہی ان کے تلامذہ میں سے نمایاں ترین شاعر کا رتبہ حاصل کر لیا۔

لکھنؤ کے امرا اور رؤسا مرزا دبیر کے بہت قدر دان تھے۔ ایک طویل عرصے تک میرزا دبیر لکھنؤ کے عظیم ترین اور مقبول ترین مرثیہ گو قرار دیے جاتے رہے پھر جب انیس وہاں آ گئے تو دبیر کی شہرت و مقبولیت ایک حد تک متاثر ہونے لگی۔ لیکن اس کے باوجود مرزا دبیر کے مداحوں نے ساری عمر ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

میرزا دبیر کے مرثیے اپنی آب و تاب، گھن گرج، زبان و بیان کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔ مولانا شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر لکھ کر انیس کو مرزا دبیر سے بہتر شاعر قرار دیا ہے۔ بہرحال انیس کے بعد اگر اردو کا کوئی اور مرثیہ گو شاعر عظیم ترین کہلا سکتا ہے تو وہ یقیناً میرزا دبیر ہیں۔

خصوصیات

میرزا دبیر کے کلام میں جو خصوصیات نمایاں طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان میں اندازِ بیان کا رعب و دبدبہ، لکھنوی اثرات، منظر نگاری، لفظی صنعت گری، واقعہ نگاری، اندازِ بیان کا بے ساختہ پن، حسنِ تشبیہ، تاثیر بیان، سراپا نگاری وغیرہ خاص ہیں۔

صبح کا منظر

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیِٰ زہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

تھی صبح یا فلک کا وہ جیب دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا
یا فاطمہؓ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا

کہیے نہ مہر، صبح کے سینے پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

بڑھ کر نقیبِ نور پکارا : سحر سحر
تھی آسماں سے بارشِ رحمت شجر شجر
لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
ذروں میں نورِ مہر در آیا قمر قمر

برقع جو اٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبحِ ملمّع نقاب کا

تازہ کیا نسیمِ سحر نے چمن کا رنگ
لالہ دکھا رہا تھا عقیقِ یمن[1] کا رنگ

1۔ ایک علاقہ جو جواہرات کے لیے مشہور ہے۔

تھا موتیوں کے پھولوں میں دُرِ عدن کا رنگ
غنچے کی بو سے اڑتا تھا مشکِ ختن [1] کا رنگ
کھل کھل کے پھول نافے کی صورت مہکتے تھے
ذکرِ خدا میں مرغِ خوش الحاں چہکتے تھے

سوالات

۱۔ اردو مرثیہ نگاری میں میرزا دبیر کو کیا مقام حاصل ہے؟

۲۔ نظم میں مستعمل تشبیہات و استعارات کی وضاحت کریں۔

۳۔ اردو مرثیہ نگاری میں انیس اور دبیر کا موازنہ کیجیے۔

۴۔ صبح کا منظر میں استعمال تراکیب اور تشبیہات کی نشاندہی کیجیے۔

۵۔ دوسرے بند میں موجود تلمیحات کی وضاحت و نشاندہی کیجیے۔

——— ○○○ ———

۱۔ ختن ایک علاقہ جو خوشبو کے لیے مشہور ہے۔

نظم
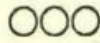
نظم بہت جامع لفظ ہے۔ ایک تو یہ نثر کے مقابلے میں ہر قسم کے اشعار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے اس سے مراد مخصوص ہیئتوں کے اشعار بھی ہیں جو کسی ایک مضمون یا موضوع پر کہے گئے ہوں۔

نظم کے لیے مسمّط کا لفظ بھی آتا ہے۔ جس کا معنیٰ ہے موتیوں کی لڑی۔ اصطلاح میں اس سے مراد کوئی ایسی نظم ہوتی ہے جس کے مختلف بند ہوں۔ پھر ہر بند مختلف مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے جو کم از کم تین ہوتے ہیں۔ مصرعوں کی تعداد کے اعتبار سے ہر بند کا نام مختلف ہو گا۔ مثلاً:

- تین مصرعوں کا بند ہو تو اسے مثلث کہا جائے گا۔
- چار مصرعوں کا بند ہو تو اسے مربّع کہا جائے گا۔
- پانچ مصرعوں کا بند ہو تو اسے مخمّس کہا جائے گا۔
- اور چھ مصرعوں کا بند ہو تو اسے مسدس کہا جائے گا۔

اگر مصرعوں کی تعداد آٹھ اور دس ہو تو ایسی نظم کو بالترتیب مثمّن اور معشّر کا نام دیا جاتا ہے اور ترکیب بند یا ترجیع بند بھی کہا جاتا ہے۔

ترکیب بند وہ طویل نظم ہوتی ہے جس کے کئی بند ہوں اور ہر بند میں چار' پانچ' چھ یا سات اشعار ہوں اور آخر میں ایک ٹیپ کا شعر ہو۔

ہیئت کے اعتبار سے یہ صنف سخن غزل کے مشابہ ہے۔ اس میں ہر بند کے پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور دوسرے تمام اشعار اس کے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مگر ٹیپ کے شعر کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔ اس میں ہر بند کے مصرعوں یا شعروں کی تعداد برابر ہوتی ہے اور ہر بند میں قافیہ بدل جاتا ہے نیز ٹیپ کے شعر کا قافیہ بھی علیٰحدہ ہوتا ہے۔

یہ صنف سخن طویل نظموں کے کام آتی ہے۔ اس میں مسدس اور مثنوی کی طرح ہر قسم کے موضوع پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہر وزن اور ہر بحر میں لکھی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال کی منظومات شمع و شاعر' طلوع اسلام اور مسجد قرطبہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ترجیع بند کی ہیئت بھی ترکیب بند کی طرح ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ترکیب بند میں ٹیپ کا مصرع یا شعر بدل جاتا ہے لیکن ترجیع بند میں ٹیپ کا مصرع بار بار دہرایا جاتا ہے اور وہ ہر بند کے اختتام پر آتا ہے۔

نظم گو شاعروں میں نظیر اکبر آبادی کا نام بہت نمایاں ہے جس نے عام موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں بعد کے شاعروں میں حالی کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ساتھ ہی محمد حسین آزاد کا نام بھی لیا جائے گا۔

علامہ اقبال بھی مجموعی طور پر اور بنیادی حیثیت سے نظم کے شاعر ہیں۔ اقبال کے بعد جن شاعروں نے خاص طور پر نظم کی طرف توجہ دی ' ان میں سیماب اکبر آبادی 'تاجور نجیب آبادی ' جوش ملیح آبادی ' اختر شیرانی 'احسان دانش 'حفیظ جالندھری 'فیض احمد فیض 'آغا حشر 'ڈاکٹر تاثیر 'مجید امجد وغیرہ شامل ہیں۔

ہمارے اس دور میں بھی بعض نظم نگار شاعر موجود ہیں۔ دیکھیے زمانہ کن کو ابھار کر آئندہ سامنے لاتا ہے۔

—— OOO ——
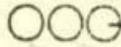
نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۵ء - ۱۸۳۰ء)

نام سید ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ اکبر آباد میں پیدا ہونے کی وجہ سے نظیر اکبر آبادی مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا جو نوری دروازہ آگرہ میں رہتے تھے۔ ان کا شمار اکبر آباد کے شرفا میں ہوتا تھا۔

عبدالغفور شہباز نے اپنی کتاب "زندگانیِ بے نظیر" میں لکھا ہے کہ نظیر کے والد کے گھر میں بارہ بچے پیدا ہوئے جو فوت ہو گئے۔ نظیر تیرھویں تھے جو بڑی دعاؤں اور تمناؤں سے بچے تھے۔ ان کے والدین نے نظرِ بد سے بچانے کے لیے ان کے کان اور ناک چھدوا کر انھیں بالکل لڑکی سا بنا دیا تھا۔

نظیر کی جو قلمی تصویر آج ہمارے سامنے ہے، اس کے مطابق ان کا رنگ گندم گوں، قد متوسط، بلند پیشانی، چمکدار آنکھیں، بلند ناک، خشخشی داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، محمد شاہ رنگیلے کے زمانے کا لباس کھڑکی دار پگڑی، گاڑھے کا انگرکھا، ایک بر کا پاجامہ، انگلیوں میں عقیق اور فیروزے کی انگوٹھیاں۔ یہ تھے نظیر اکبر آبادی

بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ نظیر اکبر آباد میں نہیں بلکہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ نظیر کے حالاتِ زندگی تاریخِ ادب اور شعرا کے تذکروں میں کم بلکہ بہت ہی کم ملتے ہیں۔ لیکن نظیر نے خود اپنے اشعار کے ذریعے سے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے جس میں سوانح، مشاغل، شکل و صورت، علم و قابلیت، پیشہ و کاروبار وغیرہ شامل ہے۔

نظیر اکبر آباد کے ایک سکول میں مدرس تھے، جہاں غالب بھی بچپن میں ان سے پڑھتے تھے۔ شاعری کی حیثیت سے نظیر کی شاعری عوامی شاعری ہے، اسی لیے وہ عروضی و غیر عروضی بہت سی علمی و ادبی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ بہر حال ایک شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اردو شاعری کو غالباً" سب سے زیادہ الفاظ دیے ہیں۔

وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی نظموں کے عام موضوعات میں برسات، شب برات، عید الفطر، بسنت، ہولی، کبوتر بازی، بلبلوں کی لڑائی، گلہری کا بچہ، اژدہے کا بچہ، لطف شباب، عالمِ پیری، جاڑے کی بہاریں، آندھی، تربوز، کھیاں، آگرے کی ککڑی، دنیا، جوگی، جوگن، بانسری، ہنس نامہ وغیرہ شامل ہیں۔

اگرچہ یہ عنوانات و موضوعات عام ہیں اور ان کا تعلق بھی ہماری زندگی سے ہے لیکن ان نظموں میں عوامی زندگی کا جو شعور پایا جاتا ہے اور جس خوبصورتی سے وہ ہر منظر کی تصویر کھینچتے ہیں، اس کی کوئی مثال ان سے پہلے اور ان کے بعد کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کو زبان اور اظہار پر جو بے مثال دسترس حاصل ہے اور جس آسانی اور روانی سے وہ موضوع کے مطابق الفاظ کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں وہ فنِ شاعری پر ان کی مکمل دسترس کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا قلم نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ موضوع پر بھی جس مہارت اور روانی سے چلتا ہے، وہ قاری اور سامع کو بے اختیار داد دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو بجا طور پر پہلا عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔

نظیر کی زندگی اگرچہ مالی طور پر خوش حال زندگی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ انانیت پسند تھے اور ہر حال میں اپنی آبرو کی حفاظت کرتے تھے۔ نظیر کی شاعری کا شہرہ سن کر نواب سعادت علی خاں نے انھیں دربار میں بلانا چاہا اور ملازمت کی صورت میں بھاری تنخواہ کی پیش کش کی لیکن یہ آگرہ چھوڑ کر لکھنؤ نہیں گئے۔

خصوصیاتِ کلام

نظیر اکبر آبادی کے کلام میں حسبِ ذیل خصوصیات نمایاں ہیں:

حقیقت پسندی، واقعہ نگاری، لفظی پیکر تراشی، جزئیات نگاری، منظر کشی، شگفتگی، روایت سے گریز، معاشرے کی عکاسی، تشبیہات کا نرالا پن، عام زبان و بیان وغیرہ۔

نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے مطالعے سے ان کی شاعری کا جو مزاج ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ نظیر کی شاعری اس دَور کی سیاسی افراتفری، معاشی بدحالی، اخلاقی اقدار کی بے قدری اور لوگوں کی ذہنی پریشانیوں کی آئینہ دار ہے۔

مجموعی طور پر نظیر اکبر آبادی کا کلام اردو شاعری میں ایک منفرد انداز کا عکاس ہے۔

(۱) دنیا

یہ جتنا خَلق میں یاں جا بجا تماشا ہے
جو غور کی تو یہ ہر ایک کا تماشا ہے
نہ جانو کم اسے یارو! بڑا تماشا ہے
جدھر کو دیکھو، اُدھر اِک نیا تماشا ہے

غرض مَیں کیا کہوں، دنیا بھی کیا تماشا ہے

رمرے یہ دیکھ تماشے نہیں ہیں ہوش بجا
کسے بتاؤں میں سیدھا، کسے کہوں الٹا
جو ہو طلسمِ حقیقی، وہ جاوے کب سمجھا
عجب بہار کی اِک سیر ہے اہا، ہا، ہا!

غرض میں کیا کہوں، دنیا بھی کیا تماشا ہے

زباں ہے جس کی، اشارت سے وہ پکارے ہے
جو گونگا ہے، وہ کھڑا فارسی بگھارے ہے

کلاہ ہنس کی ' کوّا کھڑا اتارے ہے
اچھل کے مینڈکی ہاتھی کے لات مارے ہے

غرض میں کیا کہوں ' دنیا بھی کیا تماشا ہے

چمن ہیں خشک ' بنوں بیچ آب جاری ہے
خراب پھول ہیں ' کانٹوں کی گلعذاری ہے
سیاہ گوش کو ، پدڑی نے لات ماری ہے
دبکتے پھرتے ہیں چیتے ' ہرن شکاری ہے

غرض مَیں کیا کہوں ' دنیا بھی کیا تماشا ہے

جنھوں کے کان نہیں ، دُور کی وہ سنتے ہیں
جو کان والے ہیں ' بیٹھے وہ سر کو دُھنتے ہیں
دھوئیں برستے ہیں اور ابر تنکے چنتے ہیں
کباب بھونتے ہیں اور کبابی بھنتے ہیں

غرض مَیں کیا کہوں ' دنیا بھی کیا تماشا ہے

عزیز تھے سو ہوئے چشم میں سبھوں کی حقیر
حقیر تھے سو ہوئے سب میں صاحبِ توقیر
عجب طرح کی ہوائیں ہیں اور عجب تاثیر
اچنبھے خلق کے کیا کیا بیاں کروں مَیں نظیرؔ !

غرض میں کیا کہوں ' دنیا بھی کیا تماشا ہے

(۲) فکر آٹے دال کا

کیا کہوں نقشہ مَیں یارو ! خَلق کے احوال کا
اہلِ دولت کا چلَن یا مفلس و کنگال کا
یہ بیاں تو واقعی ہے ہر کسی کے حال کا

کیا تونگر ، کیا غنی ، کیا پیر اور کیا بالکا
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا اندیشہ ہوتا سّدِ راہ
پھر نہ پھرتے ملک گیری کو وزیر و پادشاہ
ساتھ آٹے دال کے لے حشمت و فوج و سپاہ
جا بجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں آہ
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں
منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خاں
جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی رات واں
کیا عجب نقشہ پڑا ہے ' آہ ! کیا کیجے بیاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا یاں کھٹکا ہوتا بار بار
دوڑتے کاہے کو پھرتے دھوپ میں پیادے ' سوار
اور جتنے ہیں جہاں میں پیشہ ور اور پیشہ دار
ایک بھی جی پر نہیں ہے اس سوا صبر و قرار
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

سوالات

۱۔ نظیر اکبر آبادی کی عوامی نظموں کے بارے میں اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم "دنیا" کا مختصر جائزہ لیجیے۔

۳۔ مخمس کا ہر پانچواں مصرع اور مسدس کے ہر بند کا تیسرا شعر من و عن دہرائے جائیں تو مخمس میں اسے ٹیپ کا مصرع اور مسدس میں ٹیپ کا شعر کہتے ہیں۔ گویا شاعر اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اس مصرع یا شعر میں کہی گئی بات کو بار بار دہراتا ہے نظم "دنیا" اور "فکر آٹے دال کا" میں شاعر نے ٹیپ کے مصرع میں کیا بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ ٹیپ کے مصرع میں بھی ایک صنعت کا استعمال ہے' وہ کیا ہے؟

۵۔ اگر یہاں آٹے دال کا فکر نہ ہوتا تو شاعر کے خیال میں دنیا کی صورت کیا ہوتی' اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

OOO
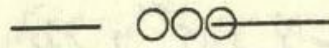
خواجہ الطاف حُسین حالیؔ[1]

(۱۸۳۷ - ۱۹۱۵ء)

(۱) مسلمانوں کا تابناک ماضی

گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا[2] کے اٹھی　　بڑی چار سُو یک بیک دھوم جس کی

کڑک اور دمک دُور دُور اس کی پہنچی　　جو ٹیگس[3] پہ گرجی تو گنگا[4] پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں نے　　کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے

ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے　　کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اِک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ہر اِک میکدے سے بھرا جا کے ساغر　　ہر اِک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر

گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر　　گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبرؐ

کہ حکمت کو اِک گمشدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

۱۔ سوانحی حالات و خصوصیات کلام کے لیے صفحہ نمبر ۳۴۴ دیکھیے۔
۲۔ مراد مکہ معظمہ۔
۳۔ (TAGUS) سپین کا دریا جو پرتگال میں سے بہتا ہوا بحرِ اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔
۴۔ بھارت کا مشہور دریا جس میں ہندو اپنی مذہبی عقیدت سے اشنان کرتے ہیں۔

ہر اک علم اور فن کے جویا ہوئے وہ ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ

فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

نہیں اس طبق پر کوئی برِّ اعظم نہ ہوں جس میں ان کی عماراتِ محکم

عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم[1] بناؤں سے ہیں ان کی معمورِ عالم

سرِ کوہِ آدم[2] سے تا کوہِ بیضا[3]
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر

جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیتِ حمرا[4] کی گویا زباں پر

کہ تھے آلِ عدناں[5] سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

سمرقند[6] سے اندلس تک سراسر انہی کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر

سوادِ مراغہ[7] میں اور قاسیوں[8] پر زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر !

۱۔ ممالک کے نام۔ ۲۔ بحیرہ قزوین کے جنوبی و مغربی گوشے کے ساتھ پہاڑوں میں نہایت سرسبز و شاداب علاقہ 'کوہ آدم'۔
۳۔ اندلس کا بلند ترین پہاڑ (Mount Solorius) اس کی چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے اس لیے اسے جبل بیضا یا کوہ بیضا بھی کہتے ہیں۔
۴۔ مراد اندلس کا محل الحمرا ہے۔ ۵۔ عرب کے ایک نامور قبیلے کا نام۔
۶۔ جدید نام زرافشاں۔ روسی ریاست جو اب آزاد ہو چکی ہے۔ ازبکستان کا ایک اہم شہر۔ بخارا سے ۱۵۰ میل مشرق میں دریائے زرافشاں کے کنارے۔ کپاس اور ریشم کی اہم منڈی۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا اہم مرکز۔
۷۔ ایرانی آذربائیجان کا مشہور شہر اور صوبے کا صدر مقام۔ ہلاکو خان نے طوسی کی نگرانی میں اس شہر کے باہر رصد گاہ بنوائی تھی۔
۸۔ اس شہر میں بھی رصد گاہیں تھیں اور اس وقت اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔

کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجّم کہاں ہیں

برکھا رُت

(مثنوی)

کل شام تلک تو تھے یہی طور — پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پُروا کی دہائی پھر رہی ہے — پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پر چھاؤنی سی چھاتی — ایک آتی ہے فوج، اک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے — ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی — پھٹتی ہے زمیں کی دہلتی
مینہ کا ہے زمین پر دریڑا — گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی — آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے کیا ہے غسلِ صحت — کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
بٹیا ہے، نہ ہے سڑک نمودار — انکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی — عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار — دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے "پیہو ' پیہو" اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سُو

کویل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

سوالات

۱۔ مسدسِ حالی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۲۔ شاعر نے مسلمانوں کے تابناک ماضی کے حوالے سے جو باتیں گنوائی ہیں 'انھیں مختصر طور پر لکھیے۔

۳۔ نظم "تابناک ماضی" کے بند ۲' ۳' ۴ کی آسان الفاظ میں وضاحت کریں۔

۴۔ نظم "برکھارت" کا خلاصہ آسان لفظوں میں تحریر کریں۔

۵۔ نظم "مسلمانوں کا تابناک ماضی" میں مستعمل تلمیحات کی نشاندہی کرتے ہوئے مختصراً ان کی وضاحت کیجیے۔

—— ○○○ ——

علامہ اقبال [۱]

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

(۱) بزمِ انجم

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو طشتِ اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شَفق نے سونے کا سارا زیور قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دُور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اِک مَلک کی

اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو! تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمھاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

حُسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی رہبری میں جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نَو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اِک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ، تاروں کی زندگی میں

۱۔ سوانحی حالات و خصوصیاتِ کلام کے لیے صفحہ نمبر ۳۵۰ دیکھیے۔

(۲) ذَوق و شَوق

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر[۱] و سلیم[۲]، تیرے جلال کی نمود!
فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ، تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب!

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے!
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علمِ نخیلِ بے رطب!
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہُوا
عشقِ تمام مصطفیٰؐ! عقل تمام بُولہب!
عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب!
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب!

۱۔ سنجر سلطان معز الدین ابو الحارث احمد سنجر ملک شاہ سلجوقی کا فرزند عراق کے شہر سنجر میں پیدا ہوا اس حوالے سے سنجران کے نام کا جزو بن گیا۔

۲۔ عثمانی سلاطین سلیم اول (۱۴۶۷ء۔۱۵۲۰ء) جس کے عہد میں دولت ترکیہ کی قوت و شان و شوکت عروج کو پہنچ گئی تھی۔

(۳) مردِ مسلماں!

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا[1] نہ بدخشان[2]

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!

۱۔ عہد قدیم میں وسط ایشیا کی ایک اسلامی ریاست جو افغانستان کے شمال میں واقع ہے۔
۲۔ افغانستان کے شمال مشرق میں واقع ایک اسلامی ریاست جس کا کچھ حصہ تازکستان میں ہے نہایت خوبصورت پہاڑی علاقہ قیمتی معدنیات کے لیے مشہور اور اسلامی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔

سوالات

۱۔ "اقبال جدید نظم کا سب سے بڑا شاعر ہے" کیا آپ اس بات سے متفق ہیں؟

۲۔ اپنے نصاب میں شامل اقبال کی کسی ایک نظم کا مفصل جائزہ لیجیے۔

۳۔ اقبال کی زندگی کے مختصر حالات تحریر کیجیے۔

۴۔ "بزمِ انجم" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵۔ "بزمِ انجم" میں مستعمل استعارات و تشبیہات کی نشاندہی کیجیے اور وضاحت کیجیے۔

۶۔ نظم "مردِ مسلمان" کے حوالے سے مردِ مومن کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

۷۔ نظم "ذوق و شوق" کے آخری تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

— ○○○ —
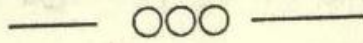
مولانا ظفر علی خاں[1]

(۱۸۷۳ - ۱۹۵۶ء)

(۱) اتمامِ نور

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کہہ دو انھیں سنا کے لَیَسْتَخْلِفَنَّکُمْ[2]
تقدیر کا نشان مٹایا نہ جائے گا

مُسلم ہُوں مَیں غلام ہیں شمس و قمر مِرے
اپنا یہ درجہ مجھ سے گھٹایا نہ جائے گا

میں گرچہ ناتواں ہوں مگر بارِ کائنات
میرے سوا کسی سے اٹھایا نہ جائے گا

مجھ سے بجز خدا کے کسی کے حضور میں
اپنا سرِ نیاز جھکایا نہ جائے گا

کرتا وضو لہو سے ہُوں اس کے لیے، مگر
اپنوں کا خون مجھ سے بہایا نہ جائے گا

کعبہ خدا کے گھر سے صنم خانہ بن گیا
اس بتکدے میں مجھ سے تو جایا نہ جائے گا

میں جس شرابِ تیز سے سرشار تھا کبھی
کیا مجھ کو پھر وہ بادہ پلایا نہ جائے گا

۱۔ سوانحی حالات اور خصوصیات کلام کے لیے صفحہ نمبر ۲۹۳ دیکھیے۔
۲۔ وہ ضرور تمھیں خلیفہ بنائے گا۔

میں جس نوائے تلخ سے مدہوش تھا کبھی
کیا مجھ کو پھر وہ نغمہ سنایا نہ جائے گا

ہاں، اے مرے نصیب ہوئی صبح، آنکھ کھول
اب تو تھپک تھپک کے سلایا نہ جائے گا

سر پر پہن کے آئے گا تاجِ شہنشہی
تو مصطفیٰؐ کے گھر جو گدایانہ جائے گا

اب بھی عرب میں اور عجم میں ہے گھر ترا
اس گھر میں کوئی اور بسایا نہ جائے گا

تثلیث[1] کو یہ جا کے سنا دو کہ آج سے
رنگنی کا ناچ ہم کو نچایا نہ جائے گا

اے کفر! ہاتھ پاؤں کٹے تیری راہ میں
سر رہ گیا ہے، سو وہ کٹایا نہ جائے گا

اقصائے ہند میں علمِ حق ہُوا بلند
یہ پرچم اب کسی سے گرایا نہ جائے گا

(۲) اللہ والے

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولھا بجھا ہوا

۱۔ تین خداؤں کے ماننے والے عیسائی مراد ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ خدا، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ، ایک دوسرے میں حلول ہو گئے ہیں یعنی تینوں میں ایک اور ایک میں تین کے وجود کے قائل ہیں۔

کسریٰ کا تاج روندنے کو پاؤں کے تلے
اور بوریا کھجور کا گھر میں بچھا ہوا

دستِ دعا انہی کے لیے عرش تک بلند
ہے جن کی آستین میں خنجر چھپا ہوا

احسان کی نوید سپید و سیاہ کو
سب کے لیے دریچہٴ رحمت کھلا ہوا

جن کے یہ سارے کام ہیں اللہ کے لیے
پھر کیوں نہ سب سے رتبہ ہو ان کا بڑھا ہوا

تیور بدل گئے تو زمیں کانپنے لگی
ابرو کے اِک اشارے سے محشر بپا ہوا

یثرب سے آج بھی یہ صدا گونجتی سنو
وہ جو خدا کے ہو گئے، اُن کا خدا ہوا

سوالات

۱۔ ظفر علی خان کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
۲۔ ظفر علی خان کی شاعری کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔
۳۔ ظفر علی خان کے مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔
۴۔ پہلی نظم کے پہلے شعر میں "یہ چراغ" سے کیا مراد ہے۔ اس استعارے کی روشنی میں شعر کی تشریح کریں۔
۵۔ نظم "اِتمامِ نور" کے چوتھے شعر میں جس تلمیح کا ذکر ہے اس کی وضاحت کیجیے۔
۶۔ نظم "اللہ والے" میں صنائع کے استعمال کی نشاندہی کیجیے اور اللہ والوں کی صفات اس نظم کی روشنی میں بتائیے۔

جوش ملیح آبادی

(۱۸۹۹ء - ۱۹۸۲ء)

نام شبیر حسن خاں اور جوش تخلص تھا۔ ملیح آباد میں پیدا ہوئے' اس لیے ملیح آبادی مشہور ہیں۔ ان کے دادا اور پردادا بھی شاعر تھے۔ گویا شعرو شاعری جوش کو ورثے میں ملی تھی۔

جوش کا خاندان ایک خوشحال اور نیم جاگیردارانہ قسم کے گھرانے پر مشتمل تھا۔ اس طرح جوش کا بچپن اور لڑکپن آسودہ حالی میں گزرا لیکن پھر جائداد نسل در نسل تقسیم ہو جانے کی وجہ سے معاشی مسائل بڑھتے گئے اور جوش کو مختلف قسم کی ملازمتیں کرنا پڑیں۔

جوش اول و آخر ایک نظم گو شاعر تھے۔ غزل سے انھیں زیادہ لگاؤ نہ تھا! البتہ رباعی بھی ان کی ایک پسندیدہ صنف تھی۔ وہ ایک زمانے تک غزل کی شدید مخالفت کرتے رہے۔

جوش کا کلام کئی مجموعوں کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ جن میں سے سب سے پہلا مجموعہ "روح ادب" تھا جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ جوش کو شاعرِ انقلاب بھی کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے برِصغیر پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کے زمانے میں بہت پرجوش اور انقلابی نظمیں لکھیں۔ ان کے کلام میں لہجے کی گھن گرج' الفاظ کا مناسب چناؤ اور جذبات و تخیلات کی بلندی کے باعث ان کا شعری مقام مسلسل بلند ہوتا گیا۔

بھارت تقسیم ہو جانے کے بعد وہ کچھ عرصہ دہلی ہی میں رہے لیکن پھر پاکستان آ گئے اور یہاں انھیں مناسب عزت اور پزیرائی حاصل ہوئی۔ آخری عمر میں ان کی شاعری میں پہلے سا زور اور جوش نہ رہا جو ان کی اصل وجہِ شہرت تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں ان کو زیادہ شہرت خود نوشت حالاتِ زندگی "یادوں کی بارات" کے باعث حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے مخصوص مزاج اور باغیانہ انداز سے اپنی زندگی اور اپنے ماحول کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

جوش کی شاعری کے جو مجموعے چھپ چکے ہیں ان میں "روحِ ادب" کے علاوہ "شعلہ و شبنم" "جنون و حکمت" "سموم و صبا" "جذباتِ فطرت" "سرود و خروش" "عرش و فرش" "رامش و رنگ" "شاعر کی راتیں" وغیرہ شامل ہیں۔

جوش اپنے باغیانہ لہجے' آزاد فطرت اور بے پناہ ذخیرہ الفاظ کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک منفرد مقام کے مالک تھے اور بیسویں صدی کی شاعری میں ان کا نام صفِ اول کے شعرا میں آتا ہے۔

جوش کی نظموں میں یوں تو مختلف موضوعات اور محسوسات کی عکاسی ہے لیکن خاص طور پر ان کی رومانی نظمیں زیادہ دلکش اور اثر انگیز ہیں۔ نظم گو شاعروں کے تذکرے میں جوش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) کسان

ناظرِ گُل ، پاسبانِ رنگ و بو ، گُلشن پناہ
ناز پرور ، لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارثِ اَسرارِ فطرت ، فاتحِ امید و بیم
محرمِ اَسرارِ باراں ، واقفِ طبعِ نسیم

جلوۂ قدرت کا شاہد ، حُسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل ، مہرِ عالمتاب کا نورِ نگاہ

قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خُو جھونکوں کا ہمدم ، تیز کرنوں کا رفیق

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوّتیں تخریب کی
جس کے بُوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ

جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار

جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہر یار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں

کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پر بل

سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

(۲) بدلی کا چاند

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا

مہتاب، وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی

تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے

لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیے، بادل میں دریچے ہیرے کے

گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں، چاندی کے سفینے لے کے چلا

سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے ، اُمواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے ، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا ، دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی ، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلّی دوڑ گئی ، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی ، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے ، کیا قید ہے ، کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

سوالات

۱۔ "جوش ملیح آبادی اردو نظم کی ایک توانا آواز ہے"۔ اس رائے پر اظہار خیال کیجیے۔
۲۔ جوش کی نظم "کسان" یا "بدلی کا چاند" کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔
۳۔ نظم "کسان" کے پہلے تین اشعار کی تشریح کرتے ہوئے بتائیں کہ ان میں کسان کو کن کن خوبصورت ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

—— ○○○ ——

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء - ۱۹۸۲ء)

محمد حفیظ نام اور حفیظ ہی تخلص تھا۔ جالندھر میں پیدا ہونے کے باعث حفیظ جالندھری کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں ہوئی۔ وہ خاندانی حالات اور خانگی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے لیکن چونکہ شاعری کا ملکہ ان میں فطری تھا' اس لیے اس میدان میں انھوں نے وہ نام پیدا کیا کہ بڑوں بڑوں سے اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوا لیا۔ حفیظ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ انھوں نے جو مقام حاصل کیا' اس میں ان کی ذہانت اور محنت بہت زیادہ شامل ہے

حفیظ نے اپنے پیچھے جو سرمایۂ شاعری چھوڑا ہے' اس میں ان کی حسب ذیل کتابیں شامل ہیں :

شاہنامۂ اسلام' نغمہ زار' سوز و ساز' تلخابۂ شیریں' حفیظ کے گیت' حفیظ کی نظمیں' بزم نہیں رزم' چراغ سحر وغیرہ۔

حفیظ کی طبیعت کو نظم اور غزل دونوں سے یکساں مناسبت اور مطابقت تھی' ان کی شاعری میں مقصدیت اور قومی جذبہ حالی اور اقبال سے منتقل ہوا' ویسے وہ باقاعدہ گرامی جالندھری کے شاگرد تھے۔

حفیظ کی شاعری کی خصوصیت غنائیت اور شگفتگی ہے۔ ان کے گیتوں میں خاص طور پر ہندی کے بعض الفاظ کا بے تکلفانہ انداز ان میں مٹھاس بھر دیتا ہے۔ حفیظ نے عروضی اعتبار سے بھی اپنے کلام میں قابل توجہ تجربے کیے ہیں۔ حفیظ نے ایک زمانے میں اپنے استاد مولانا گرامی جالندھری کے ساتھ مل کر "اعجاز" کے نام سے رسالہ بھی جاری کیا تھا۔

حفیظ بیس بائیس سال کی عمر میں جالندھر سے لاہور آ گئے تھے۔ یہاں کی ادبی فضا میں ان کے ادبی جوہر خوب کھلے اور وہ جلد ہی اپنے دور کے ممتاز شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں حکومت نے انھیں سونگ پبلٹی آرگنائزیشن کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "نغمہ زار" چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔

حفیظ جالندھری کا عظیم ترین شعری کارنامہ "شاہنامۂ اسلام" ہے جو اسلام کی منظوم تاریخ ہے۔ یہ کتاب شاعر کے دینی' قومی اور مقصدی جذبات کی بھی ترجمان ہے۔

حفیظ مشاعروں کے بھی کامیاب ترین شاعروں میں شامل تھے۔ وہ کچھ اپنے کلام اور کچھ شاعرانہ ترنم کے زور پر لوگوں کو مسحور کر لیتے تھے اور مشاعروں میں چھا جاتے تھے۔

خصوصیاتِ کلام

حفیظ جالندھری کے کلام میں کئی خوبیاں اور نمایاں خصوصیات ہیں، جو انھیں بہت حد تک کئی شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات مختصر طور پر حسبِ ذیل ہیں :

سادگی، دلکشی، موسیقیت، تغزل، منظر کشی، ندرتِ تشبیہات، مقصدیت، بحروں کا تنوّع وغیرہ

پاکستان کے قیام کے بعد حفیظ کو ایک اور اعزاز اور احترام بھی حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ہمارے وطن کے قومی ترانے کے خالق ہیں۔

(۱) حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا جہیز

جہیز ان کو مِلا جو کچھ شہنشاہِ دو عالَم سے
مِلا ہے درس ہم کو سادگی کا فخرِ آدم سے
متاعِ دُنیوی جو حصۂ زہراؓ میں آئی تھی
کھجوری کھردرے سے بان کی اِک چارپائی تھی
مشقّت عمر بھر کرنا جو لکھا تھا مقدّر میں
ملی تھیں چکیاں دو تاکہ آٹا پیس لیں گھر میں
گھڑے مٹی کے دو تھے اور اک چمڑے کا گدّا تھا
نہ ایسا خوش نما تھا یہ، نہ بدزیب اور بھدّا تھا
بھرے تھے اس میں روئی کی جگہ پتے کھجوروں کے
یہ وہ ساماں تھا جس پر جان و دل قربان حوروں کے
وہ زہراؓ جس کے گھر تسنیم[۱] و کوثر[۲] کی تھی ارزانی
ملی تھی مُشک ان کو تاکہ خود لایا کریں پانی

۱،۲۔ تسنیم اور کوثر دونوں جنت کی ندیوں کے نام ہیں۔

ملا تھا فقر و فاقہ ہی مگر اصلی جہیز ان کو
کہ بخشی تھی خدا نے اک جبینِ سجدہ ریز ان کو
چلی تھی باپ کے گھر سے نبیؐ کی لاڈلی پہنے
حیا کی چادریں، عفّت کا جامہ، صبر کے گہنے
ردائے صبر بھی حاصل تھی، توفیقِ سخاوت بھی
کہ ہونا تھا اسے سرتاجِ خاتونانِ جنّت بھی
پدر کے گھر سے رخصت ہو کے زہراؓ اپنے گھر آئی
توکل کے خزانے، دولتِ مہر و وفا لائی

(۲) جلوۂ سحر

چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر
زمیں پہ نور چھا گیا فلک پہ رنگ آ گیا
تمام زادگانِ شب چمک چمک کر سو گئے
شرارِ آسمانِ شب دمک دمک کے سو گئے
ستارے زرد ہو چکے چراغ سرد ہو چکے
وہ ٹمٹما کے رہ گئے یہ جھلملا کے رہ گئے
چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر

☆ ☆ ☆

یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا اور آسماں پہ چھا گیا

حَسینۂ نمود نے یہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی یکایک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آ گئی حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا

☆ ☆ ☆

عبادتوں کے در کُھلے سعادتوں کے در کھلے
درِ قبول وا ہوا دُعا کا وقت آ گیا
اذان کی صدا اٹھی جگا دیا نماز کو
چلی ہے اٹھ کے بندگی لیے ہوئے نیاز کو
صنم کدہ بھی کھل گیا اٹھا ہے شور سنکھ کا
چلو نمازیو ! چلو اٹھو پجاریو ! اٹھو
عبادتوں کے در کھلے سعادتوں کے در کھلے

☆ ☆ ☆

کسان اٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں کو لے چلے
کہیں مزے میں آ گئے تو کوئی تان اڑا گئے
یہ سرد شبنمی ہوا ! یہ صحت آفریں سماں
یہ فرشِ سبز گھاس کا یہ دل فریب آسماں
لبے ہوئے ہیں پریت میں ہیں محو ان کے گیت میں

کہاں ہیں شہر کے مکیں　　وہ بے نصیب اٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے　　مویشیوں کو لے چلے

☆ ☆ ☆

اٹھی حسینۂ سحر!　　پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباسِ نور زیب بر　　چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے　　پہاڑ طُور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے　　سحاب نور بن گئے
نوائے جوئبار اٹھی　　صدائے آبشار اٹھی
ہواؤں کے رباب اٹھے　　خوش آمدید کے لیے
اُٹھی حسینۂ سحر!　　پہن کے سر پہ تاجِ زر

☆ ☆ ☆

سوالات

۱۔ "حفیظ جالندھری نظم کے ممتاز شاعر ہیں۔" آپ کو اس سے کہاں تک اتفاق ہے؟
۲۔ حفیظ کی زندگی کے مختصر حالات تحریر کیجیے۔
۳۔ حفیظ کی نظموں کی خصوصیات بیان کیجیے۔
۴۔ حضرت محمد مصطفیؐ نے اپنی پیاری بیٹی فاطمۃ الزہراؓ کو جہیز میں کیا کیا عنایت فرمایا تھا۔
۵۔ آج کے زمانے میں جہیز معاشرتی ناسور بن چکا ہے۔ اس پر سیر حاصل مضمون لکھیے۔

——— ○○○ ———

فیض احمد فیض
(۱۹۱۱ء - ۱۹۸۵ء)

نام فیض احمد اور تخلص فیض تھا۔ ان کے والد کا نام سلطان محمد خاں تھا۔ فیض ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قادر میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے زیادہ لوگ زراعت پیشہ تھے۔ لیکن فیض کے والد نے خاندانی پیشہ اپنانے کی بجائے عربی، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ حاصل کی اور افغانستان کے ایک سرکاری وفد کی پیش کش پر اس کے ہمراہ کابل چلے گئے جہاں افغانستان کے والی امیر عبدالرحمٰن نے ان کی ذہانت، قابلیت اور صلاحیت کار سے متاثر ہو کر پہلے ان کو افغان شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا، پھر چیف سیکرٹری کے اعلیٰ عہدے پر ترقی دی اور بعد میں افغانستان کا سفیر کبیر مقرر کر کے انھیں انگلستان بھیجا جہاں وہ تین سال تک نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے سفارتی فرائض انجام دیتے رہے۔ افغانستان سے واپس آکر انھوں نے ایک بیرسٹر کے طور پر نئی زندگی کا آغاز کیا۔ انھیں شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔

خود فیض نے چار برس کی عمر میں حفظِ قرآن سے تعلیم کا آغاز کیا۔ بعد میں سیالکوٹ کے نامور عالم دین مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے مشہور مکتب میں داخل ہوئے اور وہاں سے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ پھر سکاچ مشن ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد مرے کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں علامہ اقبال کے استاد شمس العلما سید میر حسن سے عربی اور فارسی میں مزید مہارت حاصل کی۔ فیض نے بی۔اے گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر ایم۔اے انگریزی بھی وہیں سے پاس کر کے ایم۔اے عربی اورینٹل کالج سے کیا۔ اس کے بعد وہ ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں لیکچرار ہو گئے۔ کچھ عرصہ ہیلی کالج آف کامرس لاہور میں انگریزی پڑھائی۔

ایک زمانے میں وہ کیپٹن کے طور پر فوج میں چلے گئے اور دہلی جا کر شعبۂ تعلقاتِ عامہ میں خدمات انجام دیں۔ وہ پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سیکرٹری بھی رہے۔ کچھ عرصہ لندن میں بھی گزارا اور پھر وہاں سے واپس آکر کراچی میں رہائش اختیار کر لی اس دوران میں وہ عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ فیض کچھ عرصہ پاکستان ٹائمز لاہور کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ایک شاعر کے طور پر ان کی غزلیات اور بعض نظمیں بھی مقبول ہیں۔

فیض کو شعر و ادب سے لگاؤ اور دلچسپی وراثت میں ملی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فیض کو بچپن سے علم و ادب سے رغبت تھی۔ فیض کے والد کے ملنے والوں میں علامہ اقبال، سر شیخ عبدالقادر، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیات شامل تھیں، اس طرح گھریلو ماحول بہت حد تک علمی اور ادبی تھا۔

شعری مجموعے

فیض کا پہلا شعری مجموعہ نقشِ فریادی تھا جس کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے دیگر مجموعوں میں دستِ صبا، زنداں نامہ، دست تہِ سنگ سب کے سب مشہور اور مقبول ہیں۔ اب ان کا مجموعۂ کلیات بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ میزان ان کے نثری مضامین کا مجموعہ ہے۔

فیض کے کلام میں بعض قدیم خصوصیات کے علاوہ جدید مَیلانات بھی ملتے ہیں۔ وہ اردو کے مقبول شاعروں میں شامل ہیں۔

(۱) اِقبال

آیا ہمارے دیس میں اِک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مئے کدوں کا نصیبہ سنْور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اِک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اِک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لَے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

(۲) زِنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے

جیسے کہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اُشجار
سر نگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے!
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

سوالات

۱۔ فیض احمد فیض کی زندگی کے مختصر حالات تحریر کریں۔
۲۔ اردو نظم میں فیض کا مقام کیا ہے؟
۳۔ فیض کی نظم "زنداں کی ایک شام" کا جائزہ پیش کیجیے۔
۴۔ نظم "اقبال" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
۵۔ نظم "زنداں کی ایک شام" کے آخری بند کی تشریح کیجیے۔

—— ○○○ ——

احسان دانش

(۱۹۱۴ء - ۱۹۸۲ء)

نام احسان الحق اور تخلص بھی احسان ہی تھا۔ کبھی وہ اپنے والد قاضی دانش علی کی نسبت سے اپنا پورا نام احسان بن دانش لکھتے تھے۔ پھر احسانِ دانش لکھنے لگے جو بعد میں اضافت کے زیر کو حذف کر کے احسان دانش کی صورت اختیار کر گیا۔

ان کا آبائی وطن باغپت ضلع میرٹھ ہے لیکن احسان دانش کی ولادت، پرورش اور ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کے قصبے کاندھلہ ضلع مظفرگڑھ (بھارت) میں ہوئی۔ گھریلو مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہ پاسکے اور وقتاً فوقتاً معمولی کام کرنے لگے جن میں مزدوری کے علاوہ مالی اور قلی تک کے کام بھی شامل تھے۔ احسان دانش نے کسی زمانے میں انار کلی بازار لاہور کی بغلی سڑک ایبک روڈ پر "مکتبۂ دانش" بھی قائم کیا تھا، جہاں وہ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔

احسان کو شاعری سے لگاؤ چھوٹی عمر ہی سے ہو گیا تھا اور وہ قیامِ پاکستان سے بہت پہلے لاہور آ گئے تھے۔ یہاں کے ادبی ماحول نے انھیں بہت جلد محفلوں میں نمایاں کر دیا۔ احسان دانش اردو کے نامور شاعر اور فاضل ادیب علامہ تاجور نجیب آبادی کے تلامذہ میں شامل تھے اور پھر آگے ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ کسی زمانے میں مشاعروں میں اپنا کلام نہایت دلکش ترنم سے پڑھتے تھے۔ وہ بہت سادہ، فقیر منش، متقی، خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھے۔

احسان دانش کے کلام میں نظم، غزل، نعت، قطعہ، رباعی، گیت سب کچھ ملتا ہے لیکن ان کی اصل شہرت بیانیہ نظموں کی وجہ سے ہے۔ وہ خود مزدور تھے اور مزدوروں کے لیے انھوں نے بہت کچھ لکھا، اس لیے انھیں شاعرِ مزدور بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک مشاق اور پُر گو شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں "آتشِ سیال"، "نوائے کارگر"، "نفیرِ فطرت"، "جادۂ نو"، "فصلِ سلاسل" اور "چراغاں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "دارَین" کے نام سے ان کا نعتیہ کلام بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔

احسان دانش نے جو نظمیں محنت مزدوری کے موضوع پر لکھی ہیں، ان میں واقعیت نگاری کا رنگ موجود ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے ایک عظیم نظم نگار شاعر تھے۔ ان کی غزل میں بھی تغزل کے سارے اوصاف: دل کشی، دل سوزی، دل ربائی اور دل آویزی موجود ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے کراچی کے ایک ماہنامے "جامِ نو" نے "احسان دانش نمبر" چھاپا تھا، اس میں ان کی زندگی کے حالات اور شاعری پر خاصے مفصل مضامین موجود ہیں۔

شاعری کے علاوہ وہ ایک نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے نثر میں بھی بعض ضروری موضوعات مثلاً ضرب الامثال اور تذکیر و تانیث پر کام کیا ہے اور وہ چھپ چکا ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دانش" کے نام سے اپنے حالاتِ زندگی خود بھی لکھے ہیں۔

(۱) صُبحِ مسرّت

آثار سَحر کے پیدا ہیں ، اب رات کا جادو ٹوٹ چکا
ظلمت کے دستِ وحشت سے تنویر کا جادو ٹوٹ چکا
کُہرے کے دھندلے پردوں سے خورشید نکلتا آتا ہے
ظلمت میں اجالے کا دریا پہلو سے بدلتا آتا ہے
سُہلا کے گُلوں کے رخسارے جب باغ میں جھونکے آتے ہیں
مخلوق کے رَوندے رستوں میں خوشبو کے عَلَم لہراتے ہیں
جنبش ہے ہُوا سے پتوں میں ، پھولوں کو پسینے آتے ہیں
دریا کے لرزتے سینے پر کرنوں کے سفینے آتے ہیں
گردوں سے زمیں کے دامن پر تنویر اترتی آتی ہے
آنکھوں میں شبابِ فطرت کی تصویر اترتی آتی ہے
سبزے پہ نگاہیں دوڑا دیں اَنوار نے شبنم پینے کو
کیا بُقعۂ نور بنایا ہے پامال زمیں کے سینے کو
شاخوں میں لٹکتے سورج نے زر بفت کی چلمن ڈالی ہے
جھومر ہے افق کے ماتھے پر ، ظلمت سے بیاباں خالی ہے
سمٹے ہوئے ٹھنڈے ذروں پر خورشید نے دامن ڈال لیا
پھولوں نے لبوں کو جنبش دی ، کلیوں میں تبسم ڈھال لیا
عالَم کی زبانیں جاگ اٹھیں الفاظ نے بازو کھول دیے
تنظیمِ سکوتِ مطلق پر ، تقریر نے دھاوے بول دیے
جھونکوں کی لچکتی کمروں پر کرنوں کے سنہری محمل ہیں
اب گُل تو گُل ہیں کانٹے بھی فردوسِ نظر میں داخل ہیں

جلوؤں کو اٹھائے پلکوں پر، مشرق کی طرف جب جاتا ہوں
احسان! حسیں تیوروں سے ہر گام پہ ٹھوکر کھاتا ہوں

(۲) "چاہیے"

انسان ہو تو خُلق و محبت بھی چاہیے
آنکھوں میں شرم، دل میں شرافت بھی چاہیے

لازم ہے وقت دیکھ کے اندازِ گفتگو
اپنوں سے یہ بجا کہ شکایت بھی چاہیے

مانا کہ کار ساز خدا ہے، خودی نہیں
کچھ عرضِ مدّعا میں عقیدت بھی چاہیے

اس انجمن کی شرط نہیں حرفِ آرزو
اس کے لیے تو جرأت و ہمت بھی چاہیے

اَحکامِ حال پر سرِ تسلیم خم مگر
ماضی کے مرحلوں کی حکایت بھی چاہیے

دیوانگانِ شوق بہت بے ادب سہی
ان بیکسوں پہ چشمِ عنایت بھی چاہیے

کب تک غلامِ گردشِ دَوراں رہے کوئی
آزادیٔ نظر کی اجازت بھی چاہیے

کرتے ہیں سب ہجومِ مصائب میں بندگی
یادِ خدا بغیر ضرورت بھی چاہیے

سوالات

۱۔ نظم "صبحِ مسرت" کے پہلے چار اشعار کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

۲۔ اس نظم میں صبح ہونے کا جو منظر پیش کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل مضمون لکھیے۔

۳۔ "جب کوئی کلمہ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے علاوہ کچھ اور تعلق ہو تو علمِ بیان کی اصطلاح میں اسے "مجاز مرسل" کہتے ہیں۔ یہ تعلق بالعموم یہ ہوتے ہیں :

(ا) سبب کے ذکر سے مسبّب مراد لیا جاتا ہے۔

(ب) مسبّب کے ذکر سے سبب مراد لیا جاتا ہے۔

(ج) کُل کہ کر جُز اور جُز کہ کر کُل مراد لیا جاتا ہے۔

(د) عام بجائے خاص اور خاص بجائے عام استعمال کیا جاتا ہے۔

(ہ) ظرف بجائے مظروف اور مظروف بجائے ظرف استعمال ہوتا ہے۔

(و) ملزوم بجائے لازم یا لازم بجائے ملزوم استعمال ہوتا ہے۔

نظم "صبح مسرت" میں سے اس تعریف کی روشنی میں مجاز مرسل کی نشان دہی کیجیے۔

۴۔ نظم "چاہیے" کے ہر شعر میں کچھ کرنے کا ذکر ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے نظم کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

—— ○○○ ——

مجید امجد

(۱۹۱۴ء - ۱۹۷۴ء)

نام مجید اور تخلص امجد تھا۔ وہ جھنگ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد راشننگ کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر عمر بھر اسی محکمے میں ملازم رہے۔

ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے نتیجے میں عمر کے زیادہ حصے میں تنہا ہی رہے۔

مجید امجد کی طبیعت میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والے آدمی تھے لیکن انھیں مردم بیزار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ کم آمیز ضرور تھے لیکن گوشہ نشین اور تنہائی پسند نہیں تھے۔ وہ اپنے مخصوص حلقہ احباب میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔

مجید امجد کا پہلا مجموعہ "شب رفتہ" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا جس کے بعد اپنے مخصوص طرزِ فکر اور منفرد شعری موضوعات کے باعث ادبی حلقوں میں ان کا نام بہت عزت اور احترام سے لیا جانے لگا۔ لیکن چونکہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں زیادہ عرصہ ساہیوال (سابق منٹگمری) میں مقیم رہے، اس لیے علمی اور ادبی مراکز سے دوری اور اپنی طبعی درویش صفتی کی وجہ سے وہ عوامی سطح پر بہت زیادہ نمایاں نہ ہو سکے۔

مجید امجد کی شہرت ان کی وفات کے بعد زیادہ پھیلی۔ ان پر کئی کتابیں اور مضمون لکھے گئے۔ ان کا تمام کلام "کلیاتِ مجید امجد" کی صورت میں شائع ہوا اور اردو تنقید میں ان کی شاعری پر بہت سا تحقیقی کام بھی ہوا۔

مجید امجد کی نظموں کی سب سے اہم خوبی ان کے موضوعات کا چناؤ ہے۔ وہ اردگرد پھیلی ہوئی زندگی اور اس کے مناظر سے کوئی ایسی بات یا تصویر منتخب کرتے ہیں جو بظاہر بہت عام اور کئی بار کی دیکھی ہوئی ہوتی ہے، مگر وہ اس کے ایسے ایسے گوشے سامنے لاتے ہیں اور نظم کو زندگی کے بڑے بڑے مسائل کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ وہی عام سی بات ایک غیر معمولی نظم کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

مجید امجد کی شاعری ایک دردمند، حساس، باخبر اور منفرد ذہن و دل کی عکاس ہے۔ وہ انسان کے دکھوں میں شامل ہو کر دوسروں کے حوالے سے اپنے دکھ کو بیان کرتے ہیں۔ معاشرے کے انسانوں پر جبر اور انسانوں کے اپنے آپ پر ظلم کا ان کے ہاں ایک گہرا شعور پایا جاتا ہے۔

مجید امجد کی کلیات میں زیادہ تر نظمیں شامل ہیں اور وہ بھی آزاد نظمیں لیکن انھوں نے بعض غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی غزلیں بھی ایک مخصوص انفرادیت کی حامل ہیں۔ مجید امجد نے گیت اور گیت نما نظمیں بھی لکھی ہیں جو اپنے حسن اور معانی کے اعتبار سے بہترین شاعری کے نمونے ہیں۔

(۱) شاعر

میں شاعر ہوں، میری جمالیں نگہ میں
ذرا بھی نہیں فرق ذرّے میں، مہ میں
جہاں ایک تنکا سا ہے میری رہ میں

ہر اِک چیز میرے لیے ہے فسانہ
ہر اِک ڈوب سے سن رہا ہوں ترانہ
مرے فکر کے دام میں ہے زمانہ !

میں سینے میں داغوں کے دیپک جلائے
میں اشکوں کے تاروں کا بربط اٹھائے
خیالوں میں نغموں کی دنیا بسائے

رہِ زیست پر بے خبر جا رہا ہوں
کہاں جا رہا ہوں، کدھر جا رہا ہوں
نہیں جانتا ہوں، مگر جا رہا ہوں

یہ دنیا، یہ بے ربط سی ایک زنجیر
یہ دنیا یہ اِک نامکمل سی تصویر
یہ دنیا نہیں میرے خوابوں کی تعبیر

میں جب سوچتا ہوں کہ انساں کا انجام
ہے مٹی کے اِک گھر کی آغوشِ آرام
تو سینے میں اٹھتا ہے اِک دردِ بے نام

میں جب دیکھتا ہوں کہ یہ بزمِ فانی
غمِ جاودانی کی ہے اِک کہانی
تو چیخ اٹھتی ہے میری باغی جوانی

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
محبت کے دشمن سماجوں کی دنیا !

مری عمر بیتی چلی جا رہی ہے
دو گھڑیوں کی چھاؤں ڈھلی جا رہی ہے
ذرا سی یہ بتی جلی جا رہی ہے

جونہی چاہتی ہے مری روحِ مدہوش
کہ لائے ذرا لب پہ فریادِ پُر جوش
اجل آ کے کہتی ہے "خاموش، خاموش"

(۲) توسیعِ شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھایل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اِک میری سوچ، لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اِک، اے آدم کی آل !

سوالات

۱۔ جدید اردو نظم میں مجید امجد کا جو مقام ہے، اس پر مفصل بحث کیجیے۔

۲۔ مجید امجد کے مختصر حالات زندگی تحریر کیجیے۔

۳۔ نظم "توسیع شہر" کا مرکزی خیال قلم بند کیجیے اور استعارات کے استعمال والے اشعار کی تشریح کیجیے۔

۴۔ نظم "شاعر" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

ooo

قطعہ
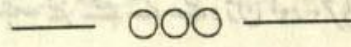
قطع عربی کا لفظ ہے، جس کا مطلب کاٹنا یا ٹکڑے کرنا ہے۔ لفظ "قطعہ" اسی سے بنا ہے جس کا مطلب ہے کاٹا ہوا کوئی حصہ یا ٹکڑا ہے۔ اصناف سخن کی اصطلاح میں قطعے سے مراد کم از کم دو شعروں کا وہ حصہ ہے جو قصیدے اور غزل کی طرح ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ردیف ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مضمون میں معنوی ربط یا تسلسل ضروری ہے۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا کہ قطعہ کم از کم دو شعروں پر مشتمل ہونا چاہیے، اس سے زیادہ اشعار کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

قطعہ کے پہلے شعر کے لیے قصیدے اور غزل کی طرح "مطلع" ہونا ضروری نہیں البتہ پورے قطعے میں مضمون یا موضوع کا ربط و تسلسل نہایت ضروری ہے۔ یہی خصوصیت ہے جو قطعے کو معنوی طور پر غزل کے مختلف المفہوم اشعار سے جدا کرتی ہے۔ نیز قطعے کے لیے وزن اور بحر کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ ہر وزن اور ہر بحر میں لکھا جا سکتا ہے۔

بعض دفعہ قطعہ قصیدے یا غزل میں بھی شامل ہوتا ہے لیکن معنوی طور پر ایک خیال کا حامل ہونے کی وجہ سے وہ قصیدے یا غزل کے الگ الگ عام اشعار سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو قطعہ کی بجائے امتیاز کے لیے "قطعہ بند" کہہ دیا جاتا ہے۔

میر اور سودا کی دو غزلوں سے قطعہ بند کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر !

میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

(میر)

☆ ☆ ☆

سودا ! جو کبھی گوش سے ہمت کے سنے تو

آوازہ یہی ہے جَرَسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ

دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

اردو میں قطعہ نگاری فارسی شاعری سے آئی ہے۔ فارسی میں نامور قطعہ نگاروں میں رُودکی، فردوسی، انوری، سعدی، خسرو اور عرفی وہ شاعر ہیں جنھوں نے قطعہ نگاری کو بہت ترقی دی ہے۔

برِّ صغیرِ پاک و ہند میں قطعہ نگاری کا آغاز دکن کی سرزمین سے عمل میں آیا۔ بعد میں شمالی علاقوں میں حاتم، میر، سودا، مصحفی، جرأت، انشا وغیرہ نے اس صنف کو مزید سنوارا اور نکھارا۔ ان کے بعد غالب، ذوق، مومن، شیفتہ نے اس صنف سے بہت کام لیا۔ حالی، شبلی، اسماعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی اور اقبال نے اس صنفِ سخن سے دینی اور اخلاقی مضامین کے فروغ کا کام لیا۔

ہمارے موجودہ دور میں بھی قطعہ نگاری میں بعض شاعروں کو یہ امتیاز حاصل ہے اور ان کے قطعات شوق و دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔

قطعہ نگاری میں اکبرالہ آبادی کا نام بہت نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں حالی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

——— ○○○ ———
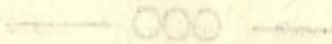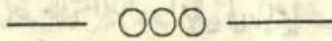
رُباعی

رباعی کا لفظ عربی لفظ "رباع" سے نکلا ہے، جس کا معنی چار چار ہے۔ اصناف سخن کی اصطلاح میں رباعی اس مختصر نظم کو کہا جاتا ہے جو صرف دو شعروں یا چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں اس صنف کو ترانہ یا دو بیتی بھی کہتے تھے۔ ہیئت کے اعتبار سے رباعی کے چار مصرعوں میں سے پہلا، دوسرا اور چوتھا ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔

چار مصرعوں کے قطعے کے مقابلے میں رباعی کا وزن و بحر مخصوص ہوتے ہیں اور یہی خصوصیت رباعی کو دو شعروں کے قطعے سے ممتاز کرتی ہے۔ رباعی میں تیسرے مصرعے کا وزن باقی مصرعوں سے مختلف ہوتا ہے البتہ شاعر رباعی میں جو بات کہنا چاہتا ہے، وہ عام طور پر چوتھے مصرعے میں کہی جاتی ہے، اس لیے چوتھا مصرع بہت زوردار ہونا چاہیے۔

رباعی میں مضمون اور موضوع کی کوئی قید نہیں لیکن عام طور پر اس صنف سخن کو صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مضامین عاشقانہ اور رندانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض رباعی نگاروں نے تو خمریات ہی کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔

رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے جس کی بحریں اور اوزان مخصوص ہونے کے علاوہ مشکل اور دقیق ہیں۔
رباعی کی ابتدا بھی برصغیر پاک و ہند کے جنوبی علاقے (دکن) میں عمل میں آئی۔ بیشتر شعراء نے اس کو صوفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ اس زمانے کا بیشتر کلام آج عنقا اور ناپید ہے۔

جب شاعری کا چرچا برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصوں میں ہوا تو وہاں کے بعض شاعروں نے بھی اس صنف سخن کی طرف توجہ دی۔ لیکن بعض بڑے شاعر اس طرف زیادہ متوجہ نہ ہوئے۔ مثلاً میر تقی میر کو غزل سے زیادہ لگاؤ تھا اور مرزا سودا کو قصیدہ میں امتیاز حاصل تھا۔ اس دور میں خواجہ میر درد نے ایک حد تک اس طرف توجہ دی لیکن ان کی رباعیاں زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکیں البتہ بعد میں میر انیس کا نام ایسا ہے جن کی رباعیاں بہت حد تک مقبول ہوئیں اور ان کے بعد حالی، اکبر اور اقبال کی رباعیات بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ان میں سے حالی کی رباعیات کا موضوع اخلاقیات، اکبر کی رباعیات کا موضوع سیاسیات اور اقبال کی رباعیات کا موضوع زیادہ تر حکیمانہ ہے۔

رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے، اس لیے رباعی گو کم نظر آتے ہیں۔ میر و سودا کے کلام میں کچھ رباعیات ملتی ہیں۔ بعد کے ادوار میں حالی اور اکبر الہ آبادی کے نام نمایاں ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا نام بھی شامل ہے۔ اقبال کے بعد جوش ملیح آبادی ایسے شاعر تھے جنھوں نے اس صنف کی طرف توجہ دی۔ موجودہ دَور میں ایک بار پھر رباعی گوئی کا رواج زیادہ ہو رہا ہے۔

— OOO —

اکبر الہ آبادی
(۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء)

نام سید اکبر حسین اور اکبر ہی تخلص تھا۔ الہ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں زندگی گزارنے کی وجہ سے اکبر الہ آبادی کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ ان کے آباء و اجداد برِّصغیر پاک و ہند میں نیشا پور سے آئے تھے۔

اکبر کے دادا نواب آصف الدولہ کے عہد کے نامور دینی علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اکبر کے والد سید تفضّل حسین رضوی بھی اچھے خاصے عالم تھے۔ ان کی زندگی کا ایک حصہ بزرگان دین کی صحبتوں میں گزرا جس کے زیر اثر وہ اخیر عمر میں بہت حد تک تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ اس لیے اکبر کے خاندان کی مالی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔ اس وجہ سے اکبر کی تعلیم بھی باقاعدگی سے نہ ہو سکی۔

اکبر نے بڑے ہو کر سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ تعمیرات میں ملازمت کی لیکن پھر جلد ہی استعفا دے کر قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیل دار ہو گئے۔ پھر انھوں نے ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ملازمت چھوڑ کر وکالت کرنے لگے جو ۱۸۸۰ء تک جاری رہی۔ ۱۸۸۱ء میں انھیں منصفی کے عہدے کی پیش کش ہوئی جسے انھوں نے قبول کر لیا اور ترقی کرتے ہوئے ۱۸۹۴ء میں عدالت کے جج مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں پہلے ان کی بیوی فوت ہو گئی اور پھر ایک فرزند بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان دونوں صدموں نے اکبر کی صحت کو بہت متاثر کیا جس سے ان کی عمر کا آخری حصہ ایک قسم کی شکستگی ہی میں گزرا اور وہ ۱۹۲۱ء میں وفات پا گئے۔

اکبر الہ آبادی اردو کے نامور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ شاعری امتیاز و انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی شہرت و مقبولیت کا دار و مدار طنزیہ اور ظریفانہ شاعری پر ہے۔ انھوں نے طنز و ظرافت کے علاوہ سیاسیات، تصوف، فلسفے وغیرہ کے موضوعات پر بھی کافی کچھ لکھا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلیات چھپ چکا ہے۔

اکبر الہ آبادی بہت بہادر اور بے خوف آدمی تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود وہ انگریز حکومت اور اس کے تمدن و تہذیب پر سخت تنقید کرتے رہے۔ اکبر مشرقی تہذیب و تمدن کے بڑے حامی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں مغربی بے راہ روی اور بے پردگی پر سخت تنقید ملتی ہے۔

اکبر طنز و ظرافت کے رنگ میں بڑی بڑی باتیں کہ جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری اصلاحی شاعری ہے بلکہ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ظریفانہ رنگ استعمال کر کے اسلامی نقطۂ نظر کو عام کیا ہے۔

خصوصیاتِ کلام

جہاں تک اکبر الہ آبادی کے کلام کی خصوصیات کا تعلق ہے وہ چیدہ چیدہ یہ ہیں :

ملی ہمدردی، ماضی پسندی، معاشرت پر تنقید، مزاح، طنز، انگریزی الفاظ کا استعمال، شگفتگی وغیرہ

قطعات و رُباعیات

(۱)

نہ نماز ہے نہ روزہ ' نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس میں کیا ہے کوئی جنٹ[1] کوئی جج ہے
جو خیال ہیں نرالے تو مذاق ہیں انوکھے
نہ وہ وضع قوم کی ہے' نہ وہ شان ہے نہ دھج ہے
جو کر آئے سیرِ لندن، ہیں اسیرِ کبر و فیشن
جو یہیں گئے ہیں بَن ٹھَن' انھیں ایند ہے گرَج[2] ہے

(۲)

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش[3] راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل پیچ میں ہے' ڈھیلی اس کی چُول بھی ہے
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمّق سے
تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طُول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبلی[4] کی

۱۔ Gentleman

۲۔ Grudge

۳۔ British Rule

۴۔ Homourably

جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملوّل بھی ہے
طرح طرح کے بنا لو لباسِ رنگا رنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وُول[1] بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں، ہر سمت رہبروں کے لیے
نظر نواز ہے پتّی، حسین پھول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم[2] فول بھی ہے

(۳)

ان کو کیا کام ہے مروّت سے — اپنے رخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں — ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

(۴)

اکبر سے مَیں نے پوچھا اے واعظِ طریقت — دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلّق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو — انگریز کو ہے "نیٹو"[3] سے جس قدر تعلّق

(۵)

دین و تقویٰ سے بہت دُور ہُوا جاتا ہوں — بادۂ عیش سے مخمور ہُوا جاتا ہوں
میری گردن پہ ہیں شیطان کے احسان بہت — ترکِ "لاحول" پہ مجبور ہُوا جاتا ہوں

۱۔ Wool
۲۔ Damfool
۳۔ Native

(۶)

کہاں ہم میں جماعت اور طاعت   شکستہ ہو گئے سابق کے رشتے
نہیں ہے کچھ شکایت لیڈروں سے   کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے

☆ ☆ ☆

شیطان ہے دل، جو نور ایماں نہ رہے   دشمن ہے زباں جو وردِ قرآں نہ رہے
کہتی ہے یہ "ہسٹری" با آواز بلند   تم کچھ نہ رہے، اگر مسلماں نہ رہے

☆ ☆ ☆

گزرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ   سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم، عجم میں جَم ہے موجود   کہہ دو کہ عرب میں دیکھیں رب کا جلوہ

☆ ☆ ☆

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے   دشوار انساں کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی   اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

☆ ☆ ☆

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو   لیکن قرآں کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو   خالق کا کرو خیال، تکبیر پڑھو

سوالات

۱۔ اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کے ذریعے سے قوم کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ دیے گئے قطعات و رباعیات کی روشنی میں بحث کریں۔

۲۔ دوسرے قطعے میں انگریزوں کے عہد حکومت پر جو بڑی پرلطف طنز کی ہے، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ پہلے قطعے میں کیا سبق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ بیان کیجیے۔

۴۔ ہیئت کے اعتبار سے قطعہ اور رباعی میں کیا فرق ہے۔ ایک نوٹ لکھیے۔

۵۔ آخری رباعی کا مفہوم اور مقصد بیان کیجیے۔

— ○○○ —

پیر سید مہر علی شاہؒ (مصنف)

(۱۸۵۶ء - ۱۹۳۷ء)

حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی یکم رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۶ء) بروز دوشنبہ گولڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نجیب الطرفین بزرگ ہیں کہ آپ کے والد اور والدہ محترمہ دونوں کا سلسلۂ نسب پچیس پچیس واسطوں سے جناب غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ تک پہنچ جاتا ہے۔

اردو فارسی کی تعلیم خانقاہ مکتب سے حاصل کی۔ سرگودھا کے قصبے انگہ کے مولوی سلطان محمد سے مزید تعلیم کے بعد تکمیل تعلیم کے لیے آپ علی گڑھ تشریف لے گئے اور مولانا لطف اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے جہاں سے آپ نے قرآنِ مجید اور صحاحِ ستہ کی سندات حاصل کیں۔ مزید تعلیم کے لیے شیخ الحدیث مولانا احمد علی ؒ کے درس میں شمولیت کے لیے سہارن پور چلے گئے اور کتب الحدیث کی سندات حاصل کیں پھر واپس گولڑہ تشریف لائے اس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی۔

حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ طبعاً شاعر تھے لیکن شعر گوئی ان کا باقاعدہ مشغلہ نہ تھا اور شعر گوئی کے لیے ان کے پاس وقت بھی نہیں تھا کہ آپ کا بیشتر وقت عبادت و ریاضت، تفاسیر، احادیث اور متعلقہ علوم کے مطالعے میں اور کچھ وقت درسِ حدیث میں صرف ہو جاتا تھا۔ اشعار تو کبھی کبھی بے ساختہ جذب و سرور کی کیفیتوں میں ان کی زبان پر آ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اشعار کی نمایاں خوبیاں جذبہ و خلوص کی صداقت، زبان و بیان کی بے تکلفی اور اظہار کی بے ساختگی ہیں جن کی وجہ سے آپ عوام و خواص میں مقبول و پسندیدہ ہیں۔

زیرِ نظر آپ کی مشہور پنجابی نعت ۔ "اَج سِکّ متراں دی وَدھیری اے۔" کا منظوم ترجمہ جناب پروفیسر کرم حیدری (مرحوم) نے کیا ہے۔

پروفیسر کرم حیدری مرحوم (مترجم)

(۱۹۱۶ء - ۱۹۹۰ء)

اصل نام کرم داد خاں۔ ادبی حلقوں میں کرم حیدری کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کوہستان مری کے خوبصورت مقام تریٹ میں ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ بی۔ اے، بی۔ ٹی کرنے کے بعد محکمۂ تعلیم سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے اور پھر یہاں سے گورنمنٹ کالج مری میں چلے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وزارت حج و اوقاف اور کچھ دیر ادارہ لوک ورثہ اسلام آباد میں بھی کام کیا اور ۱۹۹۰ء کے آخر میں آپ کا وصال ہو گیا۔

کرم حیدری شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ فارسی، اردو اور پنجابی زبانوں میں خوب مہارت رکھتے

ہیں۔ اردو نثر میں داستان مری ' سرزمین پوٹھوہار اور پنجابی زبان میں ایک کتاب "پوٹھوہاری لوک گیت" مرتب کی۔ شاعری کے میدان میں دوش و فردا ' سایۂ گل اور اَنعم (نعتیہ مجموعہ) ان کی قابلِ قدر تخلیقات ہیں۔ ان کی شاعری فطرت انسانی کے قریب رہتے ہوئے رومانوی جذبوں کی بھرپور عکاس ہے۔ آپ کی شاعری میں عصری مسائل کے ذکر کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں کے تقدس کا فطری جذبہ اور قدرتی نظاروں کے حسن کا تذکرہ بھی بہت نمایاں ہے۔ عربی ' فارسی کے علاوہ مقامی الفاظ کا استعمال ان کے اسلوب نگارش کی ایک خاص خوبی ہے۔

نعت

(پیر مہر علی شاہ رح کی مشہور پنجابی نعت کا اردو ترجمہ)

ہے آج سجن کی پیاس بہت — کیوں دل مسکیں ہے اداس بہت ؟
نس نس میں ہے شوق کی باس بہت — آنکھوں سے لگی ہیں کیوں جھڑیاں ؟

مکھڑا اِک بدر ہے شعشانی — ماتھے پہ ہیں لاٹیں نورانی
زلفیں کالی ' اور مستانی — آنکھیں ہیں نشیلی مدھ بھریاں

دو ابرو مثال قوس لگیں — جن سے مژگاں کے تیر چلیں
لب لعلِ یمن کی سرخی دیں — اور دانت ہیں موتیوں کی لڑیاں

اس صورت کو میں جان کہوں — جانان کہ جانِ جہان کہوں
سچ کہوں تو رب کی شان کہوں — جس شان سے ہے ہر شان عیاں

یارب ہو یہ صورت پیشِ نظر — جب نزع لگے ' جب ہو محشر
جب قبر میں ہو اور پُل پہ گزر — سب کھوٹے بھی ہوں گے کھرے جہاں

آؤ حجرے سے مسجد پیارے — اِک نوری جھلک مانگیں سارے
ہیں آنکھیں بچھائے متوارے — سب اِنس و مَلک حُوریں پریاں

ان روتے ہوئے دیوانوں پر   ان صدقے اترتی جانوں پر
بے دام غلام انسانوں پر   پھر آئیں خدایا! وہ گھڑیاں

سُبحَانَ اللّٰہ مَا اَجْمَلَکَ [1]   مَا اَحْسَنَکَ ، مَا اَکْمَلَکَ
کہاں مہرؔ علی ، کہاں تیری ثنا   گستاخ نظر جا ٹھہری کہاں

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :

شوق کی باس ، جھڑیاں ، نورانی ، مثالِ قوس ، لعلِ یمن ، جانِ جہاں ، انس و ملک

۲۔ اس نظم کے پانچویں اور ساتویں بند کی تشریح کیجیے۔

۳۔ اس نعت میں رسولِ پاک ؐ کی سیرتِ طیبہ کے جو جو پہلو بیان ہوئے ہیں ، انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

—— ○○○ ——

۱۔ سبحان اللہ ! آپ ؐ کتنے جمیل ہیں ، آپ ؐ کتنے حسین ہیں ، آپ ؐ کتنے کامل ہیں۔

رحمان باباؒ (مصنف)

نام عبدالرحمان ہے۔ آپ ۱۰۴۲ھ میں پشاور کے قریب بھادو کلے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور رحمان بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام عبدالستار تھا جو مہمند قبیلے سے تعلق رکھتے تھے نقہ اور تصوف کی تعلیم اپنے گاؤں کے جید عالم دین ملا محمد یوسف سے حاصل کی۔ اس کے بعد کوہاٹ چلے گئے' جہاں آپ نے جذب و سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جوانی میں ہی گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اکثر عشق ربانی میں ڈوبے رہتے۔

پشتو کے عظیم شاعر رحمان بابا ایک صاحب طرز شاعر ہیں جو دوسرے پشتو شعراء سے الگ اپنا مکتبِ فکر رکھتے ہیں۔ رحمان بابا سکول میں خودی کی تعلیم اور عالم گیر انسانی مساوات کا درس ہے۔ آپ کا پیغام محبت ہے۔ تمام انسانوں سے محبت' ساری کائنات سے محبت۔ اگر نفرت ہے تو ظلم سے' بے انصافی سے' استحصال سے' جبر و تشدد اور آمریت سے۔ یہی آپ کی متصوفانہ شاعری کی اساس ہے اور یہی آدرش ہے جو انھیں دوسرے پشتو شعرا سے ممیّز کرتی ہے۔ مجموعی طور پر آپ کے ہاں اخلاقی پہلو غالب ہے لیکن انھوں نے اس ناصحانہ اسلوب کو بھی خشک اور ناگوار نہیں ہونے دیا۔

رحمان بابا بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل جس کومل لہجے' دھیمے سروں' نرم و نازک احساسات اور مترنم الفاظ کی متقاضی ہے وہ تمام خوبیاں ان کی غزلوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ زیرِ نظر دو اقتباس انھیں کے کلام کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔

رضا ہمدانی (مترجم)

آپ کا پورا نام تو میرزا رضا حسین ہمدانی ہے لیکن ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام "رضا ہمدانی" سے جانے جاتے ہیں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد منشی فاضل اور پشتو فاضل کیا اور محکمہ صحت میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس' لوک ورثے کا قومی ادارہ اسلام آباد میں بطور محقق پشتو' ہندکو ادب اور ریجنل ڈائریکٹر برائے صوبہ سرحد کی خدمات انجام دیں۔

آپ کو اردو' انگریزی' پشتو' ہندکو' فارسی اور کشمیری زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ملک اور بیرون ملک بہت سی علمی ادبی محفلوں' کانفرنسوں' مذاکروں اور مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے میں اس قدر ملکہ رکھتے ہیں کہ ان کے ترجمے پر طبع زاد تخلیق کا گمان ہونے لگتا ہے۔

آپ کی علمی ادبی خدمات کے صلے میں ہمدرد پاکستان کراچی' پاکستان رائٹرز گلڈ' انجمن ترقی اردو پاکستان جیسے معروف اداروں نے آپ کو انعامات سے نوازا ہے اور آپ صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی بھی پا چکے ہیں۔

ان کے اردو غزل کے دو مجموعے "رگ مینا" اور "صلیب فکر" کے علاوہ ہندکو میں شعری مجموعہ "مٹھے ڈنگ" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ زیر نظر دونوں اقتباس رحمان بابا کے کلام کے اردو منظوم ترجمے ہمدانی صاحب نے کیے ہیں۔

عَیب جوئی کی مذمّت

عیب جوئی میں با ہنر ہے تو — اپنی لغزش سے بے خبر ہے تو

ہے ملائک سے بڑھ کے تیرا مقام — بے عمل ! کتنا کم نظر ہے تو

نعمتوں کا کیا نہ شکر کبھی — ملی زحمت تو محوِ شر ہے تو

سفرِ حج تجھے گوارا نہیں — بہرِ زر عازمِ سفر ہے تو

جس طرح کھوکھلا ہو نخلِ کہن — عہدِ پیری میں بے ثمر ہے تو

تیرا درماں ہے گفتۂ رحماںؔ — کیوں زمانے میں در بدر ہے تو

(۲)

ہے اتفاق کہ رُوئے رقیب کالا ہے — وگرنہ آئینہ دل مرا نہیں میلا

حلال خوردہ کہتے ہیں اپنے بھنگی کو — جو اچھے لوگ ہیں کہتے نہیں کسی کو برا

بری ہے یا کہ بھلی اپنی اپنی صورت ہے — ہر ایک چہرے کا ہے اپنا اپنا آئینہ

جو تو نے بویا ہے کاٹے گا بھی وہی آخر — کہ جیسا تخم ہو ویسا ہی پھل بھی پائے گا

ہو اپنے عیب پر تیری نظر اگر رحمٰنؔ
کبھی نہ پائے تو الزام عیب جوئی کا

سوالات

۱۔ درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
کم نظر، محوِ شر، عازمِ سفر، نخلِ کہن، عہدِ پیری، بے ثمر، دربدر، آئینۂ دل، عیب جوئی۔

۲۔ اس نظم کے پہلے بند کی تشریح کیجیے۔

۳۔ رحمٰن بابا نے ان اشعار میں ہمیں کیا تلقین کی ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

000

نمبروں اور سوالات کے اعتبار سے اردو ادب کے لوازمے کی تقسیم

نمبروں کی تقسیم

۱۔ مکمل ناول	۱۵
۲۔ داستان، ناول، افسانہ (اقتباسات)	۱۵
۳۔ مضامین	۱۵
۴۔ سیرت شخصیت اور سوانح نگاری، مکاتیب	۱۰
۵۔ طنز و مزاح، سفرنامہ، انشائیہ	۱۰
۶۔ غزل	۱۵
۷۔ نعت منقبت، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ	۱۰
۸۔ متفرق نظمیں	۲۰
۹۔ علم بیان و بدیع	۲۰
۱۸۔ اصناف نظم و نثر کا تعارف	۲۰
۱۹۔ تاریخ زبان و ادب	۱۵
۲۰۔ پاکستانی زبانوں کے ادب سے انتخاب	۱۵
۲۱۔ تنقیدی و ادبی مضمون	۲۰
	۲۰۰

سوالات کی تقسیم (حصۂ نثر)

۱۔ نثرپاروں کی تشریح (بالاثنا مکمل ناول)	۱۵
۲۔ نثرنگاروں کے متعلق سوانحی تنقیدی نوٹ	۱۵
۳۔ اسباق اور نفسِ مضمون کے متعلق سوالات	۲۰
	۵۰

(حصہ نظم)

۱۔ اشعار کی تشریح	۲۰
۲۔ نظم کا مرکزی خیال و تنقیدی و تحسینی نوٹ	۱۵
۳۔ شاعروں کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام	۱۵
	۵۰

پرچہ "ب"

۱۔ مضمون (ادبی و تنقیدی)	۲۰
۲۔ تاریخ زبان و اردو ادب کا خاکہ	۱۰
۳۔ مکمل ناول کا تنقیدی مطالعہ	۱۵
۴۔ پاکستانی زبانوں کے تراجم	۱۵
۵۔ اصنافِ سخن، غزل قصیدہ، مثنوی مرثیہ، نظم حمد و نعت و منقبت، رباعی	۱۰
۶۔ داستان، ناول، افسانہ، سوانح انشائیہ، مکتوب نگاری، شخصیت نگاری، تاریخ نگاری۔ بحوالہ اردو ادب	۱۰
۷۔ علم بیان و بدیع ! تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل، تلمیح، صنعتِ تضاد، تجنیس، ایہام، حسنِ تعلیل،	۱۰
لف و نشر	۱۰
	۱۰۰

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور۔

منظور کردہ : وزارت تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد۔

بموجب مراسلہ نمبر9-1/93 یو آر، مورخہ 22 جنوری 1995ء

فرمان قائداعظمؒ

آپ کی توجہ صرف حصول علم کے لیے وقف رہے۔ صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم، طاقتور اور ترقی یافتہ ملک بناکر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

(نوجوانوں سے خطاب)

تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔

سیریل نمبر

162

ایڈیشن	طباعت	تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت	قیمت
اول	اول	جولائی ۱۹۹۵	۵,۰۰۰	۳۴.۹۵